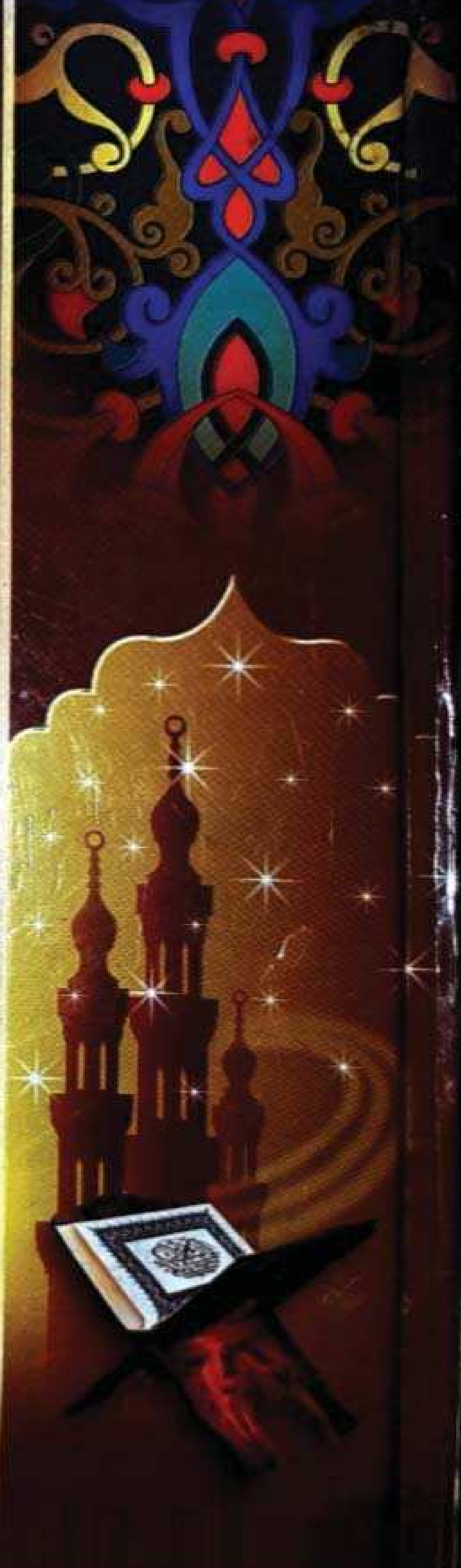
قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم
لا یدخل الجنۃ صاحب مکس

ٹیکس
اور اسکی شرعی حیثیت

تالیف

مولانا مفتی ریاض محمد بگرامی

فاضل جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد ۔
متخصص جامعہ دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴
رئیس دارالافتاء، تعلیم القرآن راولپنڈی



الخلیل پبلشنگ ھاؤس
راولپنڈی

نام کتاب .... ٹیکس اور اس کی شرعی حیثیت

مصنف .... مولانا مفتی ریاض محمد بلگرامی

سرورق .... وسیم گرافکس، اردو بازار لاہور

ناشر .... اکلیل پبلشنگ ہاؤس، راولپنڈی

قیمت

ملنے کے پتے

- کتب خانہ رشیدیہ، مدینہ مارکیٹ راجہ بازار، راولپنڈی
- احمد بک کارپوریشن، اقبال روڈ، راولپنڈی
- دار الاشاعت، کراچی
- زمزم پبلشرز، اردو بازار، کراچی
- مکتبہ معارف القرآن، احاطہ دار العلوم کورنگی، کراچی
- اسلامی کتب خانہ، بنوری ٹاؤن، کراچی
- کتب خانہ اشرفیہ، قاسم سینٹر، کراچی
- مکتبہ رحمانیہ، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور
- مکتبہ سید احمد شہید، الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور
- المیزان، الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور
- مکتبہ حقانیہ، ملتان
- مکتبہ العارفی، فیصل آباد
- مکتبہ سید احمد شہید، اکوڑہ خٹک
- مکتبہ معارف، محلہ جنگی، پشاور
- وحیدی کتب خانہ، قصہ خوانی بازار، پشاور
- بیت القرآن، حیدرآباد، سندھ
- مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ، کوئٹہ

شرف انتساب

میں اپنی اس حقیر کاوش

کو استاذ محترم

پیکر اخلاص، صاحب عجز و انکسار

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب دامت برکاتہم

استاذ الحدیث

جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد

کے نام منسوب کرنے کی

سعادت حاصل کرتا ہوں

فہرست مضامین

ٹیکس کی تعریف اور معنی

ٹیکس(TAX)انگریزی زبان کا لفظ ہے،اور علم المالیات کی اصطلاح میں اس سے مراد وہ رقم اور مالیہ ہے جو حکومت چلانے کیلئے مختلف صورتوں میں لوگوں سے وصول کیا جاتا ہے،اس کی وصولی ایک نظام کے تحت ہوتی ہے اور جن لوگوں پر یہ ٹیکس عائد ہوجاتا ہے،اگر وہ وقت مقررہ پر ادائیگی نہ کریں تو ان کے خلاف قانونی کاروائی کی جاتی ہے،عربی زبان میں ٹیکس کو مکس،ضریبہ، نائبہ، جبایۃ، جزیہ اور خراج کہاجاتا ہے۔

علم مالیات کے مشہور ماہر پلیہن (PLEHN) ٹیکس کی تعریف یوں کرتے ہیں:

اس سے مراد افراد پر وہ جبری ادائیگی ہے جو ان اخراجات کو پورا کرنے کیلئے وصول کی جاتی ہے جو کسی ملک کے باشندوں کے مشترکہ فائدوں کیلئے کئے جاتے ہیں۔

محصول اور ٹیکس کے حقیقی عناصر یہ ہیں۔

(۱) یہ ادائیگی جبرا کرنی پڑتی ہے۔

(۲) یہ حکومت کے مقاصد عمومی کیلئے لیا جاتا ہے،کوئی ٹیکس دہندہ یہ مطالبہ نہیں کرسکتا کہ اس ٹیکس کے معاوضے میں اس کو کوئی خاص فائدہ پہنچایا جائے مثلاً اگر خالد ٹیکس ادا کرتا ہے تو وہ اس کے بدلے میں حکومت سے یہ مطالبہ نہیں کرسکتا کہ حکومت اس کے دروازے پر ایک سپاہی متعین کردے جو اس کی جائیداد کی حفاظت کرے،اور وجہ اس کی یہ بتائے کہ یہ جائیداد ہی میری آمدنی کا ذریعہ ہے لیکن اس

کا یہ مطلب بھی نہیں کہ حکومت جب ٹیکس لیتی ہے تو اس کے بدلے میں کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتی بلکہ وہ نظم ونسق عامہ کی ذمہ دار ہے اور لوگوں کو بہت سا فائدہ پہنچاتی ہے لیکن یہ فائدے تمام لوگوں کو مشترکہ حاصل ہوتے ہیں، کسی خاص ٹیکس دہندہ کو الگ نہیں ملتے ۔

ٹازگ (Taussig) لکھتے ہیں:

ٹیکس اور دوسرے ذرائع آمد میں یہ فرق ہے کہ ٹیکس کے بدلے میں ٹیکس دہندہ کو براہِ راست فائدہ نہیں پہنچتا ۔

جدید معاشیات (ص۶۹۲) از ڈاکٹر ایس ایم اختر

اس وقت سرکاری ذرائع آمد میں سب سے بڑا ذریعہ محصول یعنی ٹیکس ہے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ ذرائع آمدن ہیں جن کا مفہوم ٹیکس کے قریب قریب ہے مثلاً فیس، قیمت، خصوصی ادائیگی، مقامی محصولات وغیرہ، ٹیکس اوران ذرائع میں جو ہری فرق موجود ہے، اس فرق پر نظر نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے اہل علم ان کو ایک شمار کرتے ہیں اور سب پر ایک حکم لگاتے ہیں، اسلئے ان امور کی بھی تعریف کی جاتی ہے تا کہ ان میں فرق معلوم ہوجائے ۔

(ا) فیس کی تعریف

ٹیکس کی طرح یہ بھی ایک جبری ادائیگی ہے لیکن صرف وہ لوگ ادا کرتے ہیں جو اس کے بدلے میں ایک خاص خدمت حاصل کرتے ہیں، فیس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ حکومت جو خدمت ادا کرتی ہے اس کے مصارف کا کچھ حصہ پورا کرلیا جائے لیکن یہ خدمت مہیا کرنے کے مصارف سے کم بھی ہوسکتی ہے، اس کی ایک

مثال تعلیمی فیس ہے۔

پلیہن(PLEHN) لکھتے ہیں:

فیس سے مرادوہ جبری ادائیگی ہے جوحکومت کے اخراجات کا کچھ حصہ پورا کرنے کے لئے کی جاتی ہے،یہ اخراجات مشترکہ فائدہ کے ساتھ ساتھ خاص افراد کو بھی خصوصی فائدہ پہنچاتے ہیں۔

(۲) قیمت کی تعریف

قیمت سے مراد وہ رقم ہے جو حکومت کی مہیا کردہ خدمات کے معاوضے میں ادا کی جاتی ہے، فیس اور قیمت میں فرق یہ ہے کہ فیس کے سلسلے میں عوامی مفاد زیادہ پیش نظر ہوتا ہے لیکن قیمت اس خدمت کے بدلے میں دی جاتی ہے جو عام طور پر کاروباری نوعیت کی ہوتی ہے،مثلاً ریل پر سفر کا کرایہ،اگر آپ ایسی کوئی خدمت نہ خریدیں تو آپ یہ قیمت ادا کرنے سے بھی بچ سکتے ہیں۔

قیمت اور ٹیکس میں یہ فرق ہے کہ ٹیکس تو مشترکہ فائدہ کیلئے دیا جاتا ہے لیکن فیس اور قیمت دونوں خصوصی فائدے کیلئے ادا کئے جاتے ہیں۔

(۳) خصوصی ادائیگی

پروفیسر سلگ مین(Selig man)نے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

اس سے مراد ایسی رقم ہے جو لوگوں سے اس تناسب سے وصول کی جاتی ہے،جس تناسب سے وہ فائدہ حاصل کرتے ہیں مثلاً جب عوامی مفاد کی خاطر،کسی

سرکاری تعمیر کی بدولت نجی جائیداد کی مالیت بڑھ جائے، فرض کریں کہ حکومت کوئی سڑک بناتی ہے یا گندے پانی کے نکاس کاانتظام کرتی ہے تو وہ تمام عمارتیں اور جائیدادیں جو اس کے گردونواح میں ہونگی ان کی قیمت بڑھ جائیگی،حکومت کو حق پہنچتا ہے کہ اس غیر مکسوبہ اضافہ مالیت کا کچھ حصہ وصول کرے،اس مقصد کیلئے جو ٹیکس لگایاجاتا ہے اسے خصوصی ادائیگی کہاجاتا ہے، غرض یہ ہوتی ہے کہ حکومت جو غیر معمولی خرچہ برداشت کرتی ہے اس کا کچھ حصہ پورا کرلیاجائے،چنانچہ یہ ٹیکس اس نسبت سے لگائے جاتے ہیں جس نسبت سے ملحقہ جائیدادوں کی مالیت بڑھ جاتی ہے۔

(۴)مقامی محصولات

ان سے مراد وہ رقوم ہیں جومقامی حکومتیں،میونسپلٹیاں اور ضلع کونسلز وغیرہ مالی ضرورتوں کیلئے وصول کرتی ہیں، یہ عام طور پر غیر منقولہ جائیداد پر لگاتے ہیں لیکن ان کے بدلے میں کوئی خصوصی فائدہ نہیں پہنچایاجاتا، یہ شرحیں مختلف علاقوں میں مختلف ہوتی ہیں،مقامی محصولات ٹیکس ہی کی ایک صورت ہے (ایضاً)

ٹیکس کی دوبنیادی اقسام

ٹیکس کی بنیادی طور پردواقسام رائج ہیں۔

(۱) بالواسطہ ٹیکس (In Direct Tax)

(۲) بلاواسطہ ٹیکس (Direct Tax)

(ا) بالواسطہ ٹیکس (In Direct Tax)

اس سے مراد وہ ٹیکس ہے جو عوام الناس تو ادا کرتے ہیں لیکن ان کو اس کے بارے پتہ نہیں چلتا، اس بناء پر وہ بوجھ بھی محسوس نہیں کرتے، بالواسطہ ٹیکس کی تعریف یوں میں بھی کی جاسکتی ہے کہ ایسا ٹیکس جس کا بار دوسرے کی طرف بھی منتقل کیا جاسکتا ہو۔ جیسا کہ وہ تمام اشیاء کہ جن کی خرید وفروخت میں ٹیکس شامل ہوتا ہے جیسے پٹرول، بجلی، گیس، اور دیگر مصنوعات، کسی کارخانہ میں بننے والی اشیاء پر اگر ٹیکس آتا ہے تو بالآخر اس کی وصولی عوام الناس سے ہوتی ہے کیونکہ یہ ٹیکس بھی مصنوعات کی لاگت (Cost) میں شمار کیا جاتا ہے، یا خود دوکان اور کارخانے پر ٹیکس کیونکہ دوکاندار یا کارخانہ دار قیمتیں بڑھا کر دوسروں پر اس کا بار ڈال سکتا ہے، یا "سیلز ٹیکس" جو وصول تو دوکاندار سے کیا جاتا ہے لیکن دوکاندار ہر چیز کے فروخت کے وقت یہ ٹیکس اپنے خریدار سے وصول کر لیتا ہے۔

(۲) بلا واسطہ ٹیکس (Direct Tax)

اس سے مراد وہ ٹیکس ہے جو کسی شخص کی ذاتی آمدنی اور کمائی پر براہِ راست عائد ہوتا ہے اور اسے اس کا پتہ اور احساس بھی ہوتا ہے اور اسے بوجھ محسوس کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر بلا واسطہ ٹیکس وہ ٹیکس ہے جو افراد پر اس طرح عائد ہو کہ وہ اس کا بار کسی اور پر نہ ڈال سکیں، جیسے آمدنی، تنخواہ اور جائیداد پر ٹیکس۔

ٹیکس زمانہ جاہلیت میں

تاریخ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ٹیکس ایک قدیم ترین محصول ہے،

اس کا ذکر، مقدار وکیفیت کے تغیرات کے ساتھ فراعنہ، بطالسہ، رومیوں، بزنطیوں اور فارسیوں کے ادوار حکومت میں ملتا ہے۔

فراعنہ

اس ٹیکس کا موجد رمسیس ثانی ہے جس نے ۱۲۳۰ قبل عیسوی حکومت کی اور ۱۲۶۰ تا ۱۲۷۰ کی درمیانی مدت میں وفات پائی، اس نے ملکی باشندوں کو تین طبقوں میں تقسیم کیا (۱) دینی پیشوا (۲) فوجی (۳) کاشت کار اور ہر ایک کیلئے اراضی کا ایک ایک حصہ مختص کردیا اور محصول صرف کاشت کاروں پر عائد کیا، اس دور میں پیداوار کا دسواں حصہ بطورِ ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔

(استربون ج ۱۷ الفقرہ ۲ اور ماسپیرو ج ۱ ص ۳۳۰)

بطالسہ

ان کے دور میں ٹیکس کے نظام میں قدرے تبدیلی آئی اور مقدار میں کمی ہوئی اور تین فیصد سے دس فیصد تک وصول کیا جاتا تھا۔ (دیو دور الکتاب الاول الفقرہ ۷۳۔۷۴ وہالیہ مصر ص ۱۶۴)

رومہ

جب مصر پر رومیوں کی حکومت ہوئی تو ٹیکس کی مقدار میں غیر معمولی اضافہ ہوکر بیس فیصد ہوگیا۔ بارکاروت (۲۹۴/۱۰)

فرس

فارسیوں کے یہاں ٹیکس کی مقدار تین فیصد سے چھ فیصد تک رہی، جب تک کہ ان کے یہاں خراج مقاسمہ رائج رہا لیکن قباذ نے اس نظام کی تبدیلی کا فرمان جاری کیا اور عملی جامہ کسریٰ نے پہنایا جس کے نتیجہ میں بہت سی مفید ترمیمات ہوئیں۔ الطبری (۱۲۲/۲، ۱۲۳) بحوالہ اسلام کا نظام عشر وخراج (۲۹۴/۲)

ٹیکس زمانہ اسلام میں

مذکورہ ٹیکس چونکہ بہت ظالمانہ تھے، اس لئے اسلام نے ان کو ختم کر کے ان کی جگہ زکوۃ اور عشر کا عادلانہ نظام رائج کیا اور اس میں عبادت کا پہلو اجاگر کردیا، جس کی تفصیل آگے آتی ہے لیکن عہدِ نبوی اور اس کے بعد کافر ممالک میں ٹیکس کا نظام موجود تھا اور کچھ تغیرات اور کمی و بیشی کے ساتھ اب تک موجود ہے، کہا جاتا ہے کہ یونان اور روم میں سب سے پہلے استعمال ہونے والی اشیاء پر ٹیکس لگایا گیا۔ درآمدی ڈیوٹی کو اندرونِ ملک بننے والے اموال پر وصول ہونے والی ڈیوٹی پر ترجیح دی جاتی تھی، جنگ کے دنوں میں جائیداد پر بھی عارضی طور پر ٹیکس عائد کردیا جاتا تھا، پھر اس کا دائرہ کار جائیداد کی خرید و فروخت تک وسیع کردیا گیا، یونان اور روم میں آزاد اور غلام اور اسی طرح قومی اور غیر قومی باشندوں میں ٹیکس کے بارے میں امتیاز کیا جاتا تھا۔

روم میں استعمال ہونے والی اشیاء اور درآمد پر ڈیوٹی کے علاوہ اور بھی بلاواسطہ ٹیکس تھے، ان میں اس اصول یہ کارفرما تھا کہ ہر شخص خراج ادا کرے، جولیس سیزر کے زمانے میں پہلی مرتبہ ایک فیصد سیلز ٹیکس (Seles Tax) نافذ کیا گیا۔

صوبوں کی آمدنی کا زیادہ تردار ومدار شخصی اور زرعی زمینوں پر عائد کردہ ٹیکسوں پر تھا آغاز میں یہ نہ دیکھا جاتا تھا کہ زمین آباد ہے یا غیر آباد جیسا کہ فارس اور مصر میں بھی کیا گیا......لیکن بعد میں زمین کی پیداوار کا دسواں حصہ (۱/۱۰) زمیندار سے وصول کرلیا جاتا تھا، جولیس سیزر سے پہلے ٹیکسوں کو اکٹھا کرنے کی ذمہ داری زمینداروں میں سے کسی شخص کے سپرد کردی جاتی اور ٹیکسوں میں سے کچھ فیصد حصہ اس کو معاوضہ کے طور پر دے دیا جاتا، لیکن جولیس سیزر نے یہ ذمہ داری سرکاری افسروں کو سونپ دی، قرون وسطی میں بالواسطہ ٹیکسوں کی جگہ بلا واسطہ ٹیکسوں نے لے لی، جس میں زیادہ تر آمدنی ڈیوٹی اور مارکیٹ فیس ہوتی تھی۔

یہاں تک کہ شہروں میں لوگ ٹیکس ادا کرنے کے عادی ہوگئے، کھانے پینے کے سامان پر تجار اور خریداروں نے ٹیکس کا بوجھ اٹھالیا، جرمنی اور اٹلی میں بھی چند بلاواسطہ ٹیکس عائد کئے گئے جو غریبوں کی ذات اور امیروں کے مال پر ہوتے تھے۔

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا (۱۷/۱۰۷۷تا۱۰۷۸)

سب سے پہلے جس ملک نے عام انکم ٹیکس کے نظام کو اپنایا وہ برطانیہ ہے نپولین بوناپارٹ کے خلاف جنگ لڑنے کیلئے برطانوی حکومت نے ۱۷۹۹ء میں دوسو پونڈ سے زیادہ ہونے والی آمدنی پر دس فیصد ٹیکس لگایا لیکن ساٹھ پونڈ سے کم آمدنی کو ٹیکس سے مستثنی قرار دیا۔

۱۸۱۰ء میں جب لڑائی ختم ہوئی تو ۱۸۴۲ء تک برطانوی باشندوں کو ٹیکس کے بوجھ سے آزاد کردیا گیا، لیکن وزیر اعظم سر روبرٹ پیل (Sir Robert Peel) نے بجٹ کے خسارے کو پورا کرنے کیلئے پھر سے ہنگامی طور پر ہر پونڈ پر

سات پنس ٹیکس عائد کردیا، ۱۸۸۰ء تک برطانوی رعایا ٹیکس ادا کرنے کی عادی ہوگئی جس کی وجہ سے ٹیکس ہمہ وقتی معمول بن گیا، ۱۹۱۰ء میں ٹیکس دہندہ میں سے جس کی آمدنی پانچ سو پونڈ سے زیادہ نہ ہوتی اس کو ہر بچہ کیلئے دس پونڈ کی چھوٹ دے دی گئی پہلی جنگ عظیم کے موقعہ پر چھ شلنگ کے حساب سے سوپر ٹیکس (Super Tax) بھی عائد کردیا گیا۔انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا (۲۷۵/۹)

جرمنی کے صوبہ پروسیا میں ۱۸۵۱ء میں ٹیکس لگانے کی کوشش کی گئی لیکن ۱۸۹۱-۹۲ء میں اصلاح کے بعد اسے از سر نو مرتب کیا گیا، ۱۹۱۳ء تک جرمنی کے سارے صوبوں میں باقاعدہ ٹیکس قانون نافذ ہوگیا۔

فرانس میں ٹیکس لگانے کی کوشش کا آغاز ۱۸۷۰ء میں ہوا لیکن نفاذ ۱۹۱۴ میں پہلی جنگِ عظیم سے دو ہفتے پہلے ہوا۔ایضاً (۲۷۵/۹)

اٹلی میں پہلی بار آمدنی، زمین، عمارات اور منقولہ دولت پر ۱۸۶۴ء میں ٹیکس عائد ہوا، سویڈن میں ٹیکس لگانے کی ابتداء ۱۸۹۲ء میں ہوئی، امریکہ میں صحیح طور پر ٹیکس کا نفاذ ۱۹۱۳ء میں دستور کی سولہویں ترمیم کے ذریعے ہوا، حالانکہ امریکہ کی باہمی خانہ جنگی کے نقصانات کو پورا کرنے کیلئے ۱۸۶۲ء سے ۱۸۷۲ء تک چھ سو ڈالر سے زائد آمدنی پر تین فیصد اور دس ہزار ڈالر پر پانچ فیصد وصول کیا جاتا تھا، بعد میں ایک ترمیم کے ذریعے پانچ ہزار ڈالر سے زائد آمدنی پر دس فیصد شرح کردی گئی۔

۱۸۹۳ء میں صدر امریکہ گرور کلیولینڈ (Grover Cleve land) نے جب دوبارہ ٹیکس لگانے کی کوشش کی تو سپریم کورٹ نے اسے غیر دستوری قرار دیکر ختم کروادیا لیکن دستور میں ترمیم کے بعد جب ٹیکس کا نفاذ ہوا تو اس وقت زیادہ سے

زیادہ شرح پانچ لاکھ ڈالر سے زیادہ آمدنی پر چھ فیصد رکھی گئی لیکن پہلی اور دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو اس وقت کم سے کم شرح تیس فیصد اور زیادہ سے زیادہ چورانوے فیصد تھی، ٹیکس سے محفوظ حد صرف پانچ سو ڈالر رہ گئی۔

دی ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا (۹/۸۸)

متحدہ ہندوستان میں ٹیکس

انگریز حکومت نے ہندوستان میں پہلی مرتبہ ۱۸۶۰ء میں انکم ٹیکس ایکٹ ۱۸۶۰ء کے تحت ٹیکس نافذ کیا، جسے ۱۸۶۵ء سے ۱۸۶۷ء تک معطل کردیا گیا لیکن ۱۸۶۷ء میں تھوڑی سی ترمیم کے بعد دی لائسنس ایکٹ آف ۱۸۶۷ء کے نام پر پھر سے جاری ہوگیا، جس کے تحت دو سو روپیہ سے زائد آمدنی پر دو فیصد ٹیکس عائد کیا گیا۔

۱۸۶۸ء میں اسی ایکٹ کا نام سرٹیفکیٹ ایکٹ ۱۸۶۸ء رکھ دیا گیا، اس ایکٹ کے تحت ٹیکس کی شرح کم کردی گئی، ٹیکس سے مستثنیٰ رقم دو سو سے بڑھا کر پانچ سو کردی گئی، ۱۸۶۹ء کے دوران کمپنیوں پر ڈیڑھ فیصد اور گورنمنٹ سیکورٹیز پر اڑھائی فیصد ٹیکس لگادیا گیا، دوسرے ذرائع سے وصول ہونے والے ٹیکسوں کی شرح کو دگنا کردیا گیا۔ ۱۸۷۲ء میں ٹیکس سے مستثنیٰ رقم کو پہلے ساڑھے سات سو اور پھر ایک ہزار کردیا گیا، یکم اپریل ۱۸۷۳ء میں دوسری مرتبہ چار سال کیلئے لوگوں کو عارضی طور پر ٹیکس سے نجات ملی لیکن ۱۸۷۷ میں لائسنس ٹیکس ایکٹ ۱۸۷۷ء کے تحت ہندوستان کے باسیوں پر پھر سے مسلط کردیا گیا، ۱۸۶۰ء سے ۱۸۸۰ء تک انکم ٹیکس ایکٹ ۱۳ ترامیم ہوئیں اور دو مرتبہ معطل ہوا لیکن ۱۸۸۶ء میں اسے ایسی صورت دیدی گئی کہ پھر تیس سال نافذالعمل رہا جس کے تحت پانچ سو روپے سے کم آمدنی کو انکم ٹیکس

سے مستثنیٰ لکھا گیا،سوداور تنخواہوں کی رقم جو پانچ سو سے دوہزار تک ہوتی اس پر ۴ پائی فی روپیہ کے حساب سے ٹیکس لیاجاتا،دوسری عام آمدنیوں پر جو دوہزار سے زیادہ ہوتیں ان پر ۵ پائی فی روپیہ کے حساب سے ٹیکس وصول کیاجاتا۔

۱۹۱۶ء میں نئی ترمیم کے ذریعے تنخواہوں، بونس،سالانہ وظائف پنشن اور سرکاری عطیات پر ایک ہزار سے دو ہزارروپے پر۴ پائی فی روپیہ سے ٹیکس کانیا شیڈول دیا گیا،اسی طرح دوسری آمدنیوں پر یعنی دوہزار سے پانچ ہزار پر ۵ پائی فی روپیہ،پانچ ہزا رایک روپے سے دس ہزار تک ۶ پائی فی روپیہ،دس ہزار ایک سے پچیس ہزار روپے پر ۹پائی فی روپیہ اور پچیش ہزار سے اوپر رقم پر۱۲ پائی فی روپیہ کے حساب سے ٹیکس کانظام قائم ہوا،۱۹۱۸ء میں پہلی مرتبہ کل آمدنی (total Income)ور قابل ٹیکس آمدنی (Tax able Income) کا تصور دیا گیا، آل انڈیا کمپنی کے ذریعہ انکم ٹیکس ایکٹ کوانکم ٹیکس ایکٹ۱۹۲۲ء کانام دیا گیا۔

(انکم ٹیکس لاء ص۲ تا ۳)۔

اگرچہ ۱۹۳۰ء ۱۹۳۶ء ۱۹۳۹ء،۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۵ میں بھی اس میں ترامیم ہوئیں لیکن یہی وہ ایکٹ ہے جو فقید المثال قربانی کے بعد ملنے والے پاکستان کو انگریزی سرکار سے ورثے میں ملااوروہ آج بھی اپنی اصل کے ساتھ پورے پاکستان میں رائج ہے،انگریزوں سے ہم نے آزادی تو حاصل کرلی لیکن ان کے قانون کے طوق کو ابھی تک اپنی گردنوں سے اتارنے سے عاجز ہیں حالانکہ اس قانون سے اسلام کادور کا بھی واسطہ نہیں ہے،اسلام نے مسلمانوں کواس کا بہترین متبادل عطا کیا ہے،اوروہ ہے نظام زکوۃ۔

اسلام اور ٹیکس

زمانہ جاہلیت اور ظہوراسلام کے بعد مختلف کفریہ ممالک میں رائج ٹیکسز کے بارے مختصر وضاحت آچکی،اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے ٹیکسز کے بارے کیا نقطہ نظر پیش کیا ہے؟

اسلام کی روسے ٹیکس کی دواقسام ہیں(۱) ظالمانہ وجابرانہ ٹیکس(۲)عادلانہ ومنصفانہ ٹیکس،اسلام نے ظالمانہ ٹیکس کی بالکل بیخ کنی کردی ہے اوراسے ہمیشہ کیلئے منسوخ کردیا ہے،ایسا ٹیکس نہ مسلمانوں پر لگایا جاسکتا ہے اورنہ کافروں اور ذمیوں پر اورعادلانہ ٹیکس کے بارے یہ تفصیل فرمائی ہے کہ کافروں پرعادلانہ ٹیکس لگایا ہے اور مسلمانوں پر عادلانہ ٹیکس بھی نہیں لگایا بلکہ اسکے متبادل مسلمانوں پر زکوۃ اورعشر کا حکم لاگو کیا ہے جوکہ ٹیکس نہیں ہے بلکہ اسلام کا ایک اہم رکن اور اعلیٰ ترین عبادت ہے، دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ عوام اورملک کے باشندوں کی دو اقسام ہیں (۱) مسلمان(۲) تمام غیرمسلم، مسلمانوں پر کسی قسم کا ٹیکس نہیں ہے نہ ظالمانہ اورنہ عادلانہ اورغیرمسلموں پر عادلانہ ٹیکس ہے لیکن ظالمانہ ٹیکس ان پر بھی نہیں لگایا سکتا۔

یہاں ہم نے دوباتوں کا ثبوت پیش کرنا ہے۔

(۱) ظالمانہ ٹیکس کا عدم جواز یااس کی منسوخی۔

(۲) مسلمانوں پرکسی قسم کا ٹیکس شریعت نے مقرر نہیں کیا۔

ان کی قدرے تفصیل یہ ہے۔

مکس کی منسوخیت اور اس کے ناجائز ہونے کے دلائل۔

زمانہ جاہلیت میں مختلف ممالک کے بادشاہ، علاقوں کے جاگیردار، اور اقوام وقبائل کے سردار اپنے عوام اور رعایا سے زبردستی اور جابرانہ طریقہ سے ظالمانہ ٹیکس لیتے تھے اور ان کو کسی قسم کی سہولت بھی فراہم نہ کرتے تھے، اسلام نے ایسے ٹیکسز کو بالکلیہ ختم کر دیا اور احادیث کثیرہ صحیحہ میں ظالمانہ ٹیکس لگانے، وصول کرنے اور وصول کرنے والے کے بارے سخت وعیدیں آئی ہیں، نسخ سے بھی ہماری مراد اس وقت کے مروجہ ظالمانہ ٹیکسوں کو بالکلیہ ختم کرنا ہے، اصطلاحی نسخ مراد نہیں کہ اسلام نے پہلے ان کو جائز اور مشروع قرار دیا ہو پھر بعد میں منسوخ کر دیا ہو۔

ٹیکس والا جہنمی ہے

حدیث نمبر(۱)

مسنداحمدبن حنبل(۶/۴۹) مسند الشاميين،حديث رويفع بن ثابت لانصاریؓ، مطبوعہ دارالفکر بیروت ،میں روایت ہے۔

عن يزيد بن ابی حبيب عن ابی الخيرقال:عرض مسلمة بن مخلد وكان اميراعلىٰ مصرعلى رويفع بن ثابت ان يوليه العشورفقال:انی سمعت رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم يقول:ان صاحب مكس فی النار.رقم الحديث۱۶۹۹۸)

ابوالخیر فرماتے ہیں کہ مصر کے امیر اور والی مسلمہ بن مخلدؓ نے صحابی رسول صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت رویفع بن ثابت کو پیش کش کی کہ وہ انہیں ٹیکس وصول کرنے کا ولی بنا رہے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ یقیناً ٹیکس والا جہنم میں جائیگا۔

☆اس حدیث میں صاحب مکس کے دو معنی ہو سکتے ہیں،(۱) ظالمانہ ٹیکس لگانے والا بادشاہ (۲) ظالمانہ ٹیکس وصول کرنے والا عامل۔

☆یہ حدیث مجمع الزوائد (۳/ ۸۸) مطبع القدسی، الترغیب والترہیب للمنذری (۱/ ۵۶۸) مطبع مصطفیٰ الحلبی میں بھی مروی ہے نیز ملاحظہ ہو کتاب الاموال لابی عبید (ص ۴۶۹) اور الفتح الربانی (۱۵/ ۱۸)

ٹیکس والا جنت میں نہیں جائیگا۔

حدیث نمبر (۲)

مسند احمد بن حنبل (۶/ ۱۱۸) المذکور میں حضرت عقبہ بن عامر الجہنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے۔

عن عبدالرحمن بن شماسة التجيبي عن عقبة بن عامر قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم يقول: لايدخل الجنة صاحب مكس يعني العشار. رقم الحديث ۱۷۲۹۵

عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرماتے ہوئے سنا کہ ٹیکس والا جنت میں داخل نہیں ہوگا، اس سے مراد تجارتی عشر یعنی سیلز ٹیکس یا زرعی ٹیکس وصول کرنے والا (عشار) ہے۔

یہ حدیث سنن ابو داؤد اور سنن الدارمی میں بھی مروی ہے، ملاحظہ ہو۔

صحیح مسلم (۶۸/۲) کتاب الحدود، باب حدالزنا، میں حضرت غامدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے رجم کا واقعہ منقول ہے، ان سے زنا کا ارتکاب ہوا تھا، نبی علیہ السلام نے انہیں رجم کرنے کا حکم صادر فرمایا، جب رجم کردیا گیا تو اس وقت نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: فوالذی نفسی بعده لقد تابت توبة لوتابها صاحب مکس لغفر له.

یعنی اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس نے ایسی سچی توبہ کرلی ہے کہ اگر ٹیکس والا بھی ایسی توبہ کرلیتا تو اسکی بھی مغفرت ہوجاتی۔ دوسری بعض روایات میں آتا ہے کہ نبی علیہ السلام نے یہ بات حضرت ماعز اسلمیؓ کی توبہ کے بارے میں فرمائی تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ ٹیکس زنا اور بدکاری سے بھی بدتر اور قبیح ہے۔

ٹیکس والے کی مغفرت نہ ہوگی۔

مجمع الزوائد للہیثمیؒ (۸۸/۳) کنزالعمال (۳۱۵/۵) رقم الحدیث ۱۳۰۰۳ الترغیب والترہیب (۲۷۱/۳) اور المعجم الکبیر للطبرانی (۳۵/۹) میں حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ان الله تعالی يدنو من خلقه فيغفر لمن استغفر الا البغی بفرجها والعشار.

اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے قریب ہوتے ہیں تو جو لوگ مغفرت چاہیں انکی مغفرت کر دیتے ہیں، مگر دو افراد کی نہیں کرتے، ایک زانیہ عورت کی اور ایک ٹیکس وصول کرنے والے کی۔

مجمع البحرین فی زوائد المعجمین (۱۹/۲) دارالکتب العلمیۃ، بیروت میں یہ

سنن ابوداؤد(۵۹/۲) کتاب الخراج والفیئ والامارۃ،باب فی السعایة علی الصدقة،سنن الدارمی(۳۸۲/۱)کتاب الزکوة،باب کراهیة ان یکون الرجل عشارا. نیز ملاحظہ ہو۔شرح معانی الآ ثار(۲۶۳/۱) باب الزکوة،هل یأخذها الامام ام لا؟

والمعجم الکبیرللطبرانی (۳۱۷/۱۷)...طبعةالعراق،ومشکوة المصابیح(۳۲۲/۲)کتاب الامارة.

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث ردالمحتار(۳۱۰/۲)مطلب ماورد فی ذم العشار، میں صحیح ابن خزیمہ اور مستدرک حاکم سے بھی نقل فرمائی ہے۔

فی المستدرک للحاکم(۵۶۲/۲)کتا ب الزکوة،رقم الحدیث (۱۴۶۹) عن عقبة بن عامرؓقال:سمعت رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم یقول:لایدخل صاحب مکس الجنة.قال یزید بن هارون:یعنی العشار.قال الحاکم:هذاحدیث صحیح علی شرط مسلم ولم یخرجاه.،قلت:قد سکت عنه الذهبی فی التلخیص.وقال فی الفیض:قال الحاکم:صحیح.وقال فی المنار:فیه اسحاق مختلف فیه.

فی الطحاوی(۲۶۳/۱) باب الزکوة هل یأ خذهاالامام ام لا؟ عن عقبة بن عامرؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم:لایدخل الجنة صاحب مکس یعنی عاشرا.

ٹیکس زنا سے بھی قبیح فعل ہے۔

حدیث(۳)

حدیث ان الفاظ میں منقول ہے۔

عن عثمان بن ابی العاص الثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنه عن النبی صلی الله علیه وآله وسلم قال تفتح ابواب السماء نصف الیل فینادی مناد هل من داع فیستجاب له؟هل من سائل فیعطی؟هل من مکروب فیفرج عنه؟فلایبقی مسلم یدعوبدعوة الااستجاب الله عزوجل الازانیة تسعی بفرجهااوعشار.وقال محمدحسن اسماعیل الشافعی فی التعلیق علیه: اسناده صحیح .

نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ آدھی رات کو آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں پھر ایک منادی نداء کرتا ہے کہ کیا کوئی دعا کرنے والا ہے کہ اس کی دعا قبول کی جائے ؟ کیا کوئی مانگنے والا ہے کہ اسے کچھ دیا جائے ؟ کیا کوئی پریشان حال ہے کہ اس کی پریشانی دور کی جائے ؟ پھر کوئی بھی ایسا مسلمان نہیں رہتا جو اللہ تعالیٰ سے دعا کرے اور اللہ اس کی دعا قبول نہ کریں مگر وہ بدکار عورت جو اپنی شرمگاہ کے ذریعہ کماتی ہے اور ٹیکس وصول کرنے والا۔

ٹیکس والے کا عبرت ناک انجام۔

حدیث(۵)

فی مجمع البحرین(۲/ ۱۹) ایضا عن عمر و بن دینار انه صحب ابن عمر فی السفر فکان اذاطلع سهیل قال لعن الله سهیلا فانی سمعت رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم یقول: کان عشارا یظلمهم ویغصب اموالهم فمسخه الله شهابافجعله بحیث ترون:قال فی التعلیق:اسناده

ضعیف جدا.

عمرو بن دینارؒ سے مروی ہے کہ وہ ایک سفر میں عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ رہے تو جب سہیل نامی تارہ طلوع ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سہیل پر لعنت کرے کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہ ایک ٹیکس وصول کنندہ تھا جو لوگوں پر ظلم کرتا اوران کے اموال غصب کرتا تھا ۔پس اللہ تعالیٰ نے اس کی صورت مسخ کرکے اس سے یہ تارہ بنادیااور اسے ایسی جگہ رکھ دیا جوتم دیکھتے ہو۔

مصباح اللغات (ص ۴۴) مادہ سھل میں ہے۔

سہیل ایک روشن ستارہ ہے جو بلادِ عرب میں گرمی کے آخر زمانہ میں طلوع ہوتا ہے، مشہور ہے کہ اس کے طلوع ہونے پر گبریلے مرجاتے ہیں متنبی کہتا ہے۔

وتنکر موتهم وانا سهيل طلعت بموت اولادا لزنا

تم ان کی موت سے انکاری ہوحالانکہ میں سہیل ستارہ ہوں،اولادِ زنا کی موت کے ساتھ طلوع ہوا ہوں۔

ٹیکس والے کا گناہ معذرت قبول نہ کرنے والے کے گناہ سے زیادہ ہے۔

حدیث(٦)

سنن ابنِ ماجہ(ص ۲۶۴) ابواب الادب،باب المعاذیر میں حضرت جودانؓ کی روایت ہے۔

قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم:من اعتذرالی اخیه بمعذرۃ فلم یقبلها کان علیه مثل خطیئة صاحب مکس.

یعنی جس نے اپنے بھائی سے کوئی معذرت کی اور اس نے معذرت قبول نہ کی تو اس کو اتنا گناہ ملتا ہے جتنا کہ ٹیکس والے کا گناہ ہے۔

یہ حدیث امام ابن ماجہؒ نے دوسندوں سے نقل کی ہے،مسند امام اعظم (ص ۲۱۱) کتاب الادب میں یہ حدیث دو مختلف صحابہؓ سے مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے۔

(۱)ابو حنیفة عن علقمة عن ابن بریدة عن ابیه قال قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم:من لم یقبل عذر مسلم یعتذر الیه فوزره کوزر صاحب مکس فقیل یارسول الله صلی الله علیه وآله وسلم وما صاحب مکس قال عشار.

سلیما بن بریدہؓ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس سے کوئی مسلمان معذرت کرے اور وہ معذرت قبول نہ کرے تو اس کا گناہ ایسا ہے جیسے مکس والے کا،تو کہا گیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صاحب مکس کون ہے ؟ آپ نے فرمایا ظالمانہ ٹیکس لگانے والا اور وصول کرنے والا۔

(۲) ابو حنیفة عن نافع عن ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم:من اعتذرالیه اخوه المسلم فلم یقبل عذره فوزرہ کوزر صاحب مکس یعنی عشارا .

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس مسلمان سے اس کا مسلمان بھائی معذرت کرے اور وہ اس کی معذرت قبول نہ کرے تو اس کا گناہ صاحب مکس یعنی ظالمانہ ٹیکس لگانے والے اور وصول کرنے والے کی طرح ہے۔

☆ان احادیث میں جائز معذرت قبول نہ کرنے والے کے گناہ کو ٹیکس والے کے گناہ سے تشبیہ دی گئی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ ٹیکس کا گناہ اس سے بھی بدتر ہے۔

ٹیکس والے کو قتل کردو

حدیث(۷)

المعجم الکبیر للطبرانی (۳۰۱/۱۹) طبعۃ العراق میں حضرت مالک بن عتاہیہؓ کی مرفوع روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان لقیتم عشارا فاقتلوہ.

یعنی اگر تمہارا ٹیکس والے سے آمنا سامنا ہو تو اسے قتل کردو۔

یہ حدیث مسند احمد بن حنبل میں دو سندوں کے ساتھ ان الفاظ میں مروی ہے۔

فی مسند الامام احمد بن حنبل،مسند الشامیین(۳۰۲/۲) رقم الحدیث ۱۸۰۷۹ عن مالک بن عتاھیةؓ قال:سمعت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقول:اذالقیتم عاشرافاقتلوہ .

وفیہ ایضاًرقم الحدیث(۱۸۰۸۰)حدثناقتیبة بن سعید بھذا

الحدیث وقصر عن بعض الاسنادوقال :یعنی بذلک الصدقة یاخذ ھا علی غیرحقھا.

وفی جمع الفوائدمن جامع الاصول ومجمع الزوائد (۳۸۹/۱) رقم الحدیث ۲۷۵۲ ومالک بن عتاھیةؓ رفعه:اذا لقیتم عاشرا فاقتلوه یعنی بذلک الصدقة علی غیرحقھا: لاحمد والکبیر برجل لم یسم.

وفی اعذب المواردتحته:فیه رجل لم یسم کذا فی مجمع الزوائد(۸۸/۳)

وفی کتا ب الاموال(ص۵۲۵)الجزء الرابع،باب ذکرالعاشر وصاحب المکس وما فیه فی الشدة والتغلیظ،عن مالک بن عتاھیةؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم:من لقی صاحب عشور فلیضرب عنقه وفی روایة اخری:اذالقیتم عاشرا فاقتلوه قال:یعنی بذلک الصدقة یأخذھا علی غیرحقھا.

وفی جامع الرموز(۳۱۸/۱)وحدیث ان لقیتم عاشرا فاقتلوه معناه تارکاللفرض فی ھذاالامرکماقال:ابن الاثیر لکن فیه اشکال ولعله تغلیظ،وفی غواص البحرین ای ان وجدتم من یأخذ العشرعلی ماکان یأخذه اھل الجاھلیة مقیماً علی دینھم او مستحلا فاقتلوه لکفره.

وفی الدرالمختارمع ردالمحتار(۶۴/۴)المکابربالظلم وقطاع الطریق وصاحب المکس وجمیع الظلمة بادنی شیء له قیمة)وجمیع الکبائروالاعونة والسعاة یباح قتل الکل ویثاب قاتله اھ

ظالم حکمران کا ٹیکس وصول کنندہ نہ بنو

حدیث(۷)

فی جمع الفوائد من جامع الاصول ومجمع الزوائد(۲/۴۴۹)
باب طاعة الامام ولزوم الجماعة وملوک الجور،۶۰۶۰ (ابوهريرة) رفعه
يكون فی آخر الزمان امراء ظلمة ووزراء فسقة وقضاة خونة وفقهاء كذبة
فمن ادرک ذلک الزمان منكم فلا يكونن لهم جابيا ولا عريفا ولا
شرطيا.للاوسط والصغيربلين.

وفی اعذب الموارد فی تخريج جمع الفوائد تحته:وفيه داؤد بن
سليمان الخراسانی،قال الطبرانی:لابأس به وقال الازدی ضعيف جداً
ومعاوية بن الهيثم لم اعرفه وبقية رجاله ثقات،كذا فی مجمع الزوائد
(۵/۲۳۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرفوع روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہا آخری زمانے میں ظالم حکمران اور فاسق وزراء اور
جاہل قاضی (جسٹس) اورجھوٹے فقیہ ہوں گے،لہٰذا تم میں سے جو شخص اس زمانے
کو پائے وہ ہرگز ان کیلئے ٹیکس وصول کنندہ اور سیکرٹری اورشرطی (پولیس) نہ بنے۔

فی المنجد(ص۷۶)المادة ج ب و،(جبا جباً وجبواً وجبياً وجبوةً
وجباوةً وجبى وجباية)الخراج:جمعه .....المجبی الخراج.

وفيه ايضاً(ص ۵۰۲)المادة ع ر ف،العريف العالم بالشيئی،من
يعرف اصحابه.القيم بامرالقوم.النقيب وهودون الرئيس.

وفی معجم لغة الفقهاء(۳۱۰) العریف بفتح فکسر ج عرفاء
العالم بالشئی (Well Intormed).

ظالمانہ ٹیکس کے متعلق علماء امت کے اقوال

ٹیکس قبیح ترین گناہ ہے

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ حدیث مکس کے تحت صحیح مسلم کی شرح (۲/۲۸) میں لکھتے ہیں۔

فیه ان المکس من اقبح المعاصی والذنوب الموبقات وذلک لکثرة مطالبات الناس له وظلا ماتهم عنده وتکرر ذلک منه وانتهاکه للناس واخذاموالهم بغیرحقها وصرفها فی غیز وجهها.وکذافی تکملة فتح الملهم (۲/۴۵۳)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ٹیکس قبیح ترین مغاصی اور ہلاک کردینے والے گناہوں میں سے ہے اور یہ اس لئے کہ اس میں لوگوں سے بکثرت مطالبات ہوتے ہیں اور نہ دینے کی صورت میں ان پر مظالم کئے جاتے ہیں اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے اور لوگوں کی بے عزتی اور آبرو ریزی کی جاتی ہے اور ان کا مال بغیر حق کے لیا جاتا ہے اوراس کے مصارف کے علاوہ میں خرچ کیا جاتا ہے۔

ٹیکس والا کافر یافاسق ہے۔

مسند احمد بن حنبل کے شارح احمد عبدالرحمن البنا الساعاتیؒ اپنی مشہور شرح "الفتح الربانی فی ترتیب مسند احمد بن حنبل الشیبانی (۱۵/۱۷) میں لکھتے ہیں۔

انما کان فی النارلظلمه الناس واخذ اموالھم بدون حق شرعی فان استحل ذلک کان فی النارخالدا فیھا ابدا لانه کافر والافیعذب فیھا مع عصاۃ المؤمنین ماشاء اللہ لم یخرج ویدخل الجنة .

ٹیکس والا جہنم میں اس لئے جائے گا کہ وہ لوگوں پرظلم کرتا او ران کا مال شرعی حق کے بغیر وصول کرتا ہے پھر اگر وہ اسے حلال سمجھ کر کرتا ہے تو آگ میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا کیونکہ وہ کافر ہے اوراگر حلال سمجھ کرنہیں کرتا تو اسے اللہ تعالیٰ جتنی مدت چاہیں گے گناہگار مسلمانوں کے ساتھ عذاب دیا جائے گا، پھر جہنم سے نکل کر جنت میں داخل ہوجائے گا۔

نیز (۱۸/۱۵) میں لکھتے ہیں۔

ان المکس من اعظم الذنوب وذلک لکثرۃ مطالبات الناس ومظلماتھم وصرفھا فی غیر وجھھا .

ٹیکس بلاشبہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے اور یہ اس لئے کہ اس میں لوگوں سے کثرت سے مطالبے کئے جاتے ہیں اور ٹیکس وصول نہ ہونے کی صورت میں ان پر مظالم ڈھائے جاتے ہیں اورجبراً وصول ہونے پر ان کو غیر مصارف میں خرچ کیا جاتا ہے۔

ٹیکس لینا اپنے پیٹ میں آگ بھرنا ہے

حافظ زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی المنذریؒ المتوفی(۶۵۶) ،الترغیب والترھیب(۵۶۷/۱) میں لکھتے ہیں۔

اماالان فانھم یأخذون مکسا باسم العشرومکوسا اخری لیس لھا

اسم بل شئی یاخذون حراماوسحتا ویأ کلونه فی بطونها نارا حجتهم فیه داحضة عندربهم وعلیهم غضب ولهم عذاب شدید.

آج کل عشر کے نام پر جومکس (ٹیکس) وصول کررہے ہیں اور دوسرے ٹیکسز بھی وصول کرتے ہیں جن کا کوئی نام نہیں، یہ بلاشبہ ناجائزاورحرام چیز لے رہے ہیں ،اوراپنے پیٹوں میں آگ بھررہے ہیں،اس بارے ان کے رب کے ہاں انکی حجت نہیں چلے گی اوران پرغضب وقہر ہوگا اوران کوسخت عذاب ملے گا۔

وکذافی ردالمحتار(۲/۰ ۲۱)عن الزواجرلابن حجر الهیثمیؒ.

ٹیکس گناہ کبیرہ ہے

ظالمانہ ٹیکس بالاتفاق کبیرہ گناہ ہے،علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ علیہ کا گناہ کبیرہ وصغیرہ کے موضوع پر مستقل رسالہ ہے،اس میں گناہ کبیرہ کاشمارکرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

والسعایة عند ظلم (رسائل ابن نجیم ص ۲۴۹)

یعنی ظالمانہ ٹیکس کی وصولی بھی گناہ کبیرہ ہے۔

امام شمس الدین محمدالذہبی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ،الکبائرص ۱۲۰ میں لکھتے ہیں:

ناجائز ٹیکس کاعائد کرنااوراسے ظلماًوصول کرنااللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں داخل ہے۔

انماالسبیل علی الذین یظلمون الناس ویبغون فی الارض بغیر الحق،اولئک لهم عذاب الیم ○

الزام تو صرف ان پر ہے جولوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق زیادتیاں کرتے پھرتے ہیں، انہی لوگوں کیلئے دردمند عذاب ہے۔

اور ٹیکس ظلم کی بدترین قسم ہے کیونکہ وہ ناحق طور پر لیا جاتا ہے اور غیر مستحق کودیا جاتا ہے، اسی لئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا صاحب ٹیکس (ٹیکس وصول کرنے والا) جنت میں داخل نہیں ہوگا اور ایسا اس وجہ سے ہوگا کہ اس شخص پر بندوں کے مظالم کی ذمہ داری ہوگی اور لوگ اپنے حقوق طلب کریں گے تو قیامت کے دن کہاں سے لاکر ان لوگوں کے حقوق ادا کرے گا جن سے ظلماً ٹیکس وصول کرچکا تھا۔

نتیجہ یہی ہوگا کہ اس کی نیکیاں اگر کچھ ہوں گی تو وہ ان حقداروں کو دیدی جائیں گی ورنہ ان کے معاصی کا انبار اس کے سر پر لاد کر جہنم رسید کر دیا جائے گا، در حقیقت مکاس (ٹیکس نافذ کرنے اور وصول کرنے والا) لٹیروں اور ڈاکوؤں کی مانند ہے جو راستہ میں بے قصوروں پر حملہ آور ہوکر ان کے اموال ومتاع پر غاصبانہ قبضہ کر بیٹھتے ہیں اور اس محکمہ کے سب ہی لوگ یکساں طور پر حرام خور ہیں اور حدیث میں ہے کہ جس شخص کا جسم حرام غذا سے پرورش پایا ہووہ جنت میں داخل نہ ہوگا، جہنم اس کیلئے بہتر ہے۔

واحدیؒ نے ایک آیت کی تفصیل میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے میں شراب کا کاروبار کیا کرتا تھا اس وقت کا کمایا ہوا نفع میرے پاس ہے، اگر میں اس کو راہِ خدا میں صرف کردوں تو کیا یہ خرچ کرنا مجھے نفع دے گا؟ آپ نے

فرمایا اگر تو اس کو حج، جہاد اور صدقہ جیسے اہم مصارفِ خیر میں بھی صرف کر چکا تب بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا، اللہ تعالیٰ تو بس حلال اور طیب چیزوں کو قبول کرتے ہیں، چنانچہ آپ کے اس قول کی تصدیق میں یہ آیت نازل ہوئی۔

قل لا یستوی الخبیث والطیب ولو اعجبک کثرة الخبیث.

آپ فرمایئے کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں ہوسکتا، اگرچہ ناپاکی کی کثرت آپ کو متعجب کر دے۔

ٹیکس ڈاکہ زنی ہے

علامہ مناوی رحمۃ اللہ علیہ نے فیض القدیر (ص ۴۴۹) میں پہلے امام طیبی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ٹیکس ہلاک کرنے والے امور میں سے ہے پھر علامہ ذہبیؒ کی الکبائر سے اسکا گناہ کبیرہ ہونا نقل کرنے کے بعد اس کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ ٹیکس قطع طریق (ڈاکہ زنی) ہی کی ایک قسم ہے جو کہ چوری سے بڑا جرم ہے کیونکہ اگر وہ زیادتی کر کے لوگوں پر نئے نئے ٹیکس عائد کر دے تو یہ ظلم ہے اور اس ناانصافی میں شریک سب اکالون للسحت (حرام کھانے والے) ہیں۔

علامہ ابنِ حجر الہیثمی رحمۃ اللہ علیہ الزواجر عن اقتراف الکبائر (۱/۱۴۹) میں لکھتے ہیں:

''فقہاء کرام نے مکاس (ناجائز ٹیکس وصول کرنے والے) کو چوروں اور راہزنوں میں شمار کیا ہے بلکہ ان کا جرم راہزنوں کے جرم سے بھی زیادہ شدید ہے''۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ البالغہ (۲/۱۵۱)

میں لکھتے ہیں۔

واخذالعشور بمنزلة الطريق بل اقبح

ٹیکس،عشروزکوۃ کی وصولی میں زیادتی کرنا،ڈاکہ زنی کے مترادف ہے بلکہ اس سے بھی قبیح تر ہے۔

جو ظالمانہ ٹیکس لے اسے قتل کردیا جائے۔

امام ابو بکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ احکام القرآن (۹۹/۳) میں آیت جزیہ حتی یعطو الجزية عن يد وهم صاغرون کے تحت لکھتے ہیں۔

فواجب على هذا قتل من تسلط على المسلمين بالغصوب واخذ الضرائب والظلم سواء كان السلطان ولاه ذلک او فعله بغيرامر السلطان وهذايدل على ان هولا ء النصارى الذين يتولون اعمال السلطان وظهرمنهم ظلم واستعلاء على المسلمين واخذا لضرائب لا ذمة لهم وان دمائهم مباحة وان كان اخذ واالضرائب ممن ينتحل الاسلام والقعود على المراصد لاخذاموال الناس يوجب اباحةدمائهم اذكانوا بمنزلة قطاع الطريق ومن قصد انسانالاخذ ماله فلاخلاف بين الفقهاء ان له قتله وكذلک قال النبى صلى الله عليه وآله وسلم من طلب ماله فقاتل فقتل وهوشهيدوفى خبرآخرمن قتل دون ماله فهوشهيد ومن قتل دون اهله فهوشهيدومن قتل دون دمه فهوشهيد فاذا كان هذا حكم من طلب اخذ مال غيره غصباوهوممن ينتخل الاسلام فالذمى اذا فعل ذلک استحق القتل من وجهين احدهمااقتضاه ظاهرالآية من وجوب قتله والآخر

قصده المسلم باخذماله ظلما.

اس سے معلوم ہوا کہ جو بھی شخص مسلمانوں پر مسلط ہوکر ان کا مال غصب کرتا، ان سے ٹیکسز لیتا اوران پر ظلم کرتا ہے، اسے قتل کرنا واجب ہے خواہ بادشاہ وقت نے اسے یہ کام سپرد کیا ہو یا وہ خود بادشاہ کے امر کے بغیر ایسا کرتا ہو۔۔۔۔لوگوں کا مال لینے کیلئے راستوں اور رصد گاہوں میں بیٹھنا راہزنی ہے اوراس سے ان کا خون مباح ہوجاتا ہے، شرعی اصول یہ ہے کہ جو بھی کسی کا مال لینے کا قصد کرتا ہے تو فقہاء کا اتفاق ہے کہ اسے قتل کرنا درست ہے اور یہی بات حدیث میں بھی آئی ہے ،دوسروں کا مال غصب کرنے والے مسلمان کا جب یہ حکم ہے تو ذمی اگر اس طرح کرے گا تو وہ دووجہ سے قتل کا مستحق ٹھہرے گا،ایک تو اس لئے کہ ظاہر آیت کا مقتضی اس کا وجوب قتل ہے اور دوسرے اس لئے کہ وہ مسلمان کا مال ظلماً لینا چاہتا ہے ۔

فی المحیط البرهانی(۱۳۴/۸) کتاب الکراهیة،المتفرقات، قتل الاعونة والسعاة والظلمة فی ایام الفترة افتی کثیرمن مشائخنارحمهم الله باباحته....

ٹیکس والے کو پوچھے بغیر جہنم میں ڈالا جائے گا

فی کتاب الاموال(ص ۵۲۴)الجزء الرابع،باب ذکرالعاشر وصاحب المکس ومافیه من الشدة والتغلیظ،عن عبدالله بن عمرؓ وقال: ان صاحب المکس لایسأل عن شئی یؤخذ کما هو فیرمی به فی النار.

حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ ٹیکس والے سے کسی چیز کے بارے سوال بھی نہ ہوگا،وہ جس حالت میں بھی ہو اسے پکڑ کر جہنم میں پھینک دیا جائیگا۔

ٹیکس کے قریب مت جاؤ

وفیہ ایضاً(ص ۵۲۵) عن ابراھیم المعافریؒ ان خالد بن ثابت اخبرہ ان کعب الاحبار اوصاہ اوتقدم الیہ عند خروجہ مع عمرو بن العاص الی مصر،ان لا یقرب المکس،ونہا ہ عن ذلک .

خالدبن ثابتؓ کہتے ہیں کہ جب انہوں نے حضرت عمروبن عاصؓ کے ساتھ مصر جانے کاارادہ کیاتو کعب احبارؒ نے انہیں وصیت بھیجی یاخودان کے پاس آئے اور وصیت کی کہ ٹیکس کے قریب بھی نہ جاؤ اور انہیں اس سے منع کر دیا۔

ٹیکس مالی زیادتی ہے

وفیہ ایضاًعن یعقوب بن عبدالرحمن القاری عن ابیہ قال: کتب عمر بن عبدالعزیز الی عدی بن ارطاۃ.ان ضع عن الناس الفدیۃ وضع عن الناس المائدۃ وضع عن الناس المکس ولیس بمکس ولکنہ البخس الذی قال اللہ تعالیٰ.......”ولاتبخسواالناس اشیائھم ولا تعثوافی الارض مفسدین“(سورۃ ھود:۸۵ فمن جاء بصدقۃ فاقبلھا منہ ومن لم یا تک بھا فاللہ حسیبہ.

عبدالرحمٰن القاریؒ کہتے ہیں کہ عمربن عبدالعزیزؒ نے عدی بن ارطاۃؒ کولکھا کہ لوگوں کو فدیہ اور مائدہ (ٹیکس کی خاص صورت جس میں لوگوں سے کھانا وصول کیا جاتا ہے) معاف کردو اور لوگوں کو ظالمانہ ٹیکس سے چھٹکارا دیدو، یہ عادلانہ ٹیکس نہیں ہے بلکہ یہ وہ بخس (لوگوں کامال گھٹانا،ان پرمال میں ظلم کرنا،انکے مالی حق میں

زیادتی کرنا) ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے یعنی لوگوں کے ساتھ ان کی اشیاء اور اموال میں ظلم اور گھٹاؤ والا معاملہ نہ کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ، لہٰذا جو تمہارے پاس صدقہ لائے تو اسے قبول کرو اور جو شخص کچھ بھی نہ دے تو اللہ تعالیٰ خود اس کا محاسبہ فرمائیں گے۔

ٹیکس کا دفتر و آفس گرادو

وفیھا ایضا عن کریز بن سلمان قال: کتب عمر بن عبدالعزیز الی عبداللہ بن عوف القاری ارکب الی البیت الذی برفح الذی یقال له بیت المکس فاھدمه ثم احمله الی البور فانسفه فیه نسفا.

کریز بن سلیمانؒ کہتے ہیں عمر بن عبدالعزیزؒ نے عبداللہ بن عوف القاریؒ کو خط لکھا کہ مقام رفح جاؤ اور وہاں ایک گھر ہے جسے ٹیکس گھر کہا جاتا ہے اسے گرادو پھر اس کے ملبے کو غیر مزروعہ زمین (بور کسی مقام کا نام بھی ہوسکتا ہے) میں لیجا کر بکھیر دو۔

ظالمانہ ٹیکس کو بادشاہ کا حق کہنا مکروہ، حرام اور ناجائز ہے۔

فقہاء شافعیہؒ نے لکھا ہے کہ ظالمانہ ٹیکس کے بارے یہ کہنا کہ یہ بادشاہ کا حق ہے یا حکومت وقت کا حق ہے یا اس کا ادا کرنا لازم ہے صحیح نہیں ہے، سخت مکروہ ہے، امام نوی رحمۃ اللہ علیہ نے الاذکار میں لکھا ہے کہ یہ اشد المنکرات اور اشنع المحدثات میں سے ہے۔

امام سیوطیؒ نے مختصر الاذکار للنوویؒ میں اسے مکروہ لکھا ہے، بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ کفر ہے، علامہ ابن حجر ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ اس علم کے باوجود کہ یہ ظالمانہ ٹیکس ہے اسے حق سلطان اعتقاد کرنا اور سمجھنا کفر ہے، اگر اس کے ظالمانہ ہونے کا علم نہ ہو ویسے حق سلطان کہہ دے تو یہ حرام اور صریح جھوٹ ہے۔

فی الفتاوی الحدیثیة لابن الحجرالهیثی(ص۱۹۲)دارالتراث العربی.مطلب:تحذیرالناس من قولهم فی المکوس هذاحق السلطان ونحوه،واماالمسئلة الرابعة والعشرون:فالتصریح با لکراهة فیها من تصرف الجلال(السیوطی)......وعبارة الاذکار:ممایتأ کد ا لنهی عنه والتحذیرمنه مایقول العوام واشباههم فی هذه المکوس التی تؤخذ ممن یبیع ویشتری ونحوهما:هذا حق السلطان اوعلیک حق السلطان ونحو ذلک وهذ امن اشد المنکرات واشنع المحدثات حتی قال بعض العلماء :من سمی هذاحقافقد کفر وخرج عن ملة الاسلام،والصحیح انه لایکفر الاان اعتقدحقا مع علمه بانه ظلم والصواب ان یقال فیه:المکس او ضریبة السلطان او نحوذلک من العبارات انتهی،وبهایعلم ان هذه الکلمة اماکفربقیده المذکوروهوظاهر،واماحرام کما دل علیه صریح قوله:وهذا من اشدالمنکر،وقوله:وممایتأکد النهی عنه والتحذیرمنه ویوجه بان تسمیته حقا مع عدم اعتقاد حقیته کذب صریح فحرم ذلک واماالکراهةفلا وجه لها فتصریحه اعنی الجلال بهاممایتعجب منه فاعلمه

ظالمانہ ٹیکس علماء یہود کا طریقہ تھا

ظالمانہ ٹیکس علماء یہود کا طریقہ رہا ہے، چنانچہ زمانہ جاہلیت میں علماء یہود کی ایک کارستانی یہ بھی تھی کہ انہوں نے رعایا پر ٹیکس لاگو کئے ہوئے تھے اوران سے ظالمانہ ٹیکس وصول کرکے اپنا پیٹ بھرتے تھے،ان کی یہی کارستانی ان کے اسلام قبول کرنے سے مانع رہی تھی ۔

قال الله تبارک وتعالی:یاایهاالذین امنوا ان کثرا من الاحبار والرهبان لیأکلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل الله الایة.

سورة التوبة ۹ : ۳۴

قال الحافظ ابن کثیر:لیأ کلون اموال الناس بالباطل وذلک انهم یاکلون الدنیا بالدین ومناصبهم ورياستهم فی الناس،یاکلون اموالهم بذلک کماکان لاحبار الیهودعلی اهل الجاهلیة شرف ولهم عندهم خرج وهدیاوضرائب تجیئی الیهم فلما بعث الله رسو له صلوات الله وسلامه علیه استمرواعلی ضلا تهم وکفرهم وعنادهم،طمعامنهم ان تبقی لهم تلک الریاسات فاطفأ ها الله بنورالنبوة وسلبهم ایاهاوعوضهم بالذلة والمسکنة وباؤوا بغضب من الله تعالی.تفسیرابن کثیر(۳۷۸/۳)

ابن خلدونؒ کا تجزیہ

رئیس المؤرخین علامہ عبدالرحمٰن بن خلدونؒ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب تاریخ ابن خلدون کے مقدمہ کی جلد دوم فصل نمبر ۳۸و ۳۹ میں ٹیکس اور محاصل پر تفصیلی

بحث کی ہے،علامہ ابن خلدون کا تجزیہ یہ ہے کہ ظالمانہ ٹیکس اور شرح محاصل کی زیادتی ملک کی تباہی و بربادی،حکومت کے خاتمے،رعایا کے حوصلے پست کرنے،ملکی معشیت پر منفی اثرات ڈالنے کا سبب ہے۔

چنانچہ مقدمہ ابن خلدون (۲/۹۹) میں فرماتے ہیں۔

یادرکھیے! کہ حکومت کے ابتدائی دور میں محصول کی شرح کم ہوتی ہے مگر مجموعی طور پر وصول یابی زیادہ ہوتی ہے اور آخر زمانے میں اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے،اس کا سبب یہ ہے کہ اگر حکومت دینی آئین کے مطابق چلائی جارہی ہے تو لوگوں سے صدقے،محصول اور ٹیکس شرعی مقدار کے مطابق وصول کیے جائیں گے اور ان کی شرح کم ہے ــــــ جن میں کمی وبیشی بھی ناممکن ہے۔

اوراگر حکومت غیر شرعی آئین وعصبیت پر چل رہی ہے تواس کے لئے بھی ابتدائی دورمیں سادگی لازمی ہے اور سادگی،رواداری،حسنِ معاملہ،شفقت ،لوگوں کے مالوں سے دوری اور ان سے بقدرِ حق ہی کے مالکی وصولیابی چاہتی ہے،اس لئے سرکاری حقوق کی شرح تھوڑی ہوتی ہے اور وہی انہیں دینی پڑتی ہے اور لوگوں کے پاس مال جمع ہوجاتا ہے،اس کے برعکس جب رعایاپر سرکاری حقوق کم ہوتے ہیں تووہ اپنے کام گہری دلچسپی اورانتہائی ذوق وشوق سے انجام دیتے ہیں،اس لئے آبادی بڑھتی چلی جاتی ہے کیونکہ شرح حقوق کم ہونے کی وجہ سے دوسرے لوگ خوشی خوشی ملک میں آبستے ہیں پھرجب آبادی کی کثرت ہوجاتی ہے تو لامحالہ سرکاری حقوق میں اضافہ ہوجاتا ہے اور کثرت تعداد کی وجہ سے لگان سے سرکاری مال بڑھ جاتا ہے اور وصولیابی بھی آسانی سے ہوتی ہے ــــــ لیکن جب حکومت جم جاتی ہے اور

چلتی رہتی ہے اور یکے بعد دیگرے بادشاہ تخت نشین ہوتے رہتے ہیں،ان میں رعایا پردباؤ ڈالنے کی عادتیں پڑجاتی ہیں اوربدویت اورسادگی کا اثرجاتارہتاہے اور رواداری اورلوگوں کے مال سے اجتناب کافور ہوجاتا ہے اورظالم بادشاہ آجاتے ہیں اورشہرت جودباؤڈالنے کی مقتضی ہے اپنارنگ جمالیتی ہے اورفرمانرواؤں کی عادتوں پرشہریت کارنگ چڑھ جاتاہے اورعیش وعشرت کی وجہ سے ان کے مصارف اوراخراجات بڑھ جاتے ہیں تووہ سرکاری حقوق کی شرحیں رعایا، کسانوں اور تمام لوگوں پر بہت کچھ بڑھا دیتے ہیں تاکہ انہیں زیادہ سے زیادہ رقم وصول ہو اورتجارتی مال کے آنے جانے پرچنگیاں لگا دیتے ہیں پھر کثرت عیش پرستی اور مصارف بڑھ جانے کی وجہ سے بتدریج شرح میں دن بدن اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں، حتی کہ یہ رقمیں رعایاپر ادا کرنی بھاری ہوتی ہوجاتی ہیں اور انکی کمریں توڑ کر رکھ دی جاتی ہیں پھر چونکہ زیادتی بتدریج تھوڑی تھوڑی ہوتی رہتی ہے،اس لئے لوگ اس کے عادی بن جاتے ہیں، بلکہ انہیں یہ خبر بھی نہیں رہتی کہ کس نے اضافہ کیا اورکس نے اضافہ کا قانون وضع کیا لیکن آبادی کے سلسلہ میں اس کا رعایاپر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ نفع کم ہونے کی وجہ سے ان کے دلوں میں کمائی کا جذبہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے کیونکہ جب وہ اپنے منافع اور محاصل پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں فائدہ کچھ نظر نہیں آتا،اس لئے ان کے حوصلے پست ہوجاتے ہیں اور کام چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں،اس طرح آبادی گھٹنے لگتی ہے،جس کے نتیجے میں محصول کی مجموعی آمدنی گھٹ جاتی ہے،پھر فرماں روا اس کمی کو پورا کرنے کیلئے اور اضافہ کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ ہر کام ہر پیشہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اس میں کچھ بھی فائدہ نظر نہیں آتا کیونکہ ایک تو زمین

تیار کرنے میں کافی خرچہ آتا ہے، دوسری طرف بھاری بھاری محصول ادا کرنے پڑتے ہیں، اسلئے لوگ جس فائدے کی آس لگائے بیٹھے تھے وہ ختم ہوجاتا ہے، الغرض ایک طرف تو سرکاری آمدنی کا مجموعہ گھٹتا رہتا ہے اور دوسری طرف شرح محصول میں اضافہ ہوتا رہتا ہے تاکہ نقصان کی تلافی ہو اور یہاں تک نوبت آجاتی ہے کہ لوگ اپنا اپنا کام چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں اور آبادی گھٹنے لگتی ہے پھر اس کا وبال حکومت پر ہی پڑتا ہے کیونکہ کثرت آبادی سے حکومت ہی کو فائدہ تھا۔

مذکورہ بالا بیان سے آپ پر یہ بات روشن ہوگئی ہوگی کہ زمین کو آباد رکھنے کا سب سے بڑا سبب شرح محصولات کی کمی ہے، اسلئے زمین آباد کرنے والوں پر مقدور بھر کم سے کم محصول لگایا جائے تاکہ وہ آبادی میں خوشی خوشی جان توڑ کوشش کریں، کیونکہ اس صورت میں انہیں یقینی نفع کی امید ہوگی ۔۔۔۔یاد رکھیے! شروع شروع میں حکومت اپنی دیہاتی سادگی میں ہوتی ہے اور فرمانروایانِ ملک کے اخراجات کم ہوتے ہیں کیونکہ وہ عیش وعشرت کے اور مسرفانہ عادتوں سے دور ہوتے ہیں، ان حالات میں محصول کی آمدنی ان کے مصارف سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ ۔۔۔۔اس کے برعکس جب حکومت بتدریج تمدن اور شہرت اختیار کرتی ہے اور سابق حکومتوں کے طریقوں پر چلنے لگتی ہے تو نہ صرف بادشاہ کے بلکہ حکام کے اخراجات بھی بڑھ جاتے ہیں اور موجودہ محصول اخراجات کے لئے کافی نہیں بلکہ بادشاہ کے تو اپنے ذاتی اور عطیات کے مصارف بہت ہی بڑھ جاتے ہیں اور موجودہ محصول اخراجات کے لئے کافی نہیں ہوتے، اس لئے بادشاہ کو شرح محصول بڑھانی پڑتی ہے ۔ تاکہ فوجی مصارف بھی پورے ہوں اور خود سلطان کے ذاتی مصارف بھی، یہ اضافہ

شرح محصول کا پہلا درجہ ہے پھر شاہی اور فوجی مصارف مزید بڑھ جاتے ہیں کیونکہ عیش پرستی بتدریج بڑھتی جاتی ہے اور اسی نسبت سے فوجی مصارف میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور شرح محصول میں مزید اضافہ کرنا پڑتا ہے، حتی کہ حکومت اپنے آخری سانس لینے لگتی ہے اور جماعت اتنی کمزور ہوجاتی ہے کہ وہ ملک کے گوشوں سے محصول وصول کرنے سے قاصر ہوتی ہے، اس لئے محصول کم ہوکر آمدنی گھٹ جاتی ہے اور تمدن کے بڑھ جانے کی وجہ سے ملکی مصارف بڑھ جاتے ہیں جس کی وجہ سے فوجی اخراجات میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے، آخر کا فرماں روا طرح طرح کے ٹیکس لگا نے پر مجبور ہوتا ہے، چنانچہ فروخت کئے جانے والے تجارتی مال پر ٹیکس لگادیا جاتا ہے۔اور بازاروں میں فروخت کی جانے والی چیزوں کے منافع پر اور شہروں میں خاص خاص چیزوں کی آمدنیوں پر ٹیکس وصول کیا جاتا ہے، پھر بھی بادشاہ مزید ٹیکسوں کا محتاج رہتا ہے کیونکہ لوگ عیش پرستی کی وجہ سے اپنے اخراجات بڑھا لیتے ہیں۔ اور فوج میں بھی اضافہ ہوتا ہے جس سے مزید خرچہ بڑھتا ہے، پھر اسے ٹیکسوں ہی سے پورا کیا جاتا ہے۔ حکومت کے آخری دور میں تو ٹیکسوں کی زیادتی بہت ہی بڑھ جاتی ہے، منافع کی توقع نہ ہونے کی وجہ سے لوگ کاروبار چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں بازار ویران ہوجاتے ہیں جس سے ملک کی آبادی خلل پذیر ہونے لگتی ہے اور اس کا خمیازہ حکومت ہی کو بھگتنا پڑتا ہے، ٹیکس بڑھتے بڑھتے حکومت کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے، چنانچہ مشرق میں عباسیوں اور عبیدیوں کی حکومتوں کے آخری دور میں یہی حالات پیش آئے اور تمام رعایا پر ٹیکس لگادیئے گئے، حتیٰ کہ حج کے زمانے میں حاجیوں پر بھی، آخر کار صلاح الدین ایوبیؒ نے یہ تمام رسمیں قطعی طور پر مٹا دیں اور

ان کی جگہ مفید اور رفاہِ عامہ کی اسکیمیں رکھ دیں،طوائف الملوکی کے زمانے میں یہی حال اندلس میں تھا۔حتی کہ یوسف بن تاشفین امیر مرابطین نے رسم ٹیکس مٹائی اس زمانے میں افریقہ میں تونس وسطی میں یہی حال ہے۔

ٹیکس کا حساب کتاب لکھنے سے سخت اجتناب

سلفِ صالحین ٹیکس کا حساب کتاب لکھنے سے بھی سخت اجتناب کرتے تھے اوراسے ظلم وزیادتی کا تعاون سمجھتے تھے۔

فی احکام القرآن للتھانویؒ(۷۴/۳) فی بحث" الاستبانة لمعنی التسبب والاعانة"عن روح المعانی،اخرج عبد بن حمیدوابن المنذر وابن ابی حاتم عن عبدالله الولید الصافی:انه سأ ل عطاء بن ابی رباح عن اخ له کاتب فقاله:ان اخی لیس له من امورالسلطان شئی الاانه یکتب له بقلمه مایدخل ویخرج فان ترک قلمه صارعلیه دین واحتاج وان اخذبه کان له فیه غنی قال: لمن یکتب؟ قال:لخالدبن عبد الله القسری قال:الم تسمع الی ماقال العبد الصالح:رب بماانعمت علی فلن اکون ظهیر اللمجرمین؟فلا یهتم اخوک بشئی ولیرم بقلمه فان الله تعالیٰ سیأ تیه برزق اه.

واخرج ابن الی حاتم عن ابی حنظلة جابر بن حنظلة الضبی الکاتب قال: قال رجل لعافر:یااباعمرو انی رجل کاتب اکتب مایدخل ومایخرج،اخذرزقااستغنی به انا وعیالی قال: فعلک تکتب فی دم یسفک قال:لا قال:فلعلک تکتب فی مال یؤخذ؟قال لا،قال:لعلک

تكتب فى دار تهدم؟قال لا،قال اسمعت ماقال موسى عليه السلام"رب بما انعمت على فلن اكون ظهيرا للمجرمين" قال لقد ابلغت الى ياابا عمرو،والله عزوجل لا اخط لهم بقلم ابدا قال والله لا يدعك الله تعالىٰ سبحانه بغيررزق ابداوقد كان السلف يجتنبون كل الاجتناب عن خدمة الظلمةالخ.

ظالمانہ ٹیکس کے خلاف علماء سلف کی کاوشیں

اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ کسی بادشاہ اور حکمران نے مسلمانوں پر ظالمانہ ٹیکس لگانے کی کوشش کی تو علماء وقت نے اس کی بھرپور مخالفت کی اور سختی کے ساتھ حکمرانوں کو اس اقدام سے باز رہنے کی تاکید کی۔

(۱) شاہ مصر قطر نے ملک ناصر کے ایماء پر تاتاریوں سے جنگ کیلئے لشکر تیار کرنا چاہا تو اس نے مشورہ کیلئے قاضیوں اور وقت کے علماء وفقہاء کو جمع کیا جن میں شیخ عزالدین بن عبدالسلامؒ اور قاضی بدرا لدین بخاریؒ بھی تھے، شیخ عزالدین بن عبدالسلامؒ نے اس موقعہ پر کہا کہ دارالاسلام پر دشمن حملہ آور ہو تو بلا شبہ اسلامی حکومت پر جہاد فرض ہے اور اگر بیت المال خالی ہو اور بادشاہوں کے پاس عطیات اور صلہ خدمات کے طور پر دی جانے والی تھیلیاں بھی نہ ہوں تو رعایا سے جہاد کے اخراجات ومصارف لینا درست ہے لیکن بیت المال میں مال موجود ہونے اور آلات فاخرہ موجود ہونے کی صورت میں لوگوں سے مال لینا اوران پر کچھ مقرر کرنا درست نہیں ہے۔ **الطبقات الشافعية،النجوم الزاهرة(۷۲/۷، ۷۳)والسلوک لمعرفة دول الملوک (۴۱۶/۱، ۴۱۷). فقه الزكوة (۶۷۷/۲)**

اس حق گوئی کی وجہ سے عزالدین بن عبدالسلامؒ کے مقام ومرتبہ میں اضافہ ہوااور بادشاہ وقت بعد میں ان کا بڑا معتقد ہوا۔

حافظ ابن کثیرؒ البدایة والنہایة(۲۷۵/۷)میں لکھتے ہیں:

وحضر جنازته السلطان الظاهر وخلق كثير رحمه الله عليه .

(۲)جب ملک شام کے بادشاہ بیبرس نے تاتاریوں سے مقابلہ کرنے کاارادہ کیاتو بیت المال میں ان وسیع اخراجات کی گنجائش نہ تھی،اس لئے اس نے ملک شام کے علماء وفقہاء سے عوام الناس پر ٹیکس لگانے کے بارے فتوی طلب کیا،علماء نے ضرورت اور مصلحت عامہ کے تحت ٹیکس لگانے کی اجازت دیدی،اس موقعہ پر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ موجود نہیں تھے،بادشاہ نے ان کو بلایااور کہا کہ اس فتوی پر آپ بھی دستخط کردیں،امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے انکار کیا توبادشاہ نے اس کا سبب دریافت کیا،اس کے جواب میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم ایک بندوق دار تھے اور تمہارے پاس کچھ بھی نہیں تھا پھر خدا تعالیٰ نے تمہیں بادشاہ بنایا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ تمہارے ایک ہزار غلام ہیں اور ہر غلام کے پاس سونے کی تھیلی ہے اور تمہارے پاس دوسو باندیاں ہیں اور ہر باندی کے پاس زیورات کی پوٹلیاں ہیں،پہلے یہ سارامال جہاد اوراس کی تیاریوں میں خرچ کروحتی کہ تمہارے خدم وحشم عام لوگوں کی طرح صوف پوش(روئی کے کپڑے پہننے والے)ہوجائیں،جب تم سارامال جہادکی تیاریوں میں صرف کرلوگے تب میں فتوی دوں گا کہ تمہارے لئے لوگوں سے ٹیکس لیناجائزہے،یہ سن کر بیبرس امام نووی رحمۃ اللہ علیہ سے ناراض ہوگیااور آپ کو دمشق سے نکال دیا،چنانچہ آپ نوی چلے گئے،اس کے بعد بیبرس

نے آپ کو دمشق آنے کی اجازت دیدی لیکن آپ نے جواب میں فرمایا کہ نہیں جب تک ظاہر بیبرس دمشق میں موجود ہے میں وہاں نہیں جاؤں گا، ظاہر بیبرس اس کے بعد ایک ماہ زندہ رہا پھر فوت ہوگیا۔

(۳)امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے سلطان بیبرس کو یہ خط بھی لکھا کہ جب تک بیت المال میں سرمایہ موجود ہے اورحکومت کے پاس زمین موجود ہے تو رعایا سے ٹیکس لینا جائز نہیں ہے اوراس وقت بیت المال میں سرمایہ موجود ہے، خدا برکت دے اور شادو آباد رکھے۔

فقه الزكوة(٢/٧٧٦) عن"الاسلام المفترى عليه"ص ٢٢٢، ٢٢٣للاستاذالامام الغزالی رحمة الله علیه والسخاوی ترجمةالامام النووی رحمة الله علیه .

(۴)مشہور حنفی فقیہ شمس الائمہ سرخی رحمۃ اللہ علیہ ایک ظالم حکمران کے زمانے میں اوزجند کے قلعہ ''جب'' (اندھے کنویں) میں قید رہے اور سالہا سال محبوس رہے، اس دوران وہ طلبہ کو پڑھاتے بھی رہے، جس کی صورت یہ تھی کہ طلبہ کنویں کے باہر بیٹھ جاتے اور آپ انہیں پڑھاتے اور املاء کرواتے۔ مشہور یہ ہے کہ شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے ''المبسوط'' کے کچھ اجزاء املا کروائے لیکن ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے المبسوط کے علاوہ بھی بہت سی کتابوں کی املاء کروائی اوراس جیل میں کچھ کتابوں کا آغاز کیا اور رہائی کے بعد ان کی تکمیل کی، تقریباً کوئی دس ہزار صفحات شاگردوں کو املاء کروائے۔

امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کو کس جرم میں گرفتار کیا گیا؟ اس بارے میں ادیب

شہیر عالم کبیر حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہ ہے کہ حاکم وقت نے ظالمانہ ٹیکس لگایا تو امام سرخسیؒ نے اسے ناجائز اور ظلم قرار دیا، جس کے پاداش میں آپ کو قید کیا گیا، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں صلیبی جنگوں کے باعث عالم اسلام میں بحران تھا، ہر روز نئے ٹیکس لگ رہے تھے اور بے پناہ مظالم ہورہے تھے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بدانتظامی اور مالی ابتری کے باعث بے شمار ٹیکس لگ رہے تھے، امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے عدم جواز کا فتوی دیا اور کہا کہ ان کی ادائیگی شرعاً لازم نہیں ہے۔

تدوین فقہ واصول فقہ (ص ۱۲۷) الصدف پبلشرز کراچی میں لکھتے ہیں:

بظاہر یہ جھگڑا ارباب حکومت اور شمس الائمہ نور اللہ مرقدہ سے اس مشہور مسئلہ میں ہوا جس کا ذکر خصوصیت کے ساتھ فقہاء اپنی کتابوں میں شمس الائمہ ہی کے حوالہ سے کرتے ہیں، میری مراد مسئلہ النوائب سے ہے یعنی حکومت کی جانب سے بلاوجہ رعایا پر بھاری ٹیکس اس زمانے میں عائد ہونے لگے، جب خلافتِ بغداد کا پنجہ ڈھیلا ہوگیا تھا اور عام اسلامی ممالک خصوصاً خراسان، ماوراء النہر، ایران وغیرہ پر ترکمانی اور ترکی نومسلم جاہل سرداروں کا قبضہ ہوگیا تھا اور وہ اپنے پرانے جاہلی دستور کے مطابق مختلف ناموں سے رعایا پر محصول عائد کرتے تھے۔۔۔فتح القدیر (۴۳۳/۵)

وان ارادالاعطاء فليعط من هواعجز عن رفع الظلم عن نفسه اولفقير يستعين به الفقر على الظلم وينا ل المعطى الثواب.

امام سرخسیؒ کا فتوی یہ ہے کہ ٹیکس نہ دے (اور اگر کوئی شخص دینا ہی چاہتا ہے تو وہ ایسے شخص کو دے جو ظلم دفع کرنے سے عاجز ہے اور مستحق امداد ہے

یا ایسے فقیر کو دے جو ظلم کے مقابلہ میں اس سے مدد لے سکے اور معطی کو ثواب ملے گا۔

امام سرخسیؒ کا مذکورہ فتوی نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

جس کا کھلا مطلب یہ ہوا کہ شمس الائمہ صرف حکومت کے ان ظالمانہ محصولوں کو ظلم ہی نہیں قرار دیتے تھے بلکہ مسلمانوں کو آمادہ کرتے تھے کہ خود بھی اس محصول کو ادا نہ کریں اور جو بیچارے اتنی قوت نہ رکھتے ہوں کہ ظلم کا مقابلہ کر سکتے ہوں تو ارباب ثروت کو چاہیے کہ اپنی قوت سے ان کی امداد کریں تا کہ وہ ان ظالموں کا مقابلہ کر سکیں، جس کا خلاصہ یہی ہوا کہ وہ حکومت کے اس محصول کے مقابلہ میں تمام مسلمانوں کو ایک نقطہ پر مجتمع کر کے چاہتے تھے کہ اس ظلم کا ازالہ کیا جائے، اس مقابلہ کیلئے چندہ جمع کرنے اور اس سرمایہ میں شریک ہونے والوں کے لئے ان کا فتوی تھا کہ اخروی ثواب کے وہ مستحق ہوں گے۔

مکس کیا ہے؟

گزشتہ نصوص اور آثار میں مکس، اس کے تقرر اور اس کے وصول کرنے کی شدید مذمت کی گئی ہے اور اس بارے سخت قسم کی وعیدیں بیان ہوئی ہیں، اس مکس سے مراد زمانہ جاہلیت کا ظالمانہ ٹیکس ہے جو غریب و نادار لوگوں سے بلا وجہ لیا جاتا تھا اور اس کی مختلف صورتیں رائج تھیں، اسلام نے ان سب کو ختم کر دیا ہے۔

علامہ ابن منظور لسان العرب (۲۲۰/۶) میں لکھتے ہیں۔

دراهم كانت تؤخذ من بائع السلع في الاسواق في الجاهلية .

یہ وہ دراہم تھے جو زمانہ جاہلیت میں بازاروں میں سامان فروخت کرنے والوں سے وصول کئے جاتے تھے۔

فی تکملة فتح الملهم(۴۵٦/۲)"المکس"بفتح المیم والمکس دراهم کانت تؤخذ من بائع السلع فی الجاهلیة والفاعل:الماکس،کذا فی جمهرة اللغة لا بن درید(۳/ ۴٦) وقال ابن الاعرابی:المکس دراهم کان یأخذ ها المصدق بعد فراغه کمافی لسان العرب لا بن منظور(۸/ ۱۰۵) واصل المکس،النقص.فکان الماکس اذا اخذ درهما انتقص من ثمن السلعة.

وفی التعلیق علی کتاب الاموال(ص ۵۲۴)الجزء الرابع، المکس مایاخذه اعوان الدولة من اشیاء معینة عند بیعها اوعندادخالها المدن وجمعه مکوس والماکس والمکاس من یا خذ المکس ویقال له ایضاً صاحب المکس.

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ صاحب مکس سے مراد وہ شخص ہے جو تاجروں سے عشر کے نام پر چونگی وصول کرے۔الترغیب والترھیب(۱/ ۵٦۷)

امام ابن الاثیررحمۃ اللہ علیہ النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر (۴/ ۱۱۰) میں لکھتے ہیں:

مکس وہ ٹیکس ہے جو عشار لیتا ہے۔

علامہ مناوی رحمۃ اللہ علیہ فیض القدیر (٦/ ۴۴۹) میں لکھتے ہیں:

صاحب مکس سے مراد عشار ہے جو لوگوں سے ٹیکس وصول کرے نیز طیبی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ ہلاک کرنے والے امور میں سے ہے اور علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے۔

الفرق بين صاحب المكس والساعى والمحتسب

قال الطيبى فى شرح المشكوة المسمّى بالكاشف عن حقائق السنن (۷/۲۷۸) قوله "صاحب مكس،،المكس الضريبة التى ياخذ ها الماكس وهوالعشار"حس،،ارادبصاحب المكس الذى يأخذمن التجاراذامرواامكسا باسم العشرواماالساعى الذى ياخذالصدقة ومن ياخذ من اهل الذمة العشر الذى صولحواعليه فهومحتسب مالم يتعد فيأثم بالتعدى والظلم .

مسلمان پر شرعاً ٹیکس نہیں ہے۔

شریعت نے مسلمانوں پرٹیکس کے بجائے زکوۃ،عشراور صدقۃ الفطر جیسی مالی عبادات واجب کی ہیں،مسلمانوں پر کسی قسم کا ٹیکس لاگونہیں کیا،نہ ظالمانہ اورنہ عادلانہ،پچھلی بحث میں تفصیل سے آچکا کہ شریعت مقدسہ نے ظالمانہ ٹیکس کفار اور اہل ذمہ پر بھی لاگونہیں کیا اور زمانہ جاہلیت میں جو ظالمانہ ٹیکس رائج تھا اسے ختم کر دیا،جب اللہ کے باغیوں یعنی کفار اور اہلِ ذمہ پرظالمانہ ٹیکس نہیں تو مسلمانوں پر کیسے لگایا جاسکتا ہے؟شرح معانی الآثار(۲۶۳/۱)

آئندہ سطور میں ہم یہ ثابت کریں گے کہ شریعت نے مسلمانوں پر عادلانہ ٹیکس بھی لاگونہیں کیا۔

(۱)فى المشكوة (۱۳،۱۲/۱)عن طلحة بن عبيد الله قال جاء

رجل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من اهل نجد ثائرالرأس نسمع دوی صوته ولانفقه ما يقول حتی دنا من رسول الله صلی الله عليه وآله وسلم فاذا هو يسأل عن الاسلام فقال رسول الله صلی الله عليه وآله وسلم خمس صلوات فی اليوم والليلة فقال هل علی غير هن قال لا الاان تطوع قال وذكرله رسول الله صلی الله عليه وآله وسلم الزكوة فقال هل علی غيرها فقال لا الا ان تطوع قال رسول الله صلی الله عليه وآله وسلم صيام شهر رمضان فقال هل علی غيره قال لا الا ان تطوع قال فادبرالرجل وهو يقول والله لا ازيدعلی هذاولاانقص منه فقال رسول الله صلی الله عليه وآله وسلم افلح الرجل ان صدق. متفق عليه .

یہ صحیحین کی حدیث ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص نے نبی علیہ السلام سے فرائض اسلام کے بارے پوچھا تو نبی علیہ السلام نے اس موقعہ پر تین فرائض کا ذکر فرمایا(۱) دن رات میں پانچ نمازیں، اس شخص نے پوچھا کہ کیا فرائض خمسہ کے علاوہ بھی کوئی نماز مجھ پر فرض ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا نہیں البتہ نفل پڑھ سکتے ہو (۲) رمضان کے روزے، اس نے پوچھا کہ ان کے علاوہ کوئی روزہ بھی مجھ پر فرض ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ فرض نہیں البتہ نفل روزے رکھ سکتے ہو (۳) زکوۃ، اس نے پوچھا کہ زکوۃ کے علاوہ بھی کوئی مالی عبادت یا ٹیکس مجھ پر فرض ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں البتہ نفلی صدقہ کر سکتے ہو، پھر وہ شخص یہ کہتے ہوئے چل پڑا کہ میں یہ فرائض بغیر کسی کوتاہی کے بجا لاؤں گا اور ان کے علاوہ کچھ ادا نہ کروں گا، نبی علیہ السلام نے فرمایا

کہ اگر اس نے سچ بولا تو یہ کامیاب ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمان کے ذمہ صرف زکوۃ فرض ہے،اس کے علاوہ کوئی ٹیکس وغیرہ واجب نہیں ہے،جیسا کہ فرائض خمسہ اور رمضان کے روزے واجب ہیں،ان کے علاوہ کوئی نماز اورر وزہ واجب نہیں ہے نیز اس شخص نے کہا تھا کہ کہ میں زکوۃ کے علاوہ کچھ بھی نہ دوں گا،اس کے باوجود نبی علیہ السلام نے اس کے بارے میں فرمایا کہ یہ کامیاب ہے۔

(۲) وفیھاایضاً(۱/۱۲) عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال اتی اعرابی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقال دلنی علی عمل اذا عملتہ دخلت الجنۃ قال تعبد اللہ ولا تشرک بہ شیئا وتقیم الصلوۃ المکتوبۃ وتؤدی الزکوۃ المفروضۃ وتصوم رمضان قال والذی نفسی بیدہ لا ازید علی ھذ اشیئا ولا انقص منہ فلما ولی قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: من سرہ ان ینظر الی رجل من اھل الجنۃ فلینظر الی ھذا متفق علیہ.

اس حدیث کا مفہوم پچھلی حدیث کے قریب ہے،یہاں اعرابی نے کہا کہ میں نماز روزہ اور زکوۃ پر اضافہ نہیں کروں گا اور چلا گیا،نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ جو اہل جنت میں سے ایک شخص کو دیکھنا چاہے تو اس شخص کو دیکھے۔

(۳) فی مجمع البحرین فی زوائد المعجمین (۲/۱۸)باب الجزیۃ،دارالکتب العلمیۃ،بیروت. عن ابن عمرؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال:من اسلم فلا جزیۃ علیہ.لم یروہ عن محارب الاعمر ولا

عنه الایحیی تفردبه عیسی.

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مسلمان ہوجائے تو اس پر کسی قسم کا جزیہ (ٹیکس) نہیں ہے۔

نیز ملاحظہ ہو:نصب الرّیة(۴۵۳/۳) للزیلعی المکتبة الاسلامیة اورکنزالعمال(۹۴/۱)رقم الحدیث ۴۳۱،اداره تالیفات اشرفیه ملتان

ابوداؤد(۸۲/۲) کتاب الخراج میں ابن عباسؓ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:لیس علی المسلم جزیة.

(۴) فی سنن ابی داؤد(۸۱/۲) کتاب الخراج.باب فی تعشیر اهل الذمة اذااختلفوا بالتجارة،عن حرب بن عبیدالله عن جده ابی امامة عن ابیه قال قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم:انماالعشورعلی الیهود والنصاری ولیس علی المسلمین عشور وفی روایة الخراج مکان العشور.

حرب بن عبیداللہؒ اپنے نانا سے وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ٹیکس تو یہود و نصاریٰ پر ہے اور مسلمانوں پر کوئی ٹیکس نہیں ہے اور ایک روایت میں العشور کی جگہ الخراج کا لفظ آیا ہے،تاہم دونوں کا معنی ومفہوم ایک ہے۔

وکذافی مشکوة المصابیح(۳۵۳/۲).....باب الجزیة وجامع الترمذی(۲۵۶/۱) ابواب الزکوة.

(۵)فی جامع الترمذی(۲۵۵/۱).......باب ماجاء لیس علی

المسلمین جزیة،عن ابن عباس رضی الله تعالیٰ عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم: لایصلح قبلتان فی ارض واحدة ولیس علی المسلمین جزیة .

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ ایک زمین میں دو قبلے جائز نہیں اور مسلمانوں پر کوئی جزیہ نہیں ہے۔

(۶)فی مسنداحمد بن حنبل(۱/۲۰۳)....رقم الحدیث۱۶۵۴ مسند سعید بن زیدؓ،دارالکتب العلمیة،بیروت،عن سعید بن زید قال: سمعت رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم یقول:"یامعشرالعرب احمد واالله الذی رفع عنکم العشور،،

اے مسلمانوں کے گروہ!اس اللہ کی حمد بیان کرو جس نے تم سے ٹیکس کو اٹھا دیا ہے۔

وکذافی مصنف ابن ابی شیبة (۱۹۷/۳)ادارة القرآن،ومجمع الزوائد(۱۸۷/۳)واحکام القرآن للجصاص(۱۵۶/۳)

(۷)فی جامع الترمذی(۱/۲۵۰) ابواب الزکوة،باب ماجاء اذا ادیت الزکوة فقد قضیت ماعلیک،عن ابی هریرة ان النبی ﷺ قال: اذاادیت زکوة مالک فقد قضیت ماعلیک .

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے نبی علیہ السلام نے ارشادفرمایا کہ جب تم اپنے مال کی زکوۃ ادا کردو تو تم نے اپنے ذمہ حق ادا کردیا۔

وکذافی سنن ابن ماجة(ص۱۲۸)کتاب الزکوة،باب مادی

زکوۃفلیس بکنز.

(۸) فی مصنف ابن ابی شیبة (۸۷/۳) باب من قال لیس علی المسلمین عشور،عن عثمان بن ابی العاصؓ ان وفد ثقیف قدمواعلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فاشترطوا علیه ان لا یحشروا ولا یعشروا ولا یستعمل غیرھم .

وفی احکام القرآن لابی بکرالجصاص رحمه اللہ (۱۵۵/۳)

روی حمیدعن الحسن عن عثمان بن ابی العاصؓ ان النبی ﷺقال لوفدثقیف:لاتحشرواولاتعشروا.

وفی مصنف ابن ابی شیبة(۵٦۰/٦)عن عثمان بن ابی العاصؓ :ان وفدثقیف قدمواعلی رسول اللہ ﷺ.........فاشترطواعلیه ان لایحشرواولایعشرواولایجبوا........فقال رسول اللہ ﷺلکم ان لاتحشرواولاتعشرواولایستعمل علیکم غیرکم.قال محمدعوامة:رواہ احمد(۲۱۸/۴).....................عن عفان ورواہ من طریق حماد:الطیالسی(۹۳۹)وابوداؤد(۳۰۲۰)والبیھقی(۴۴۴/۲و۴۴۵)

حضرت عثمان بن ابی العاصؓ سے روایت ہے نبی علیہ السلام نے ثقیف کے وفدکوارشادفرمایاکہ نہ کسی کوجلاوطن کرواورنہ کسی سے تجارتی ٹیکس لواورنہ کسی کوٹیکس دو۔

(۹)فی سنن ابن ماجة،کتاب الزکوة،باب ماادی زکوته فلیس بکنز،عن فاطمة بنت قیسؓ انھاسمعته تعنی النبی صلی اللہ علیه وآله

وسلم یقول: لیس فی المال حق سوی الزکوۃ .

فاطمہ بنت قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ (مسلمان کے) مال میں زکوۃ کے علاوہ کوئی حق نہیں ہے۔

واضح رہے کہ یہ حدیث جامع الترمذی (۱/ ۲۶۰) ابواب الزکوۃ باب ماجاء ان فی المال حقا سوی الزکوۃ میں ان الفاظ سے مروی ہے -

عن فاطمة بن قیسؓ قالت سألت او سال النبی صلی الله علیه وآله وسلم عن الزکوة فقال ان فی المال لحقا سوی الزکوة ثم تلا هذه الآیة التی فی البقرة لیس البران تولو ا وجوهکم الآیة .

اس حدیث کا مفہوم بالکل برعکس ہے یعنی مال میں زکوۃ کے علاوہ بھی حق ہے لیکن جواب یہ ہے کہ امام ترمذیؒ نے اس روایت کوضعیف کہاہے اور فرماتے ہیں کہ اصح یہ ہے کہ یہ امام شعبیؒ کا قول ہے۔

قال ابو عیسی هذاحدیث اسناده لیس بذک وابو حمزة میمون الاعوریضعف وروی بیان واسماعیل بن سالم عن الشعبی هذا الحدیث قوله وهذا اصح .

یعنی اس حدیث کی سند درست نہیں ہے، اس کی سند میں ابوحمزہ میمون الاعور ضعیف ہے، اصح یہ ہے کہ یہ شعبیؒ کا قول ہے۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ ،السنن الکبری(۴/ ۸۴) کتاب الزکوة ،باب الدلیل علی ان من ادی فرض الله فی الزکوة فلیس علیه اکثرمنه الا ان یتطوع سوی مامضی فی الباب قبله. میں فرماتے ہیں ۔

واماالحدیث الذی اخبرنامحمد بن عبدالله الحافظ ...فهذا حدیث یعرف بابی حمزه میمون الاعور کو فی وقد جرحه احمد بن حنبل ویحیی بن معین فمن بعد هممان حفا ظ الحدیث والذی یرویه اصحابنا فی التعالیق لیس فی المال حق سوی الزکوة فلست احفظ فیه اسنادا والذی رویت فی معناه ماقدمت ذکره .

حاصل اس کا یہ ہے کہ ان فی المال لحقا سوی الزکوۃوالی روایت کی سند محفوظ نہیں ہے،اس کی سند میں ابوحمزہ میمون الاعور کوفی موجود ہیں جن کو امام احمد بن حنبل، یحیی بن معین اور بعد کے حفاظ حدیث نے مجروح قرار دیا ہے، صحیح روایت ولیس فی المال حق سوی الزکوۃ ہے۔

تحفۃ الاحوذی (۲۲/۲) میں میزان الاعتدال (۲۳۴/۴) سے نقل کیا ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے ابوحمزہ میمون کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ متروک الحدیث ہے،امام دارقطنیؒ نے کہا ہے کہ وہ ضعیف ہے،امام بخاریؒ کا کہنا ہے کہ وہ ائمہ حدیث کے نزدیک مضبوط نہیں اورامام نسائیؒ کا قول ہے کہ وہ ثقہ نہیں۔

ابن حجرؒ عسقلانی تقریب التهذیب (۲۳۵/۲) میں لکھتے ہیں۔

میمون ابوحمزه الاعور القصاب،مشهوربکنیته،ضعیف من السادسة.

یہ تفصیل ہم نے اس لئے لکھ دی کہ مذکورہ تحقیق کے برعکس ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے فقہ الزکوۃ (۵۵۷/۲) میں "لیس فی المال حق سوی الزکوة"والی روایت کے بارے لکھا ہے کہ یہ حدیث بہت ضعیف ہے اور بلا شبہ مردود ہے بلکہ خطا

اورتحریف ہے۔

اوراگر بالفرض ''لیس فی المال حق سوی الزکوۃ'' والی روایت کو ضعیف اورفی المال حق سوی الزکوۃ کوصحیح مان لیاجائے جیسا کہ امام جصاصؒ نے احکام القرآن(۱۳۰/۱) میں لکھاہے تواس سے ٹیکس کاجواز ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس سے دوسرے حقوق جیسے صدقہ فطر،نفقات وغیرہ کاحکم ثابت ہوگا جیسا کہ امام جصاصؒ نے اورعلامہ قرضاوی صاحب نے اس بارے فقہ الزکوۃ میں مستقل باب باندھ کر تفصیل فرمائی ہے۔

(۱۰)فی سنن ابی داؤد(۸۱/۲)کتاب الخراج،باب فی تعشیراهل الذمة اذااختلفوابالتجارة عن حرب بن عبيد الله بن عمير الثقفی عن جده رجل من من بنی تغلب قال:اتيت النبی صلی الله عليه وآله وسلم فا سلمت وعلمنی الاسلام وعلمنی كيف اخذ الصدقة من قومی ممن اسلم ثم رجعت اليه فقلت يارسول الله صلی الله عليه وآله وسلم كلما علمتنی قدحفظت الاالصدقة افاعشرهم قال:لاانما العشور علی النصاری واليهود.

بنوتغلب سے تعلق رکھنے والے ایک صحابیؓ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیااور اسلام قبول کیا اورآپ نے مجھے اسلام کی تعلیم دی اور مجھے میری قوم میں سے مسلمان ہونے والوں سے صدقہ لینے کا طریقہ بتایا پھرمیں دوبارہ گیااور کہا اے اللہ کے رسول آپ نے مجھے اسلام کے بارے جو تعلیمات دیں وہ مجھے یاد ہوگئیں،البتہ صدقہ کے بارے شبہ ہے کہ کیا میں مسلمانوں

سے تجارتی ٹیکس لیا کروں ؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں ،تجارتی ٹیکس صرف یہود ونصاری پر ہے۔

(۱۱)وفیه ایضا.عن عطاء عن رجل من بکر بن وائل عن خاله قال قلت :یارسول الله صلی الله علیه وآله وسلم اعشر قومی قال انما العشور علی الیهود والنصاری.

ایک صحابیؓ نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا میں اپنی قوم سے تجارتی ٹیکس لیا کروں؟ آپ نے فرمایا کہ تجارتی ٹیکس صرف یہود ونصاری پر لازم ہے۔

(۱۲) فی احکام القرآن للجصاص(۱/۱۳۲)باب هل فی المال حق واجب سوی الزکوة؟عن مسروق عن علیؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم نسخت الزکوة کل صدقة.

عن مسروق عن علی قال نسخت الزکوة کل صدقة.

یعنی زکوۃ نے ہر قسم کے صدقہ کو منسوخ کردیا ہے۔

یہ حدیث مرفوع بھی مروی ہے اور موقوف بھی،اور موقوف بھی مرفوع کے حکم میں ہے کیونکہ یہ مسئلہ غیر مدرک بالقیاس ہے۔

قال الجصاص :فان صح هذا الحدیث عن النبی صلی الله علیه وآله وسلم..... فسائر الصدقات الواجبة منسوخة بالزکوة وان لم یصح ذلک مرفوعاالی النبی صلی الله علیه وآله وسلم لجهالة راویه فان حدیث علی علیه السلام حسن السند وهو یوجب ایضا نسخ الصدقات

التی کانت واجبة بالزکوة وذلک لا یعلم الا من طریق التوقیف فیعلم بذلک ان ما قاله علی هو بتوقیف من النبی صلی الله علیه وآله وسلم اياه علیه .....فیکون المنسوخ بالزکوة مثل هذه الحقوق الواجبة فی المال من غیر ضرورة الخ.

صحابہ کرامؓ کے اقوال اور فتاوی

(۱)فی احکام القرآن للجصاص(۱۵۶/۳) روی ان مسلم بن یسار قال لا بن عمرؓ اکان عمرؓ یعشر المسلمین قال: لا.

وفی الطحاوی(۲۶۳/۱) عن مسلم بن یسار قال: قلت لابن عمر اکان عمر یعشر المسلمین قال لا.

مسلم بن یسارؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا کہ کیا حضرت عمرؓ مسلمانوں سے تجارتی ٹیکس لیا کرتے تھے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔

وکذا فی کتاب الاموال لابی عبید ایضاً(۵۲۶)ثم قال الجصاص رحمة الله علیه: لیس المراد بذکر هذه العشور الزکوة وانما هو ماکان یأخذ اهل الجاهلیة من المکس ......فالذی نفاه النبی صلی الله علیه وآله وسلم من العشر هوالمکس الذی کان یأخذه اهل الجاهلیة.

امام ابوبکر جصاص رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں عشر سے زکوۃ مراد نہیں، زمانہ جاہلیت کا ٹیکس مراد ہے۔۔۔جن روایات میں نبی علیہ السلام نے عشر کی نفی کی ہے ان میں بھی عشر سے وہ ٹیکس مراد ہے جو اہل جاہلیت وصول کیا کرتے تھے۔

(۲)فی مصنف ابن ابی شیبة(۸۷/۳) کتاب الزکوة،باب من قال لیس علی المسلمین عشور،عن زیاد بن حدیرؒقال بعثنی عمرؓعلی العشور ونهانی ان اعشر مسلما او ذاذمة یؤدی الخراج (یهود ی اونصرانی).

زیادبن حدیرؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے مجھے تجارتی ٹیکس وصول کرنے کیلئے بھیجا اور مجھے مسلمان یا خراج ادا کرنے والے یہود اور نصرانی ذمی سے تجارتی ٹیکس وصول کرنے سے منع کردیا۔

(۳)فی مصنف عبدا لرزاق(۱۳۹/۴)....باب العشور،اخبرنی مسلم بن سکرة انه سأل ابن عمرؓ:اعلمت عمرؓ اخذمن المسلمین العشور ؟فقال:لم اعلمه،لم اعلمه.

مسلم بن سکرہؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا کہ کیا آپ کو اس بارے علم ہے کہ حضرت عمرؓ مسلمانوں سے تجارتی ٹیکس وصول کرتے تھے؟تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں، مجھے معلوم نہیں۔

(۴)فی مصنف ابن ابی شیبة(۸۱/۳) کتاب الزکوة والمحلی لا بن حزم (۱۵۹/۳) عن ابن عباسؓ قال:من ادی زکوة ماله فلیس علیه جناح ان لا یتصدق.

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جس نے اپنے مال کی زکوۃ ادا کردی تواگر وہ مزید صدقہ نہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

(۵)فی احکام القرآن للجصاص(۱۳۲/۱)عن مسروق عن علیؓ قال:نسخت الزکوة کل صدقة.

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ زکوۃ نے ہر مالی صدقہ کو منسوخ کر دیا ہے۔

علماء امت کے اقوال وفرمودات

علماء امت کا بھی اس پر اتفاق ہے کہ شریعت نے مسلمانوں پر کسی قسم کا ٹیکس لاگو نہیں کیا، مسلمانوں کے ذمہ صرف زکوۃ اور عشر ہے، قبل از اسلام جو ٹیکس رائج تھے زکوۃ نے ان سب کو منسوخ کر کے مسلمانوں کے حق میں ان کی جگہ لے لی۔

(۱) عمر بن عبدالعزیزؒ کا عمل

فی احکام القرآن للجصاص(۳/ ۱۰۱)عن حمید قال: کتب عمربن عبدالعزیزؒ من شهد شهادتنا واستقبل قبلتنا واختتن فلاتأخذ منه الجزية.

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے گورنروں کو خط لکھا کہ جو شخص ہماری طرح خدا کی وحدانیت کی گواہی دے او رہمارے قبلہ کا استقبال کرے اور ختنہ کرے تو اس سے جزیہ (ٹیکس) نہ لو۔

(۲)وفيه ايضا(۳/ ۱۰۲)ولی عمر بن عبدالعزيزؒ فكتب الى عامله بالعراق عبدالحميد بن عبدالرحمن امابعدفان الله بعث محمدا صلى الله عليه وآله وسلم داعيا ولم يبعثه جابيا فاذا اتاک کتابی هذا فادفع الجزية عمن اسلم من اهل الذمة.

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے عراق کے گورنر عبدالحمید بن عبدالرحمٰن

کولکھا کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو داعی بنا کر بھیجا ہے، جابی یعنی ٹیکس وصول کرنے والا بنا کرنہیں بھیجا، پس جب تمہیں میرا یہ خط پہنچے تو جو اہل ذمہ مسلمان ہو چکے ہیں ان سے ٹیکس ختم کردو۔

(۳) ٹیکس زوال مملکت کا سبب

فیه ایضا(۱۰۲/۳) وقد کان آل مروان یأخذون الجزیة ممن اسلم من اهل الذمة ویذهبون الی ان الجزیة بمنزلة ضریبة العبد فلا یسقط اسلام العبد ضریبته وهذا خلل فی جنب ماارتکبوه من المسلمین ونقص الا سلام عروة عروة الی ان ولی عمر بن عبد العزیز.......فلما ولی هشام بن عبدالملک اعادها علی المسلمین وکان احداالاسباب التی لهااستجازالقراء والفقهاء قتال عبدالملک بن مروان والحجاج لعنهما الله اخذهم الجزیة من المسلمین ثم صار ذلک ایضا احد اسباب زوال دولتهم وسلب نعمتهم واماقولهم ان الجزیة بمنزلة ضریبة العبد فلیس ببدع،هذا من جهلهم اذقدجهلوامن امورالاسلام ماهواعظم منه وذلک لان اهل الذمة لیسواعبیداولوکانوا عبیدالمازال عنهم الرق باسلا مهم لان باسلام العبد لایزال رقه وانما الجزیة عقوبة عوقبوا بها لا قامتهم علی الکفر فمتی اسلموا لم یجزان ان یعاقبوا باخذها منهم .

امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ نقل کرتے ہیں کہ آل مروان مسلمانوں سے جزیہ لیا کرتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اسے ختم کرایا، ان کے بعد ہشام بن عبدالملک نے دوبارہ عائد کردیا، اس کی وجہ سے قراء وفقہاء نے عبدالملک بن

مروان اور حجاج کے خلاف قتال کی اجازت دی او رٹیکس کا ظلم بالآخر ان کی سلطنت کے زوال کا سبب بنا۔

کتاب الاموال لابی عبید (ص۷۰۴) میں ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے کسی والی کو لکھا کہ ٹیکس ختم کردیا جائے اور رفح جگہ میں قائم بیت المکس (ٹیکس آفس) کو منہدم کردیا جائے۔

(۴) نبی علیہ السلام کے بعد بڑا جرم

فی احکام القرآن(۳/۱۰۲) عن یزید بن ابی حبیبؒ قال:اعظم ماأتت هذه الامة بعد نبیها ثلاث خصال قتلهم عثمانؓ واحرا قهم الکعبة واخذهم الجزیة من المسلمین .

یزید بن ابی حبیبؒ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام کے انتقال کے بعد اس وقت تک اس امت میں ان تین جرائم سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں ہوا (۱) قتل عثمان (۲) بیت اللہ کا جلانا (۳) مسلمانوں سے ٹیکس لینا۔

(۵) زکوۃ نے ہر حق منسوخ کردیا

(۱) امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: روی ان الزکوة نسخت کل حق کان واجبا یعنی زکوۃ نے ہر اس حق کو منسوخ کردیا جو پہلے واجب تھا۔ احکام القرآن (۳/۱۵۳)

(۲) محلی ابن حزم (۶/۱۴۵) میں ضحاک بن مزاحمؒ کا قول نقل کیا ہے: نسخت الزکوة کل حق فی المال یعنی زکوۃ نے ہر مال کے حق کو منسوخ کر

دیا ہے۔

(۶) مسلمانوں سے ٹیکس لینا ناجائز ہے

امام غزالیؒ کیمیائے سعادت (ص۱۲۱) میں لکھتے ہیں:

حکومت وقت اگر مسلمانوں سے خراج کے طور پر مال لیتی ہے تو وہ ناجائز ہوگا۔(مال حرام اوراس کے شرعی مصارف واحکام ص۲۳۲)

امام ماوردی رحمۃ اللہ علیہ الاحکام السلطانیہ(ص۱۱۳) میں لکھتے ہیں۔

لایجب علی المسلم فی ماله حق سواها.

مسلمانوں پر اس کے مال میں زکوۃ کے علاوہ کوئی حق واجب نہیں ہے۔

فی کتاب الاموال للامام ابی عبیدؒ (ص۵۲۶)الجزء الرابع،عن عبدالرحمن بن معقل قال سألت زياد بن حديرممن كنتم تعشرون قال ماكنا نعشر مسلما ولامعاهدا قلت فممن كنتم تعشرون قال تجارالحرب كما كانوا يعشروننا اذااتيناهم .

کتاب الاموال میں ہے کہ عبدالرحمٰن بن معقلؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے زیاد بن حدیر سے پوچھا کہ آپ کن لوگوں سے ٹیکس لیتے تھے؟انہوں نے کہا کہ ہم مسلمانوں سے ٹیکس نہیں لیتے تھے بلکہ اہل حرب کے تاجروں سے لیتے تھے اوراس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہمارے مسلمانوں سے لیتے تھے۔

علامہ شوکانیؒ نیل الاوطار (۶۴/۸) میں لکھتے ہیں۔

لیس علیهم غیر الزکوة من الضروب والمکس ونحوها.

مسلمانوں پر زکوۃ کے علاوہ کسی قسم کا ٹیکس واجب نہیں ہے۔

وفی کتاب الاموال(ص ۵۲۶)الجزء الرابع،عن ابراھیم بن المھاجر قال سمعت زیاد بن حدیر یقول:اناأول من عشر فی الاسلام،قلت من کنتم تعشرون؟ قال:ماکنا نعشر مسلما ولا معاھدا،کنا نعشر نصاریٰ بنی تغلب.

ابراہیمؒ کہتے ہیں زیاد بن حدیرؒ نے کہا کہ میں پہلا شخص ہوں جس نے اسلام میں تجارتی ٹیکس وصول کیا ہے،میں نے کہا تم کس سے تجارتی ٹیکس لیتے تھے؟اس نے کہا کہ ہم مسلمان اور ذمی سے تجارتی ٹیکس نہیں لیتے تھے،صرف بنوتغلب کے نصاریٰ سے ٹیکس لیتے تھے۔

مسلمانوں پر قانوناً ٹیکس لگانے کی شرعی حیثیت

گزشتہ تفصیل کا ماحصل یہ ہے کہ شریعت نے مسلمانو پر کسی قسم کا ٹیکس لاگو نہیں کیا،اب یہ بحث رہ جاتی ہے کہ اگر کوئی ملک مسلمانوں پر کوئی ٹیکس لگائے تو اس کی اجازت ہے یا نہیں؟ اور شرعاً مسلمان اس کی ادائیگی کے پابند ہیں یا نہیں؟اس بارے میں یہ تفصیل ہے کہ فیس، قیمت اور خصوصی ادائیگی میں صارف کو چونکہ باقاعدہ خدمت اور عوض ملتا ہے،اس لئے ان کی ادائیگی شرعاً بھی ضروری ہے،ان کو مجازاً ٹیکس کہا جاتا ہے،یہ حقیقی ٹیکس نہیں ہیں البتہ فیس، قیمت وغیرہ کی شرح عام پرائیویٹ خدمات کے عوض کی شرح سے کم اور مبنی برعدل وانصاف ہونا ضروری ہے،کیونکہ حکومتی اشیاء اور سرکاری خدمات میں عوام الناس کا حصہ ہوتا ہے،انتظام وانصرام حکومت کے پاس ہوتا ہے،اگر حکومت ان خدمات کا معاوضہ وصول نہ کرے تو ایسے اداروں کا وجود برقرار رکھنا مشکل ہوگا،اس لئے ان خدمات کا معاوضہ شرعاً بھی

صحیح ہے،اور یہ معاملہ بھی اختیاری ہے،اگر کوئی یہ خدمت نہ حاصل کرنا چاہے تو اس سے معاوضہ بھی وصول نہیں کیا جاسکتا۔

اور مقامی محصولات اور جائز ومنصفانہ ٹیکس کے جواز کے بارے دوقول ہیں۔

(۱) صحیح یہ ہے کہ چند شرائط کے ساتھ مسلمانوں پر ٹیکس لگانے کی اجازت ہے اور مسلمان ایسے قانون پر عمل درآمد کرنے کے شرعاً بھی پابند ہوں گے،شرائط آگے آرہی ہیں۔

(۲) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ مسلمانوں پر ٹیکس لگانا کسی صورت جائز نہیں ہے۔

دلائلِ جواز

جمہور فقہاء وعلماء کرام کے ہاں چند شرائط کے ساتھ مسلمانوں پر عادلانہ ٹیکس لگانا جائز ہے اور مسلمان اس کی ادائیگی شرعاً بھی پابند ہوں گے،ان حضرات کے دلائل آنے سے پہلے یہ بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ عہدِ نبوی،عہدِ خلفاء اربعہ اور اس کے بعد اسلامی تاریخ میں مسلمانو پر عادلانہ ٹیکس بھی نہیں لگایا گیا،اس لئے جواز ٹیکس کے بارے کسی بھی اسلامی حکومت کا عمل بطورِ ثبوت نہیں پیش کیا جاسکتا۔

دلیلِ اول

ٹیکس نہ عبادت ہے اور نہ شرعی امر ہے،ٹیکس ایک انتظامی معاملہ ہے،اس کا تعلق ملکی قوانین،سرکاری اصول وضوابط اور اوامر سے ہے اور ملکی قوانین اور ان کی

پابندی کرنے یا نہ کرنے کے بارے شرعی اصول یہ ہے کہ جو قوانین اوراصول وضوابط قرآن وسنت اور شریعت مطہرہ کے خلاف نہ ہوں ایسی قانون سازی جائز ہے اور اس کی پابندی ہر مسلمان پر لازم ہے اور جو قوانین و اوامر شریعت مطہرہ سے متصادم ہوں ایسے قوانین بنانا جائز نہیں اور ان اوامر میں حکومت کی اطاعت بھی ضروری نہیں ہے۔ اس اصول کی روشنی میں ظالمانہ ٹیکس بلا شبہ قرآن وسنت اور شریعت مطہرہ سے متصادم ہے لیکن عادلانہ و منصفانہ ٹیکس قرآن وسنت سے متصادم نہیں بلکہ درجہ جواز میں داخل ہے اور جائز اوامر میں حکومت کی اطاعت ضروری ہے۔

فی الاشباہ والنظائر(۱/ ۳۳۱) مع الحموی:اذاکان فعل الامام مبنیا علی المصلحةفیما یتعلق بالا مور العامة لم ینفذ امرہ شرعا الااذا وافقه فان خالفه لم ینفذ.قال الحموی: قال المصنف فی شرح الکنز ناقلا عن ائمتنا:اطاعة الامام فی غیرالمعصیة واجبة فلوامرالامام بصوم یوم وجب.

وفی الشامیة(۲/ ۳۳۶) قال ابو جعفر البلخی مایضربه السلطان علی الرعیة مصلحة لهم یصیردینا واجبا وحقا مستحقا کالخراج وقال مشائخنا:وکل مایضربه الامام علیهم لمصلحةلهم فالجواب هکذا حتی اجرة الحراسین لحفظ الطریق واللصوص ونصب الدروب وابواب السکک وهذایعرف ولا یعرف خوف الفتنة ثم قال: فعلی هذا مایؤخذ فی خوارزم من العامة لاصلاح مسناة الجیحون اوالربض ونحوہ من مصالح العامة دین واجب لایجوز الامتناع عنه ولیس بظلم ولکن یعلم

هذا الجواب للعمل به و كف اللسان عن السلطان وسعاته فيه لا للتشهير حتى لايتجاسروا في الزيادة على القدر المستحق .

دلیلِ دوم

پہلے زمانہ میں حکومت کے ذرائع آمدن زیادہ تھے زکوۃ، عشر، صدقات، خراج ، جزیہ، خمس اور مال فئے سے کافی آمدنی حاصل ہوجاتی تھی اور اس کے مقابلہ میں حکومتی اخراجات اور ریاستوں کی ذمہ داریاں محدود تھیں، اس لئے آمدن اخرجات کیلئے کفایت کرجاتی تھی اور ٹیکس لگانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی تھی لیکن اس دور میں حکومتی ذرائع آمدن کم ہیں، جزیہ، مال غنیمت، خمس اور فئی کا تو تصور ہی ختم ہے اور اموال ظاہرہ کی زکوۃ بھی حکومت وصول نہیں کرتی اور نہ عشر وخراج کے وصولی کا انتظام ہے، سرکاری اداروں مثلاً ریلوے، جہاز، بجلی، گیس، وغیرہ ذرائع آمدن ہیں لیکن ان میں جو گھپلے ہوتے ہیں اور جو خرد برد ہوتا ہے وہ ظاہر ہے، اس لئے ان اداروں کو خسارہ ہی اٹھانا پڑتا ہے اور اس کے مقابلے میں حکومتی اخراجات اور ذمہ داریاں پہلے کی نسبت بہت زیادہ ہوچکی ہیں، اسلئے حکومت کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ عوام الناس پر ٹیکس لگائے۔

اگر اس دور میں مخلص حکومت بھی قائم ہوجائے تو بھی پہلے دور کی طرح اس کے ذرائع آمدن میں بظاہر اضافہ مشکل ہے، زکوۃ ہی اہم ذریعہ آمدن ہوگی اور ظاہر ہے کہ زکوۃ کے مخصوص مصارف ہیں، ان کے علاوہ مصارف میں زکوۃ لگانا جائز نہیں اور مصرف میں لگانے کے لئے بھی قبض اور تملیک جیسی کڑی شرائط ہیں، جزیہ، خمس اور مال فئی وغیرہ کیلئے اقدامی جہاد ضروری ہے جو کہ بدقسمتی سے صدیوں سے نہیں

ہوا اور اب بھی اقوام متحدہ نے اس کے خلاف تلوار لٹکائی ہوئی ہے،اس لئے اسلامی حکومت بھی بظاہر ٹیکس لگائے بغیر نہیں چل سکے گی۔

دلیل سوم

اصول یہ ہے کہ بوقت ضرورت مسلمانوں پر مالی ذمہ داری عائد کی جاسکتی ہے اور ٹیکس بھی اس میں شامل ہے۔اس پر شبہ ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں پر زکوۃ کے علاوہ کچھ واجب نہیں ہے جس کی تفصیل آچکی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں پر زکوۃ کے علاوہ بھی کوئی مالی فریضہ عائد ہوتا ہے ؟ اس بارے اختلاف ہے،جمہور کے ہاں مسلمان کے مال میں زکوۃ کے علاوہ کوئی مالی حق نہیں ہے جبکہ بعض کے ہاں زکوۃ کے علاوہ بھی مالی حق واجب ہے ،ان حضرات کے ہاں مسلمانوں پر عارضی منصوبہ بندی اور قانون سازی کے ذریعہ ٹیکس لگانے میں کوئی شبہ نہیں البتہ جمہور کے مذہب پر شبہ ہوسکتا ہے لیکن جمہور کا بھی اس بات پر اتفاق ہے کہ ضرورت و حاجت کے وقت مسلمانوں کے اموال پر زکوۃ کے علاوہ مالی حق واجب ہوسکتا ہے اور کتب فقہ میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

(۱) والدین اگر ضرورت مند ہوں اور اولاد کے پاس وسعت اور فراخی ہو تو اولاد پر والدین کا نفقہ واجب ہے۔

(۲) بعض دوسرے رشتہ دار بھی اگر مفلس، بے کس اور معذور ہوں تو ان کا نفقہ بھی بقدرِ ارث واجب ہوتا ہے۔

(۳) مضطر (مجبور) کو غذاء، کپڑا اور ٹھکانہ دینا واجب ہے، چنانچہ امام جصاصؒ احکام القرآن (۱۳۱/۳) میں فرماتے ہیں:

بلا شبہ زکوۃ فرض ہے مگر زکوۃ کے علاوہ بھی کچھ ایسے مواقع ہیں جہاں دینا فرض ہے مثلاً جائع مضطر کو، برہنہ شخص کو اور ایسی میت کیلئے کہ جس کی تجہیز وتکفین کا کوئی انتظام نہ ہو۔

(۴) مسلمانوں پر نازل ہونے والے عام مصائب وآفات کادور کرنا بھی فرض ہے جیسے دشمن کا خطرہ دور کرنااور قحط وافلاس کامقابلہ کرناوغیرہ،اس کاوجوب اجتماعی ہےاور فرد کے حق پر اجتماع کاحق مقدم ہوتاہے۔

ان حقائق سے جمہور علماء اسلام کا یہ اصول معلوم ہوا کہ ضرورت وحاجت کے وقت مسلمانوں پر زکوۃ کے علاوہ بھی کوئی مالیہ لاگو کیاجاسکتاہے اور ٹیکس بھی اسی زمرے میں آتاہے۔

فی المحلیٰ لابن الحزم(۳/۱۵۶)رقم المسئلة۷۲۵کتاب الزکوۃ،.....قال ابو محمد:وفرض علی الاغنیاء من کل بلدان یقوموا بفقرائهم ویجبرهم السلطان علی ذلک ان لم تقم الزکوۃ بهم ولافی سائر المسلمین بهم فیقام لهم بما یأکلون من القوت الذی لابدمنه.

دلیل چہارم

عادلانہ ٹیکس کاجواز شریعت مطہرہ کے مندرجہ ذیل قواعدِ کلیہ اور اصولِ اساسیہ کے تحت آتاہے۔

(۱)الضرریزال(۲)الضرورات تبیح المحظورات(۳)یتحمل الضرر الخاص لاجل دفع الضررالعام(۴)الضررالاشد یزال بالضرر الاخف(۵)اذا تعارض مفسدتان روعی اعظمهما ضررا بارتکاب

اخفهما(٦) درأالمفاسد اولی من جلب المصالح فاذا تعارضت مفسدة ومصلحة قدم دفع المفسدة غالبا.الاشباه والنظائر(١/٢٥٠)مع الحموی،القاعدة الخامسة،وشرح المجلة للا تاسی(١/٥٤)القاعده ٢٠الی القاعده ٣١.

ان قواعد شرعیہ کا حاصل یہ ہے کہ شرعاً حتی الامکان ضرر کا دفعیہ کرنا چاہئے اور ضرورت کی وجہ سے بعض شرائط کے ساتھ ممنوع کام کی بھی گنجائش نکل آتی ہے۔ عام ضرر سے بچنے کیلئے خاص ضرر کو گوارا کیا جاسکتا ہے،اسی طرح شدید ضرر سے بچنے کیلئے ہلکے ضرر کا ارتکاب درست ہے،اگر دو مفسدے جمع ہوجائیں توان میں سے ہلکے کاارتکاب کر کے بڑے کو دفع کیا جائیگااور اگر کسی امر میں مفسدہ اور مصلحت جمع ہوں تو حصول مصلحت پر دفع مفسدہ کو ترجیح دی جائیگی۔

ان سے عادلانہ ٹیکس کا جواز یوں ثابت ہوا کہ اگر کوئی اسلامی حکومت جائز ٹیکس بھی لاگو نہ کرسکے تو اس سے شدید نقصان ہوگا،حکومت کا مالیاتی نظام خسارہ سے دوچار ہوجائے گا،حکومت کی عوام پر گرفت کمزور ہوگی اور ملک کا انتظام فیل ہوجائے گا،فسادات ہوں گے،امن سبوتاژ ہوگا بلکہ وہ غیر مسلم حکومتوں کے مقابلہ کی قابل نہ رہے گی۔

دلیل پنجم

فقہ الزکوۃ(٢/٦٧٤) میں ہے:

اسلام نے مسلمانوں پر جہاد بالمال اور جہاد بالنفس فرض قرار دیا ہے، چنانچہ فرمان الٰہی ہے۔

انفروا خفافا وثقالا وجاهدو باموالكم وانفسكم فى سبيل الله (سورة التوبة رقم الآية ۴۱)

ہلکے اور بوجھل ہوکر نکلو اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مال اور نفس وجان کے ساتھ لڑو۔

انما المؤمنون الذين امنوا بالله ورسوله ثم لم يرتابوا وجاهدوا باموالهم وانفسهم فى سبيل الله اولئك هم الصادقون (سورة الحجرات رقم الآية ۱۵)

بلاشبہ ایمان والے وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں پھر اس بارے انہیں شک نہیں گزرتا اور وہ اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور جانوں کے ساتھ جہاد کرتے ہیں اور یہی لوگ سچے ہیں۔

تؤمنون بالله ورسوله وتجاهدون فى سبيل الله باموالكم وانفسكم (سورة الصف رقم الآية ۱۱)

تم اللہ اوراس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور جانوں کے ساتھ جہاد کرو۔

وانفقوا فى سبيل الله ولا تلقوا بايديكم الى التهلكة واحسنوا ان الله يحب المحسنين. (سورة البقرة رقم الآية ۱۹۵)

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیکی کرو یقیناً اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاد بالمال زکوۃ کے علاوہ ایک فریضہ ہے اور

اولوالامر یعنی حکمرانوں کو یہ اختیار ہے کہ وہ ہر غنی شخص پر جہاد بالمال کے ضمن میں کوئی حصہ متعین کریں، چنانچہ امام ابن تیمیہؒ صاحب غیاث الامم سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اب لشکروں کے اخراجات اور انہیں مسلح کرنے کے مصارف بہت بڑھ گئے ہیں اور اقوام کی ہر طرح کی عملی، صنعتی اور اقتصادی ترقی ناگریز ہوچکی ہے اور یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ قوم اپنی جان مال اور عزت کی حفاظت کر سکے۔

دلیل ششم

ٹیکسوں سے حاصل شدہ مال مرافق عامہ میں صرف ہوتا ہے جس سے تمام افراد معاشرہ مستفید ہوتے ہیں اور دفاع، امن، تعلیم، صحت، نقل وحرکت اور آب کاری وآب رسانی کی سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، کیونکہ ہر فرد ریاست کی فراہم کردہ سہولتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے، اس لئے اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے مال سے ریاست کی مدد کرے، معاشرہ سے جو فوائد حاصل کررہا ہے ان کے بالمقابل اس پر جو ذمہ داریاں پابندیاں عائد ہوں وہ انہیں پورا کرے، اسی فقہی اصول کو فقہا کرام نے "الغرم بالغنم" سے تعبیر کیا ہے۔ (ایضاً)

اغنیاء اور فقراء کا فرق

ٹیکس صرف اغنیاء پر لگایا جاسکتا ہے یا فقراء پر بھی؟ اس بارے تفصیل یہ ہے کہ فیس، قیمت اور خصوصی ادائیگی فقراء اور غریب طبقہ سے بھی وصول کی جاسکتی ہے کیونکہ یہ خدمت کا معاوضہ ہے اور ٹیکس اور مقامی محصولات شرعاً صرف اغنیاء پر لاگو کیا جاسکتا ہے، فقراء اور غریب طبقے پر لاگو کرنا صحیح نہیں ہے، یہ چونکہ انتظامی

معاملہ ہے، اس لئے یہاں غنی سے مراد شرعی غنی اور فقیر سے مستحق زکوۃ مراد نہیں ہوگا، حکومت وقت خود اس کی تحدید کرسکتی ہے، البتہ شرعاً غنا کی تحدید میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ وہ شخص ٹیکس بسہولت ادا کر سکے اور اس کے بعد اس کے پاس بقدرِ ضرورت کچھ بچ جائے۔

عادلانہ ٹیکس اور مذاہب اربعہ

مذاہب اربعہ کے فقہاء کرام رحمہم اللہ عادلانہ ومنصفانہ ٹیکس کے جواز کے قائل ہیں اور ان کے ہاں اس کے جواز کی تصریح ملتی ہے، کتب فقہ میں ظالمانہ ٹیکس کو الضرائب اور المکس سے تعبیر کیا ہے اور عادلانہ و منصفانہ ٹیکس کو مذاہب اربعہ کی کتب میں الگ الگ الفاظ سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ فقہاء احناف عادلانہ ٹیکس کو'' القسمۃ،، اور'' النوائب،، سے تعبیر کرتے ہیں اور فقہاء مالکیہ'' وظائف،، اور'' خراج'' فقہاء حنابلہ'' الکلف السلطانیہ،، سے تعبیر کرتے ہیں، جس سے بخوبی واضح ہوگیا کہ ٹیکس کی دو اقسام ہیں۔

(۱) ظالمانہ وجابرانہ ٹیکس، یہ بالاتفاق ناجائز اور حرام ہے۔

(۲) عادلانہ ومنصفانہ ٹیکس، یہ مخصوص شرائط کے ساتھ جائز ہے جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ اب فقہاء کرام کی تصریحات ملاحظہ ہوں۔

فقہ حنفی کی تصریحات

هدایه(۳/ ۱۲۵) کتاب الکفالة، فصل فی الضمان میں ہے۔

ومن ضمن عن اخر خراجه ونوائبه وقسمته فهوجائز اما الخراج

فقد ذکرناه وهو يخالف الزكوة لانها مجرد فعل ولهذا لا تؤدى بعد موته من تركته الا بوصية واما النوائب فان اريد بها مايكون بحق ككرى النهر المشترک واجرةالحارس والموظف لتجهيز الجيش وفداء الاسارى وغيرها جازت الكفالة بها على الاتفاق وان اريد بها ماليس بحق كالجبايات فى زماننا ففيه اختلاف المشائخ ومن يميل الى الصحة الامام على البزدوى واماالقسمة فقد قيل هى النوائب بعينهااوحصة منها والرواية باووقيل هى النائبة الموظفة الراتبة والمراد بالنوائب ماينوبه غيرراتب والحكم مابيناه.

اگر کوئی دوسرے کی طرف سے اس کے خراج، عارضی ٹیکس اور مستقل مقرر ٹیکس کا ضامن بنا تو یہ جائز ہے، جہاں تک خراج کا تعلق ہے تو اس کی کفالت اس لئے جائز ہے کہ خراج ایک ایسا دین ہے جس کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور اس کی وصولیابی بھی ممکن ہے اور زکوۃ کی کفالت درست نہیں، کیونکہ وہ محض ایک فعل ہے، یہی وجہ ہے کہ مرنے کے بعد میت کے ترکہ سے زکوۃ ادانہیں کی جاتی البتہ اگر وصیت کی ہوتوادا کی جائے گی اور جہاں تک نوائب کاتعلق ہےتواس سے مراد اگر جائز ٹیکس ہو توبالاتفاق اس کی کفالت درست ہے جیسے مشترکہ نہر کھودنے کا خرچہ، چوکیدار کی تنخواہ، لشکر تیار کرنے کے اخراجات اور قیدی چھڑانے کے مصارف وغیرہ اوراگراس سے ناجائزاور ناحق ٹیکس مراد ہو جیسا کہ ہمارے علاقوں میں لیا جاتا ہے،تواس کی کفالت میں اختلاف ہے،امام علی بزدویؒ اس کی صحت کی طرف مائلین میں سے ہیں اورقسمۃ سے مرادمقرر کردہ دائمی اور مستقل ٹیکس ہے اور'' نوائب ،، سے مراد ایسا ٹیکس ہے جو

کسی حادثہ اور ضرورت کے پیش آنے پر عارضی لگادیا جائے۔

امام کمال بن الہمامؒ فتح القدیر(۳۳۲/۵) میں عادلانہ ٹیکس اور انکی کفالت کے جواز کے بارے لکھتے ہیں۔

لانها واجبة على كل مسلم موسر بايجاب طاعة ولى الامرفيما فيه مصلحة المسلمين ولم يلزم بيت المال اولزمه ولا شئى فيه.

یعنی جن ٹیکسوں میں مسلمانوں کی مصلحت ہوتی ہو ولی امر(حکمرانِ وقت) کے حکم سے وہ ہر غنی مسلمان پر ضروری ہوجاتے ہیں لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ بیت المال میں کچھ موجود نہ ہو یا موجود ہو لیکن ضرورت سے کم ہو۔

اس سے کچھ پہلے یہ شرط ان الفاظ میں لکھی ہے۔

اذالم يكن فى بيت المال شئى.

یعنی بشرطیکہ بیت المال میں کچھ نہ ہو۔

صاحب عنایہ لکھتے ہیں:

واما النوائب فقد يراد بها مايكون بحق.....لوجوب ادائه على كل مسلم اوجبه الامام عليه لوجوب طاعته فيما يجب النظر للمسلمين والثانى كالجبايات فى زماننا وهى التى يأخذ ها الظلمة فى زماننا ظلما كالقيجر.

ٹیکس دوقسم کے ہیں(۱) جائز ٹیکس،اس کا ضمان اس لئے درست ہے کیونکہ اس کی ادائیگی ہر اس مسلمان پر واجب ہے،جس پر امام وقت نے مقرر کیا ہو کیونکہ جن امورمیں مسلمانوں کی رعایت اور نظرہوان میں امام وقت کی اطاعت

ضروری ہے(۲) ظالمانہ ٹیکس جیسا کہ ہمارے زمانے میں چنگی کے نام سے ظالم حکمران لیتے ہیں۔

فتاوی قنیہ (ص۱۷۲) کتاب الکراھیة والاستحسان، باب فی الاستحلال ورد المظالم والخروج عن عهد تها وما یتعلق بالنوائب والجبایات میں ہے۔

ویتصل به مسائل النوائب والجبایات، بزدوی فی(جص) اما النوائب فهی ماینوبه من جهة السلطان من حق او باطل او غیره تصح الکفالة بها لانها دیون فی حکم توجه المطالبة بها ولهذا قلنا ان من قام بتوزیع هذه النوائب علی المسلمین بالقسط والمعادلة کان ماجورا وان کان من جهة الذی یأخذ باطلا ولهذا قلنا من قضی نائبة غیره باذنه رجع علیه من غیرشرط الرجوع استحسانا بمنزلة ثمن المبیع بخلاف الزکوة والخراج وغیرهما(جص) ضمن عنه نوائبه وخراجه وقسمته جاز(مشح) النائبة مایضرب السلطان علی الرعیة مصلحة لهم یصیردینا واجبا وحقا مستحقا کالخراج وضربة المولی علی عبده ورسول الله صلی الله علیه وآله وسلم امر اهل المدینة بان یرد واالکفاربثلث ثمار المدینة ثم بنصفها وکانت ملک الناس ومع ذلک قطع رأیه دونهم وامر اصحابه بحفرالخندق حول المدینة ووضع اجرالعلمة علی من قعد فکذاالسلطان وقال مشائخنا: وکل مایضرب الامام علیهم لمصلحة لهم فالجواب هکذا حتی اجرة الحراسین لحفظ الطریق واللصوص ونصب الدروب وابواب

السکک وھذا یعرف ولایعرف خوف الفتنة وقیل النوالب ضرب البعوث یأمر بخروج خمسة اوستة من کل عشرہ فمن یأبی یضرب علیھم مؤ نتھم وھذاحق واجب فرض کالخراج یجوز بہ الضمان،(شح) اختلف فی معنی النوائب فقیل اجرالحارس وغیرہ وانہ واجب شرعاً وقیل مایحتاج الیہ السطان لتجھیزالجیش لقتال المشرکین اذااحتاج الیہ لفداء اسری المسلمین فیؤظف علیھم مالا فھی النائبة وھو واجب الاداء طاعةللامام وصح الضمان بہ لان کل واحد مطالب محبوس بہ قال رحمہ اللہ: فعلی ھذامایؤخذفی خوار زم من العامة لاصلاح مسناة الجیحون اوللربض ونحوہ من مصالح العامة دین واجب وحق مستحق لا یجوزالامتناع عن ادائہ ولیس بظلم ولکن یعلم ھذاالجواب للعمل بہ وکف اللّسان عن السلطان وسعاتہ فیہ لاللتشھیرحتی لایتجاسروا فی الزیادة علی القدرالمستحق الخ.

وفی الدر للمختار (۳۳۶/۲) وتصح الکفالہ بھا ویؤجر من قام بتوزیعھابالعدل وان کان الأ خذ باطلا وھذا یعرف ولایرف کفا لمادة الظلم.

وفی الشامیة:(قولہ وتصح الکفالة بھا)ای بالنائبة سواء کانت بحق ککری النھر المشترک للعامة واجرة الحارس للمحلة المسمی بدیار مصراالخفیر وماوظف للامام لیجھزبہ الجیوش وفداء الاساری بأن احتاج الی ذلک ولم یکن فی بیت المال شئی فوظف علی الناس ذلک

والکفالة به جائزة اتفاقا او کانت بغیر حق کجبایات زماننا فانها فی المطالبة کالدیون بل فوقها .

پھر علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے القنیۃ کی مذکورہ عبارت سے ضروری اقتباسات نقل کرنے کے بعد ٹیکس کے جواز کی یہ شرط لکھی ہے۔

قلت:وینبغی تقییدذلک بما اذالم یوجد فی بیت المال مایکفی لذلک لما سیأتی فی الجہادمن انہ یکرہ الجعل ان وجد فیئ .

یعنی ٹیکس عائد کرنے کے جواز کی شرط یہ ہے کہ بیت المال میں بقدرِ کفایت مال موجود نہ ہو۔

وفی الدرالمختار(۶/۴۴۱)فصل فی الشرب وکری نہر غیرمملوک من بیت المال فان لم یکن ثمہ ای فی بیت المال شئی یجبرالناس علی کریہ ان امتنعوا عنہ دفعا للضرر.

وفی الشامیة(قولہ من بیت المال) خبرالمبتدای مال الخراج والجزیة دون العشر والصدقات لأن الثانی للفقراء والاول للنوائب. ھدایة(قولہ یجبرالناس)ای الذین یطیقون الکری ومؤنتھم من مال الاغنیاء الذین لا یطیقونہ، قھستانی.

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ البدور البازغۃ (ص۸۵) میں ٹیکس کے جواز، ضرورت اور اس کی معقولیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ولما کان الامام واعوانہ محصورین علی حوائج القوم وجب ان

یکون مونة معاشهم علی المدینة لانهم اجراء یعملون العمل النافع لها کمثل سائر الاجراء فاذن لابد من حیازة الاموال من المدینة .

چونکہ امام وقت اور اس کے معاونین قومی ضروریات وحاجات میں مشغول ہوتے ہیں،اس لئے ضروری ہے کہ ان کے معاشی ضروریات کابوجھ شہر پر ڈال دیا جائے،کیونکہ وہ بھی عام مزدوروں کی طرح ایک قسم کے مزدور ہیں،جو شہر کیلئے نافع خدمت سرانجام دے رہے ہیں،لہٰذا ضروری ہے کہ شہر کے لوگوں سے اموال وصول کئے جائیں۔

وفی حجةالله البالغة(۲/۴۰) والابواب التی اعتادهاطوائف الملوک الصالحین من اهل الاقالیم الصالحة وهو غیر ثقیل علیهم، وقد تلقتها العقول بالقبول اربعة:الاول ان توخذ ...والرابع ان تلزم ضرائب علی رؤس الکاسبین فانهم عامة الناس واکثرهم واذا جبی من کل منهم شئی یسیر کان خفیفا علیهم عظیم الخطر فی نفسه.

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ

اسلام کا اقتصادی نظام(ص۱۲۳) میں لکھتے ہیں:

زمانہ جنگ،قحط سالی،رفاہِ عامہ اورعوام کی بے روزگاری دور کرنے کیلئے زکوٰۃ اورصدقات کے علاوہ جو ٹیکس(مالی امداد)اغنیاء اور اہلِ ثروت پر حکومت کی جانب سے عائد کئے جاتے ہیں ان کا نام ضرائب ہے،ٹیکسوں کاوہ مفہوم جو زمانہ موجودہ کے طریقہ حکومت میں رائج ہے اسلامی نظام حکومت میں ناپید ہے،اس لئے کہ آج کل جو ٹیکس پبلک پر لگائے جاتے ہیں وہ عموماً عدل وانصاف کے خلاف اور

حکومت یا ارکان حکومت کے ان مفادات کی خاطر لگائے جاتے ہیں جن کا پبلک مفاد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اسلام کے دستوری نظام میں خراج، جزیہ، عشور، عشر، زکوۃ، فیٔ، خمس، وقف، اور اس قسم کے محاصل اس غرض سے مقرر کئے گئے ہیں کہ وہ پبلک کی انفرادی اور اجتماعی ضروریات کے کام آئیں، اس لئے وہ عام طور پر مزید ٹیکس عائد کرنے کو جائز نہیں سمجھتا، البتہ اگر بیت المال کے مسطورہ بالا محاصل ان ضروریات کو کافی نہ ہوں یا ہنگامی اہم ضروریات ان محاصل سے فاضل آمدنی کے بغیر پوری نہ ہوسکیں تو عدل وانصاف کے ساتھ اہم ہنگامی محاصل (ایمرجنسی ٹیکس) اغنیاء اور اہلِ ثروت پر عائد کئے جاسکتے ہیں۔

پھر ابن حزمؒ کی المحلی سے ثبوت پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

پس جس طرح غرباء کی ضرورت پورا کرنے کیلئے خصوصی ٹیکس ادا ہوسکتا ہے اسی طرح جہاد اور دوسری ضروریات کیلئے بھی ٹیکس عائد ہوسکتا ہے، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوہ یرموک میں اس قسم کی اعانت کی ترغیب دی تھی جس پر پرجوش طریقہ سے لبیک کہا گیا۔

حضرت مولانا مناظر حسن گیلانیؒ سے ثبوت

اسلامی معاشیات (ص ۳۹۴) میں بعنوان ''زائد محصول کے عائد کرنے کا حکومت کو اختیار،، کے تحت لکھتے ہیں:

ہمارے فقہاء یہ بھی لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے عام مصالح یا مشترکہ ضرورتوں کیلئے حکومت باشندوں پر حسب صوابدید زائد ٹیکس بھی عائد کرسکتی ہے....

جسے اصطلاحاً ''النوائب،، کہتے ہیں، النوائب کی تعریف ہدایہ، کتاب الکفالہ میں یہ کی گئی ہے۔

مایکون بحق ککری النھر المشترک واجرۃ الحارس للمحلۃ والموظف لتجھیز الجیش وفداء الاساری .

یعنی جو محصول (واقعی ضرورت کیلئے) عائد کیا جائے مثلاً ایسی نہر کھودنے جو عام مشترکہ ضروریات کیلئے ہو، پہرہ دینے والوں کی تنخواہ کیلئے جو محلہ کی حفاظت کرتے ہوں اوروہ محصول جو فوج کی تیاری کیلئے عائد کیا جائے یا قیدیوں کا فدیہ ادا کرنے کیلئے حکومت کوضروری ہو۔

مطلب یہ ہے کہ اگر واقعی اور صحیح ضرورت پڑجائے تو اس وقت حکومت باشندوں پر جدید ٹیکس خواہ وہ ایک دفعہ وصول کیا جائے یا قسطوں پر تقسیم کردیا جائے جائز ہے اورعام پبلک پر اس قسم کے محصول کاادا کرنا واجب ہے جس کی وجہ ابن ہمامؒ نے یہ لکھی ہے کہ:

لانھاواجبۃ علی کل مسلم موسر بایجاب طاعۃ اولی الامر فیما فیہ مصلحۃ المسلمین(ص ۳۲۲)

ہر مستطیع مسلمان پراس محصول کاادا کرنااس لئے واجب ہے کہ ہر اولوالامر کی اطاعت ان امور میں ضروری ہے جن میں مسلمانون کی بھلائی ہو۔

غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ حکومت کے ہرمطالبہ کی ادائیگی کو فقہاء واجب نہیں کہتے بلکہ وجوب ان ہی مطالبوں تک محدود ہے جن کا تعلق مسلمانوں کی عام واقعی ضرورتوں اور ملک کے ضروری مصالح سے ہو ورنہ ہدایہ اوراس کی شروح

میں اس کے بعد تصریح کردی گئی ہے کہ حکومت کے ایسے مطالبات جو حق نہ ہوں مثلاً جو محصول ہمارے زمانے میں فارسی ممالک میں درزیوں اور رنگ ریزوں وغیرہ پر بادشاہ کی طرف سے ہر روز یا ہر مہینہ یا ہر تین مہینے میں وصول کئے جاتے ہیں تو اس کا ادا کرنا ضروری نہیں کہ یہ ظلم ہے۔

ومالیس بحق کالجبایات فی زماننا ببلاد فارس علی الخیاط والصباغ وغیرھم للسلطان فی کل یو م اوالشھر او ثلثة اشھرفانه ظلم.

شمس الائمہؒ سے ابن ہمامؒ نے نقل کیا ہے کہ ایسے مطالبات کا نہ ادا کرنا ثواب ہے،ان کے الفاظ یہ ہیں۔

اما فی زماننا فاکثرالنوائب توخذ ظلما ومن تمکن من دفع الظلم عن نفسه فھو خیر له(فتح القدیر ۵/ ۴۳۳)

ہمارے زمانے میں یہ عموماً جو محصول وصول کئے جاتے ہیں چونکہ یہ ظلماً وصول کئے جاتے ہیں اور ظلم کا ازالہ،جس کو جتنا موقع ملے وہ اس کیلئے بہتر ہے۔

فقہ مالکی کی تصریح

الشیخ محمد علیؒ مفتی المالکیہ اپنی کتاب "تھذیب الفروق والقواعد السنیة" (۱/ ۱۴۱) میں لکھتے ہیں:

مسلمانوں پر خراج عائد کرنا مصالح مرسلہ میں سے ہے اور بلا شبہ جائز ہے ،آج اندلس میں مزید خراج (ٹیکس) کی ضرورت ہے کیونکہ دشمن سے مقابلہ ہے اور بیت المال ناکافی ہے،اس لئے خراج قطعی طور پر جائز ہے،جہاں تک اس کی مقدار

کا تعلق ہے تو وہ امام کی رائے پر موقوف ہے۔

قال الامام الشاطبیؒ فی کتاب الاعتصام(۳۳۶/۲)من الباب الثامن فی الفرق بین البدع والمصالح المرسلة والاستحسان،فی المثال الخامس له:

اناإذا قررنا اماما مطاعا مفتقرا الی تکثیر الجنود لسد الثغوروحمایة الملک المتسع الاقطار،وخلا بیت المال، وارتفعت حاجات الجند الی مالا یکفیهم فللامام اذا کان عدلا ان یوظف علی الاغنیاء مایراه کافیا لهم فی الحال،الی ان یظهر مال بیت المال، ثم الیه النظر فی توظیف ذلک علی الغلات والثمار وغیر ذلک کیلا یؤدی تخصیص الناس به الی ایحاش القلوب،وذلک یقع قلیلا من کثیر بحیث لایجحف بأ حد ویحصل المقصود،وانما لم ینقل مثل هذا عن الاولین لاتساع مال بیت المال فی زمانهم بخلاف زماننا فان القضیة فیه احری ووجه المصلحة هنا ظاهر،فانه لو لم یفعل الامام ذلک النظام بطلت شوکة الامام وصارت دیارنا عرضةلاستیلاء الکفار.

وانما نظام ذلک کله شوکةالامام بعدله،فالذین یحذرون من الدواهی لوتنقطع عنهم الشوکة،یستحقرون بالاضافة الیها اموالهم کلها،فضلا عن الیسیرمنها،فاذاعورض هذا الضرر العظیم بالضرر اللاحق لهم باخذالبعض من اموالهم،فلایتماری فی ترویج الثانی عن الاول وهو مما یعلم من مقصود الشرع قبل النظر فی الشوا هد.

والملائمة الاخرى.ان الاب فى طفله اوالوصى فى يتيمه اوالكافل فيمن يفعله مأمور برعاية الاصلح له وهويصرف ماله الى وجوه من النفقات او المؤن المحتاج اليهاوكل مايره سببا لزيادة ماله اوحراسته من التلف جاز له بذل المال فى تحصيله ،ومصلحة الاسلام عامةلاتتقاصر عن مصلحةطفل،ولانظرامام المسلمين يتقاعد عن نظر واحد من الأحادفى حق محجوره.

ولو وطئ الكفار ارض الاسلام لوجب القيام بالنصرة،واذا دعاهم الامام وجبت الاجابة وفيه القاء النفوس وتعريضها الى الهلكة، زيادة الى انفاق المال وليس ذلک الالحماية الدين ومصلحة المسلمين

فاذاقدرنا هجومهم واستشعرالامام فى الشوكة ضعفا وجب على الكافة امدادهم،كيف والجهاد فى كل سنةواجب على الخلق؟وانما يسقط باشتغال المرتذقة فلايتمارى فى بذل المال لمثل ذلک.

واذاقدرناانعدام الكفار الذين يخاف من جهتهم فلايؤمن من انفتاح باب الفتن بين المسلمين فالمسئا لة على حالها كماكانت وتو قع الفساد عتيد فلابدمن الحراس.

فهذه ملا ئمة صحيحة،الاأنها فى محل ضرورة،فتقدر بقدرها فلايصح هذاالحكم الامع وجودها والاستقراض فى الازمات انما يكون حيث يرجى لبيت المال دخل ينتظر او يرتجى واما اذا لم ينتظر شئى وضعفت وجوه الدخل بحيث لايغنى كبير شئى فلا بد من جريان حكم

التوظيف.

وهذه المسئلة نص عليها الغزالی فی مواضع من كتبه وتلاه فی تصحيحهاابن العربی فی احكام القرآن له،وشرط جواز ذلک كله عندهم عدالة الامام وايقاع التصرف فی اخذا لمال واعطائه على الوجه المشروع.

وكذاقال الامام القرطبی رحمه الله فی موضع اخر من الكتاب المذكور (۲/۲۸۴)

فقہ شافعی کی تصریح

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ المستصفی من علم الاصول (۱/۳۰۳) میں لکھتے ہیں:

اگر مالیہ کی کمی واقع ہوجائے اورلشکر کے اخراجات پورا کرنے کیلئے سرمایہ نہ رہے جبکہ دشمن کا بھی خطرہ ہوا اور اہلِ شر کے فتنہ کا اندیشہ ہوتوامام کیلئے اغنیاء پر مقدارکفایت لازم کردیناجائز ہے کیونکہ اگر دوشر اور دوضرر جمع ہوں تو شرعی اصول یہ ہے کہ بڑے شراورعظیم ضررکو دور کیاجاتاہے،ظاہر ہے کہ اغنیاء بیت المال کوجوکچھ دیں گے وہ جان ومال کے اس نقصان سے بہت کم ہوگاجو کہ اسلامی حکومت کے کمزور ہوجانے سے رونما ہوسکتاہے۔

وفی الغياثی لامام الحرمين(۲۶۱،۲۶۲) والذی اختاره قاطعا به ان الامام يكلف الاغنياء من بذل فضلات الاموال ماتحصل به الكفاية والغناء فان اقامة الجهاد فرض على العباد وتوجيه الاجناد على اقصى المكان والاجتهاد فی البلاد محتوم لاتساهل فيه وما اقرب تقاعد نا عنهم

الی سبرهم الینا واستجرائهم الیناااذاکناالانسوغ تعطیل شیء من فروض الکفایة فاحری فنونهاہالمراعات الغزوات والامور فی الوالایات اذالم تؤخذ من مبادیها،جرت اموراًیعسر تدارکها عند تماریها.

وفیه(۲۷۱)والامرفی اخذ الاموال یجری علی هذه الاحوال فلیشرعلی اغنیاء کل صقل بأن یبذلوا من المال مایقع به الاستقلال ولیس لتفاصیل الرأی غایة ونهایة،فلیرالامام فی ذلک کله رائیه.

وفیه ایضاً(ص۲۷۷) والجملة فی ذلک انه اذا ألمت ملمة واقتضی المامها مالا فان کان فی بیت المال مال استمدت کفایتهامن ذلک المال،وان لم یکن فی بیت المال مال،نزلت علی اموال کافة المسلمین،فاذاکفیت من اموالهم فقد انقصت وانقضت تبعاتها وعلائقهافاذا حدث مال تهیأ ماحدث للحوادث المستقبلة.

وفیه ایضاً(۲۸۵،۲۸۶) والذی ذکرنا امرکلی بعید المأخذ من احاد المسائل،ومنشؤه الایالةالکبریٰ مع الشهادات الباتة القاطعةمن قاعدة الشریعة،فاذامست الحاجة الی استمداد نجدة الدین وحرمة المسلمین من الاموال،ولم یقع الاجتزاء والا کتفاء بمایتوقع علی المغیب من جهةالکفار وتحقق الاضطراراوامة الاستظهار،واقامة حفظ الدیار الی عون من المال مطرددار،ولوعین الامام اقواما من ذوی الیسار،لجر ذلک حزازات فی النفوس وفکرا سیئةفی الضمائر والحدوس،واذا رتب علی الفضلات والثمرات والغلات قدرا قریبا کان طریقا فی رعایة الجنود

والرعیة مقتصدة مرضیة .

ثم ان اتفقت مغانم،واستظهربأخماسها بیت المال وغلب علی الظن اطراوالکفالة الی امد مظنون ونهایة فیغض حینئذ وظائفه،فانها لیست واجبات توقیفیة،فمهمااستظهربیت المال واکتفیٰ حظ الامام ماکان یقتضیه وعفا فان عادت مخایل حاجة،اعادالامام سهاجه.

وفیه ایضا(ص۲۸۶)وهذاالفصل الذی اطلت انفاسی فیه یلتفت الی امرقدمته فی الاستظهاربالادخارفلست اری للامام ان یمد یده الی اموال اهل الاسلام لیتبنی بکل ناحیة حرزا،ویقنی ذخیرة وکنزا،ویتأثل مفخرا وعزاولکن یوجه لدرورالمؤن علی ممر الزمن فاسبق رسمه فان استغنی عنه بأ موال افا ئها الله علی بیت مال المسلمین کف طلبته عن الموسرین.

ماخذہ:مال حرام اوراس کے شرعی مصارف واحکام (ص۶۷ تا۶۸)

فقہ حنبلی کی تصریح

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ صاحب غیاث الامم سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اب لشکروں کے اخراجات اور انہیں مسلح کرنے کے مصارف بہت بڑھ گئے ہیں اور اقوام کی ہر طرح کی علمی، صنعتی اوراقتصادی ترقی ناگریز ہوچکی ہے،جس کیلئے وافر دولت کی ضرورت ہے جوٹیکس لگا کر ہی پوری کی جاسکتی ہے، اور یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ قوم اپنی جان ومال وعزت کی حفاظت کرسکے۔ فقہ الزکوۃ(۲/۶۷۵)

فقہ ظاہری کی تصریح

علامہ ابن حزم المحلی (۱۵۶/۶) کتاب الزکوۃ میں لکھتے ہیں:

قال ابومحمد:وفرض علی الاغنیاء من کل بلد ان یقوموا بفقرائهم ویجبرهم السلطان علی ذلک ان لم تقم الزکوۃ بهم وفی سائرالمسلمین فیقام لهم بمایاکلون من القوت الذی لابدمنه ومن اللباس للشتاء والصیف بمثل ذلک وبمسکن یمکنهم من المطروالصیف والشمس وعیون المارۃ.

یعنی ہر ملک کے مالدارلوگوں پر فرض ہے کہ اپنے غریبوں کی کفالت کریں اگر زکوۃ کی آمدنی اور سارے مسلمانوں کی فیئ اس کیلئے کافی نہ ہوتو حکمران ان کو ایسا کرنے پر مجبور کرے گا،ان غریبوں کیلئے اتنے مال کا انتظام کیا جائے گا کہ جس سے وہ بقدرِضرورت غذاحاصل کرسکیں اوراس طرح اجاڑے اور گرمی کالباس اور ایک ایسا مکان جوانہیں بارش،گرمی،دھوپ اور راہ گیروں سے محفوظ رکھ سکے۔

آگے فرماتے ہیں کہ یہ آیت اپنی عمومیت کے ساتھ اس ٹیکس کی دلیل بن سکتی ہے۔

وات ذالقربی حقه والمسکین وابن السبیل

"اور قرابت والوں اور مساکین اور مسافر کے جو حق تم پر واجب ہیں وہ ادا کرو"

اورحسب ذیل آثاراس کی تائید میں پیش کئے جاسکتے ہیں:

(۱)عن علی بن ابی طالبؓ یقول:ان اللہ تعالیٰ فرض علی الاغنیاء

فی اموالهم بقدرِمایکفی فقرائهم فان جاعوا وعروا وجهدوا فبمنع الاغنیاء.

"حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اغنیاء پر ان کے اموال میں اس قدر حق فرض کر دیا ہے جو فقراء کو کفایت کر سکے لہٰذا اگر فقراء بھوکے ہیں، ننگے ہیں اور خستہ حال ہیں تو اس کا سبب یہی ہے کہ اغنیاء ان کو حق دینے سے مانع ہیں۔

(۲) وعن ابن عمرؓ انه قال فی مالک حق سوی الزکوة.

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ تمہارے مال میں زکوۃ کے علاوہ بھی حق واجب ہے۔

فقہ عام کی تصریح۔

ڈاکٹر یوسف القرضاوی فقہ الزکوۃ (۶۷۲/۲) میں منصفانہ ٹیکس کے جواز کے دلائل اور فقہی قواعد نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"ان قواعد سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ٹیکس کا عائد کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ مصالح امت کے حصول اور مفاسد و اضرار کے دور کرنے کیلئے ضروری ہے الا یہ کہ ایسے مصادر موجود ہوں جو ٹیکس سے مستغنی کر دیں جیسے پٹرول، اگر دور جدید میں کوئی ریاست ٹیکس عائد نہ کرے تو ہر جانب سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا اور عسکری خطرات پیدا ہوں گے۔

نیز (۶۸۹/۲) میں ہے:

بہر حال وہ ٹیکس جو مذکورہ شرائط کے ساتھ عائد کئے جاتے ہیں اور جن کا

مقصود بجٹ کی ضروریات اور عسکری اقتصادی اور ثقافتی ضروریات کی تکمیل ہواور جن سے مقصود یہ ہو کہ قوم کی تعلیمی اور معاشی ضروریات پوری کی جائیں اور انہیں تمام ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں تو اس کے جواز میں شبہ نہیں کیا جاسکتا بلکہ اسلامی حکومت کے لئے ناگریز ہے کہ وہ مصلحت اور ضرورت کے مطابق ٹیکس عائد کرے۔

قال الدکتور عبدالکریم زیدان فی المدخل لدراسۃ الشریعۃ الاسلامیۃ لہ:ان لولی الامران یفرض فی اموال لاغنیاء الضرائب التی تحتاجھا الدولۃ عندالحاجۃ،کأن یخلوبیت المال ولیس فیہ ماینفق منہ علی الجند ومصالح الدولۃ ونحو ذلک.عن الاعتصام للشاطبی(۱۰۵/۲) والمستصفی للغزالی(۳۰۳/۱)

جواز ٹیکس سے متعلق ایک اہم اصول

کچھ دیگر مسائل کی طرح عادلانہ ٹیکس کے بارے فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ اصل تو اس کا جواز ہے اور ایسے ٹیکس کی ادائیگی بھی ضروری ہے لیکن اس کے جواز کاعلم اپنی حد تک محدود رکھنا چاہئے،حکومتِ وقت اوراس کے اہل کاروں کے سامنے اس کی تشہیر نہیں کرنی چاہیے کہ مبادہ وہ مزید ٹیکس لاگو کریں اور معاملہ ظلم تک پہنچ جائے۔

اسی طرح عادلانہ ٹیکس کوشرعی اصول کے مطابق وصول کرنااور صحیح مصرف پر لگانا نیکی اور ثواب کا کام ہے لیکن اس کی بھی تشہیر نہیں ہونی چاہئے کہ اس بہانے ظلم کادروازہ کھل سکتا ہے۔

فی الدرالمختار(۳۳۶/۲)وھذایعرف ولا یعرف کفاً لمادۃ الظلم.

وفی الشامیة(قوله وهذا یعرف الخ)المشار الیه غیر مذکورفی کلامه واصله فی القنیة حیث قال:وقال ابو جعفرالبلخی:مایضربه السلطان علی الرعیة مصلحة لهم یصیر دینا واجبا وحقا مستحقا کالخراج وقال مشائخنا:وکل مایضربه الامام علیهم لمصلحة لهم فالجواب هکذا حتی اجرةالحراسین لحفظ الطریق و اللصوص ونصب الدروب وابواب السکک وهذا یعرف ولا یعرف خوف الفتنة ثم قال: فعلی هذا مایؤخذ فی خوارزم من العامة لاصلاح مسناة الجیحون اوالربض ونحو ه من مصالح العامة دین واجب لایجوز الامتنا ع منه ولیس بظلم ولکن یعلم هذا الجواب للعمل به وکف اللسان عن السلطان وسعاته فیه لاللتشهیر حتی لا یتجاسروا فی الزیادة علی القدر المستحق.

قلت:وینبغی تقیید ذلک بمااذالم یوجد فی بیت المال مایکفی لذلک لماسیأتی فی الجهاد من انه یکره الجعل ان وجد فیء .

قال الرافعی فی التحریرالمختار(۱/۱۳۹):(قول الشارح وهذا یعرف ولایعرف الخ) وذلک انالو عرفنا الناس ان من قام بتو زیع المظالم المضروبةبالعمل یؤجریتجاسر الناس علی الدخول فی التوظیف بهذا زاعمین العدل کذبا بخلاف ما اذا لم یعرفوا ذلک اذ دینهم یمنعهم من الدخول بهاور بما حصل الکف عن مادة الظلم لعدم من یقوم .

ٹیکس عائد کرنے کی شرائط

اسلام میں جس ٹیکس کی اجازت ہے،اس کی متعدد شرائط ہیں،جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

پہلی شرط: حقیقی احتیاج

پہلی شرط یہ ہے کہ حکومت کو مال کی حقیقی احتیاج ہو اور اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ آمدن نہ ہو یا وہ ناکافی ہو کیونکہ مال میں اصل اساس حرمت (احترام مالِ غیر) ہے اور بلا ضرورت شدیدہ اور سخت احتیاج کے کسی کی شخصی ملکیت پر دست درازی درست نہیں ہے یعنی اگر حکومت کے پاس مال موجود ہو یا اس کے پاس حصول سرمایہ کے ذرائع موجود ہوں تو ٹیکس لگانا جائز نہیں ہے،اسی طرح اگر حقیقی احتیاج محقق تھی اور ٹیکس لگادیا گیا،بعد میں احتیاج ختم ہوگئی اوردوسرے ذرائع آمدن دستیاب ہوگئے تو عوام الناس سے ٹیکس ختم کرنا ضروری ہے۔

بعض فقہاء نے اس شرط کی بڑی سخت تاکید کی ہے اوران کے نزدیک جب تک سرکاری خزانہ بالکل خالی نہ ہوجائے ٹیکس لگانادرست نہیں ہے اوراس شدت کا مقصود یہ ہے کہ حکام جائز ناجائز ٹیکس لگا کر اسراف سے کام نہ لیں۔

تاریخ اسلامی میں فقہائے اسلامی کی عزیمت کے درخشاں ابواب موجود ہیں کہ انہوں نے حکام کو ناجائز ٹیکس عائد کرنے سے روکااور اس سلسلے میں سختی برتی۔

چنانچہ شاہ مصر قطر ملک ناصر کے ایماء پر تاتاریوں سے جنگ کے لئے لشکر تیار کرنا چاہاتواس نے مشورہ کے لئے قاضیوں اور فقہاء کو جمع کیا،فقہاء اور علماء میں شیخ

عزالدین بن عبدالسلامؒ اور قاضی بدرالدین بخاریؒ بھی تھے،شیخ عزالدین بن عبدالسلامؒ نے اس موقع پر کہا کہ بلادِ اسلام پر دشمن حملہ آور ہو تو بلاشبہ اسلامی حکومت پر جہاد فرض ہے اور بیت المال خالی ہو اور بادشاہوں کے پاس عطیات اور صلہ خدمات کے طور پر دی جانے والی تھیلیاں بھی نہ ہوں تو رعایا سے اخراجات جہاد لینا درست ہے لیکن مال موجود ہونے اور آلات فاخرہ موجود ہونے کی صورت میں لوگوں سے مال لینا درست نہیں ہے۔

شام میں ظاہر بیبرس نے تاتاریوں سے مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا تو بیت المال میں ان وسیع اخراجات کی گنجائش نہ تھی تو اس نے علمائے شام سے ٹیکس لگانے کے بارے میں فتوی طلب کیا،علماء نے مصلحت و ضرورت کے پیش نظر عارضی ٹیکس لگانے کی اجازت دے دی،اس وقت امام نووی رحمۃ اللہ علیہ موجود نہیں تھے،بادشاہ نے انہیں بلوایا اور کہا کہ اس فتوی پر تم بھی دستخط کردو،امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے انکار کیا تو سلطان نے سبب دریافت کیا،اس پر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم ایک بندوق دار تھے اور تمہارے پاس کچھ نہیں تھا پھر خدا نے تمہیں بادشاہ بنادیا،اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا ایک ہزار غلام ہے اور ہر غلام کے پاس سونے کی تھیلی ہے اور تمہارے پاس دوسو باندیاں ہیں اور ہر باندی کے پاس زیورات کی پوٹلیاں ہیں،یہ سارا مال جہاد کی تیاریوں میں صرف کرلوگے تب میں فتوی دوں گا کہ اب رعایا سے ٹیکس لینا جائز ہے،یہ سن کر ظاہر بیبرس امام نووی رحمۃ اللہ علیہ سے ناراض ہوگیا اور انہیں دمشق سے نکال دیا اور آپ نوی چلے گئے۔

بعدازاں بیبرس نے دمشق آنے کی اجازت دے دی لیکن امام نووی رحمہ

اللہ نے فرمایا کہ جب تک ظاہر وہاں موجود ہے میں وہاں نہیں جاؤں گا،ظاہر ایک ماہ بعد ہی مر گیا۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے سلطان ظاہر بیبرس کو یہ خط لکھا کہ جب تک بیت المال میں سرمایہ موجود ہے اوحکومت کے پاس زمین موجود ہے،رعایا سے ٹیکس لیناجائز نہیں ہے ،اس وقت بیت المال میں سرمایہ موجو دہے،لہٰذاآپ شرعاًرعایاپرٹیکس نہیں لگاسکتے۔

اس شرط کاحاصل یہ نکلا کہ ٹیکس لگانااس وقت جائز ہے جبکہ بیت المال خالی ہویااس میں کچھ مال ہولیکن مصارف وضروریات کیلئے ناکافی ہو۔

قال الشیخ کما ل بن همام فی فتح القدیر(۵/ ۴۳۲) تحت قول صاحب الهدایه:ومن ضمن عن آخر خراجه ونوائبه....واماالنوائب فان ارید بها بحق الخ اذا لم یکن فی بیت المال شئی....لانها واجبة علی کل مسلم موسر بایجاب طاعة ولی الامرفیما فیه مصلحة المسلمین ولم یلزم بیت المال اولزمه ولا شئی فیه.

وقال صاحب العنایة:وماوظف الامام لتجهیزالجیش وفداء الاساری بان احتاج الی تجهیز الجیش لقتال المشرکین اوالی فداء اسری المسلمین ولم یکن فی بیت المال مال فوظف مالا علی الناس لذلک الخ

وفی القنیة(ص ۱۷۲)کتاب الکراهیة والاستحسان وقیل ماحتاج الیه السلطان لتجهیزالجیش لقتال المشرکین اواحتاج الیه لفداء

اسری المسلمین فیوظف علیهم مالا فهی النائبة.

وفی الدر(۳۳۶/۲) وتصح الکفالة بهاالخ وفی الشامیة(قوله وتصح الکفالة بها) ....ان احتاج الی ذلک ولم یکن فی بیت المال شئی وقال بعد اسطر:قلت:وینبغی تقیید ذلک بما اذا لم یوجد فی بیت المال مایکفی لذلک لما سیأتی فی الجهاد من انه یکره الجعل ان وجد فیء.

فی الدرایضا(۴۴۱/۶)فصل فی الشرب،وکری نهر غیر مملوک من بیت المال فان لم یکن لمه ای فی بیت المال شئی یجبر الناس علی کریه ان امتنعوا عنه دفعا للضرر.

وفی الشامیة(قوله من بیت المال) خبر المبتداء ای مال الخراج والجزیة دون العشروالصدقة لان الثانی للفقراء والاول للنوائب هدایه، (قوله یجبرالناس) ای الذین یطیقون الکری ومؤنتهم من مال الاغنیاء الذین لا یطیقونه،قهستانی .

دوسری شرط: ٹیکسوں کے وزن کی منصفانہ تقسیم

اگر حکومت کو سرمایہ کی ضرورت ہواور ٹیکس کے ماسوا حصول سرمایہ کا کوئی ذریعہ نہ ہوتو ٹیکس لگانا جائز ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ٹیکس کے بارکولوگوں میں منصفانہ طریقے پر تقسیم کیاجائے کہ کسی پر زیادتی اور ظلم نہ ہو۔

واضح رہے کہ اس مقام پر عدل و انصاف سے مراد مساوات نہیں ہے کیونکہ دومختلف درجے کے لوگوں میں مساوات انصاف نہیں ہوتا،ظلم ہوتاہے؛یہاں پر تقاضائے انصاف یہی ہے کہ ہر اجتماعی اور اقتصادی طبقے کے لوگوں سے ان کی

حیثیت کے مطابق ٹیکس لیا جائے، اسلامی تاریخ اور مسلم حکمرانوں کا طرز عمل بھی اسی کی نشاندہی کرتا ہے۔

چنانچہ ابو عبیدؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبطیوں سے زیتون کے تیل اور گیہوں پر تو نصف عشر (۱/۲۰) لیا کرتے تھے تا کہ مدینہ میں یہ سامان زیادہ مقدار میں پہنچے اور دوسرے دانوں اور دالوں پر دسواں حصہ لیا کرتے تھے۔ کتاب الاموال (۵۳۳)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہلِ حرب تاجروں پر دسواں حصہ، ذمی تاجروں پر بیسواں حصہ اور مسلمان تاجروں پر چالیسواں حصہ مقرر فرمایا تھا۔ (ایضاً)

ایک شہر سے دوسرے شہر سامان کی منتقلی پر چنگی لی جاتی، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مستامنین سے عشر (۱/۱۰) (معاملہ مثل) کے اصول پر کیا کرتے تھے کیونکہ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تحریر کیا تھا کہ غیر مسلم، مسلمان تاجروں سے عشر لے رہے ہیں۔ الخراج لیحیی بن آدم (ص ۱۷۲)

اور آپ ذمیوں سے نصف عشر (۱/۲۰) اس لئے لیا کرتے تھے کہ ان سے اسی پر صلح ہوئی تھی۔ کتاب الاموال (۵۳۳) ان سے یہ شرح سامان کی ایک شہر سے دوسرے شہر منتقلی کے وقت وصول کی جاتی جبکہ مسلمان شہر میں رہتے ہوئے بھی اپنے سامانِ تجارت کی زکوۃ دیتا، نیز ذمیوں سے ان کے پھلوں فصلوں، مویشی اور دیگر اموال پر کوئی مطالبہ نہیں تھا اور نصاریٰ بنی تغلب سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مخصوص معاملہ کے ساتھ صلح کی تھی۔

نبطیوں سے عشر لیا جاتا تھا جیسا کہ سائب بن زیدؓ کہتے ہیں کہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بازار مدینہ کا عامل تھا اور ہم اس وقت نبطیوں سے عشر لیا کرتے تھے لیکن بعد ازاں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس مقصد کے پیشِ نظر کہ مدینہ میں غذائی اشیاء زیادہ پہنچیں، نبطیوں پر عشر (۱/۱۰) کم کر کے ۵ فیصد ٹیکس عائد کر دیا تھا۔ اور یہ وہ اصول ہے جو محصولات میں آج کی جدید ریاستیں بھی اختیار کرتی ہیں کہ اشیاء کی رسد بڑھانے کے لئے یا وطنی مصنوعات کے تحفظ کیلئے یا آسائشات کی درآمد میں کمی کیلئے محصولات میں کمی بیشی کردی جاتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ عمل کہ آپ نے مدینہ میں غذائی اشیاء کی فراہمی کو بڑھانے کیلئے ۱۰٪ کو ۵٪ کر دیا ہمارے لئے مصالح کے پیش نظر ٹیکسوں کی شرح کم وبیش کرنے کی دلیل فراہم کرتا ہے، کیوں کہ اسلام کے اجتماعی اور اقتصادی مقاصد یہ ہیں کہ ثروت چند ہاتھوں میں جمع نہ ہو، اسی لئے اسلام نے ایسے طریقے اختیار کئے ہیں جن سے بڑی دولتیں تقسیم ہوتی رہیں، بڑے بڑے فرق دور ہوتے رہیں اور دولت امراء کے درمیان ہی گردش نہ کرتی رہے۔

اگر دولت وغربت کے فاصلے کو کم کرنے کیلئے تصاعدی ٹیکس کے سوا کوئی اور ذریعہ باقی نہ رہے تو اسلام اس کی تائید کرے گا تا کہ مالدار ایک درجہ نیچے آئے اور غریب ایک درجہ اوپر ہو جائے لیکن اس میں وہ شخصی رعایتیں ضرور مدِنظر رکھی جائیں جو کہ عائلی اخراجات اور قرضوں کو مستثنیٰ کرتی ہیں۔

تیسری شرط: ٹیکس مصالح امت میں صرف کئے جائیں

ٹیکس حق وانصاف کے ساتھ لگائے جائیں اور انہیں مصالح امت اور ملک وملت کی واقعی اور حقیقی ضروریات میں صرف کیا جائے، لہو ولعب میں اور حکمرانوں کی آسائشوں پر صرف نہ کیا جائے۔ قرآن کریم نے مصارفِ زکوۃ اس وضاحت کے ساتھ اسی لئے بیان فرمائے ہیں کہ حکمرانوں کو اس میں من مانی کرنے کا کوئی حق باقی نہ رہے، خلفائے راشدین زکوۃ وغیرہ سے حاصل شدہ سرمائے کو بڑی جزرسی کے ساتھ مصالح امت ہی پر صرف کرتے رہے، چنانچہ خلافت راشدہ اور بعد کے ملک عضوض میں یہی فرق ہے، روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ میں بادشاہوں یا خلیفہ؟ تو حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اگر آپ کے پاس ایک درہم محصول میں آئے اور آپ اسے بلاحق صرف کردیں تو آپ بادشاہ ہیں، اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آبدیدہ ہوگئے۔ طبقات ابن سعد (۳/۳۰۶، ۳۰۷)

سفیان بن ابی العوجاؒ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے استفسار کیا کہ میں خلیفہ ہوں یا بادشاہ؟ اگر میں بادشاہ ہوں تو یہ بڑی مصیبت ہے، کسی نے کہا امیر المومنین خلیفہ جو لیتا ہے وہ حق کے ساتھ لیتا ہے اور حق کے ساتھ صرف کرتا ہے، آپ بحمد اللہ ایسے ہی ہیں، جب کہ بادشاہ زیادتی کرکے لیتا ہے اور زیادتی کر کے صرف کرتا ہے، اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خاموش

ہوگئے۔(ایضاً)

تاریخ طبریؒ وغیرہ میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کسی رشتہ دار نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کچھ طلب کیا،آپ نے اسے سرزنش کر کے باہر نکال دیا،جب آپ سے اس بارے میں پوچھا گیاتو آپ نے فرمایا کہ یہ مجھ سے اللہ تعالیٰ کے مال میں سے مانگ رہاتھا،اگر میں اس کو دے دیتا تو اللہ کے سامنے کیا عذر پیش کرتا؟ کیا میں خائن بادشاہ نہیں ہوں گا؟(تاریخ طبری ۱۹/۵)

چوتھی شرط: اہلِ شوریٰ اور امت کی رائے کا اتفاق

امام (سربراہِ مملکت) کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ ازخود بغیر ارباب حل وعقد کے مشوری کے ٹیکس عائد کردے چہ جائیکہ یہ اختیاراس کے کسی کارندے (وزیرخزانہ وغیرہ) کو ہو، کیونکہ مال کی اصل اساس حرمت ہے اور اصلاً ذمے داریوں سے بری الذمہ ہوناہے البتہ جب مصلحت وضرورت اس امر کی متقاضی ہو کہ جن کے پاس مال ہے اس سے مال لیاجائے تو اہلِ حل وعقد کے مشورے کے ساتھ اور تمام شرائط کوملحوظ رکھتے ہوئے اورماہرین کی آراء حاصل کرکے ٹیکس لگایاجاسکتا ہے۔

شوریٰ کاقرآن وسنت سے وجوب۔

اس کی تائید قرآن اورسنت سے ہوتی ہے،قرآن کریم مشوری کواسلامی معاشرے کی ساخت کی اساس قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

والذین استجابوالربهم واقامواالصلوة وامرهم شوری بینهم ومما

رزقنهم ينفقون(الشوری:۳۸)

اور جنہوں نے اپنے رب کا حکم مانا اور نماز قائم کی اور ان کا کام آپس کے مشورہ سے ہوتا ہے اور ہمارے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اس آیت میں قرآن نے شوریٰ کو استجابت لرب، اقامت صلوۃ اور انفاق کا قرینہ قرار دیا ہے اور یہ مکی آیات ہیں جن میں اصول و عقائد بیان کئے گئے ہیں اور مدح و ثنا، اور مذمت و سرزنش کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے جب کہ مدنی قرآن میں بیان احکام کا اسلوب ہے، مدنی قرآن میں فرمایا گیا۔

وشاور هم فی الامر فاذا عزمت فتوكل على الله ٥

(الِ عمران: ۱۵۹)

اور ان سے معاملات میں مشورہ لیں پھر جب آپ ایک بات کا عزم کر چکے تو اللہ پر بھروسہ کریں۔

یہ آیت غزوہ احد کے بعد نازل ہوئی جس میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہؓ سے مشورہ فرمایا کہ مدینہ منورہ میں ہی رہ کر مقابلہ کیا جائے یا باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے، اکثر صحابہ کرامؓ نے یہی رائے دی کہ باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے، آپ ﷺ کی رائے یہ نہیں تھی لیکن آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مشورہ کو ترجیح دی اور باہر نکل کر مقابلہ کیا جس میں ستر صحابہ شہید ہوئے لیکن اس کے باوجود آیت میں شوریٰ کی تاکید کی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام اہم معاملات میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مشورے فرمائے، چنانچہ بدر کے موقعہ پر صحابہ کرامؓ سے مشورہ

فرمایااور مہاجرین ہی کی رائے پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ انصار سے بھی رائے لی اور لشکر کے پڑاؤڈالنے کے بارے میں حباب بن المنذرؓ کی رائے اختیار فرمائی،اسی طرح آپ ﷺ نے احد اور خندق کے موقع پر مشورہ فرمایا،اور خندق کے موقع پر یہ مشورہ کیا کہ مدینہ کے ایک تہائی پھلوں پر اضراب سے صلح کرلی جائے جس کا سعد بن معاذاور سعد بن عبادہؓ نے مشورہ نہیں دیااورآپ نے اس رائے کوترک کردیا۔

یوم حدیبیہ کے موقع پر مشرکین کے بچوں کے بارے میں مشورہ کیااور صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا ہم کسی کے قتال کے لئے نہیں آئے بلکہ عمرہ کے لئے آئے ہیں،آپ ﷺ نے اس رائے کو قبول فرمایا،اور واقعہ افک میں صحابہ کومخاطب کر کے فرمایا کہ مجھے میرے گھروالوں کے بارے میں تہمت سے متعلق مشورہ دواور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضرت عائشہؓ کو جدا کرنے کے بارے میں مشورہ کیا۔تفسیرابن کثیر(۱/۴۲۰)

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ان تمام مشوروں کو ذکر کر کے لکھا ہے کہ آپ جنگوں وغیرہ میں مشورہ کیا کرتے تھے،تاہم فقہاء کااس بارے میں اختلاف ہے کہ اس مشورہ پر عمل واجب تھایا آپ ﷺ تطییب قلوب کے لئے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔(ایضاً)

اس آیت میں شوریٰ کاحکم بالکل واضح ہے اور امر کے صیغے میں ہے،اس لئے مسلمان امراء اور حکام پر مشورہ کی اتباع لازم ہے بالخصوص جب کہ مسلمانوں کی طویل تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں پر بہت سے مصائب مستبد(مشورہ نہ کرنے والے) حکمرانوں کے استبداد کی بناپر آئے ہیں۔

کیا حکام شوریٰ کے پابند ہیں؟

بلاشبہ حکام شوریٰ کے پابند ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشورہ کے بعد صحابہ کی رائے پر عمل فرماتے اور جب آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ عزم کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اہل الرائے سے مشورہ کر کے ان کی اتباع کرنا۔(ایضا)

اگر شوریٰ لازم نہ ہو تو اس کی کوئی قیمت ہی باقی نہیں رہتی، ایسا مشورہ متبد حکمرانوں کے لئے ایک ذریعہ مذاق بن جائے گا کہ وہ امت سے مشورہ کر کے اپنی استبدادی رائے پر عمل کریں گے، جیسا کہ عورتوں کے بارے میں حدیث گھڑی ہوئی ہے کہ ان سے مشورہ کرو مگر انکے مشورہ پر عمل نہ کرو، یہ بالکل غلط ہے اور قرآن صریحا اس کے خلاف کہتا ہے، بلکہ امت کے اہل حل وعقد کا فرض ہے کہ وہ حکمرانوں کو اس امر کا پابند کریں کہ وہ ہر اہم معاملہ میں مشورہ لیں اور اکثریتی رائے کو قبول کریں، کیونکہ معاہدہ حکمرانی بھی اسی بنیاد پر طے پایا ہے اور اس معاہدہ کی شرط مشورۂ امت کو تسلیم کرنا ہے۔

اس آیت میں شوریٰ کو بعض معاملات کے ساتھ خاص نہیں کیا گیا ہے بلکہ ایک عمومی حکم ہے جس میں جہاں صلح و جنگ اور بین الاقوامی معاملات شامل ہیں وہاں لامحالہ ٹیکس عائد کرنے کا مسئلہ بھی شامل ہے، کیونکہ ٹیکس بہت سے دور رس اثرات کا حامل ہوتا ہے، اسی لئے جمہوری حکومتوں میں عوام نمائندوں کی رائے ضرور لی جاتی ہے اور اس کے بعد ٹیکس میں کوئی ردوبدل نہیں کیا جاتا ہے۔

فقہ الزکوۃ (۶۷۶/۲ تا ۶۸۳) بتغیر

پانچویں شرط

صرف بقدرِ ضرورت ٹیکس لگایا جائے، ضرورت سے زیادہ ٹیکس لگانا جائز نہیں ہے، ہم پہلے ٹیکس کے جواز کے دلائل بیان کرتے ہوئے عرض کر چکے ہیں کہ ٹیکس شرعی حکم نہیں ہے، محض ایک قانونی چیز ہے اور شریعت نے اسے ضرورت سمجھ کر اجازت دی ہے اور شرعی ضابطہ اور اصول یہ ہے کہ جو چیز ضرورت کی وجہ سے لاگو کی جائے تو ضروری ہے کہ وہ بقدرِ ضرورت لاگو کی جائے۔

فی الاشباہِ والنظائر(۱/۲۵۲)مع الحموی،القاعدۃ الخامسۃ ،الضرر یزال .مابیح للضرورۃ فیقدربقدرِھا ولذا قال فی ایمان الظھیریۃ :ان الیمین الکاذبۃ لا تباح للضرورۃ وانما یباح التعریض انتھی یعنی لا ندفاعھابالتعریض وفیہ ایضا بعد اسطر:یقرب من ھذہ القاعدۃ ماجاز بعذر بطل بزوالہ.

وفی شرح المجلۃ للاتاسی(۱/۵٦)المادہ ۲۲،الضرورت تقدر بقدرھا یعنی کل فعل اوترک جوز للضرورۃ فالتجویزعلی قدرھا ولایتجاوز عنھافمن اصابتہ مخمصۃ فاضطر لاکل المیتۃ اومال الغیرعلی ان یضمن مثلہ اوقیمتہ یتناول مقدارمایسد الرفق لدفع الھلاک.

وفیہ ایضاً(۱/۹۵) المادۃ ۲۳ ماجازلعذر بطل بزوالہ.

چھٹی شرط

ٹیکس کی مقدار اتنی ہو کہ لوگوں کے لئے قابلِ برداشت وتحمل ہو،عوام الناس

پر نا قابلِ برداشت ٹیکس لگانااوران کواس کے بوجھ تلے دبانا ناجائز اورحرام ہے۔

قال الله تعالیٰ: لایکلف الله نفسا الا وسعها (سورة البقرة الآية الاخيرة)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ حجۃ اللہ البالغہ (۱/۴۵) باب سیاسۃ المدینۃ، میں بھاری ٹیکسوں کو معاشی تباہی کا زینہ اور ملک کی تباہی کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وغالب سبب خراب البلدان في هذا الزمان شيئان....الثاني ضرب الضرائب الثقيلة على الزارع والتجار المتحرفة والتشديد عليهم حتى يفضي الى اجحاف المطاوعين واستئصالهم والى تمنع اولى باس شديد وبغيهم.

اس زمانے میں ملکوں کی خرابی اورتباہی کے عمومی اسباب دو ہیں..... دوسرا سبب زمینداروں، کاشتکاروں اور اہلِ حرفت پر بھاری قسم کے ٹیکس لگانا ہے پھر طرہ یہ ہے کہ انکے وصول کرنے میں لوگوں پر تشدد اورسختی کی جاتی ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فرماں بردار اور اطاعت گزار لوگ ٹیکسوں کے بوجھ تلے دب جاتے ہیں اورانکی بیخ کنی اور معاشی حالت زبوں تر ہو جاتی ہے حتی کہ طاقتور لوگ مجبور ہوکر ٹیکس دینا چھوڑ جاتے ہیں اور بغاوت پر اتر آتے ہیں۔

اس کے بعد ٹیکسوں کی مقداراورتخفیف کے بارے فرماتے ہیں:

وانما تصلح المدينة بالجباية اليسيرة واقامة الحفظة بقدر الضرورة فليتنبه اهل الزمان لهذه النكتة.

یقیناً شہر اور ملک کی بہتری اسی میں ہے کہ ٹیکس کم اور ہلکے ہوں اور ملازمین حکومت کی تعداد بقدر ضرورت ہو، ہمارے زمانے کے اہلِ اقتدار کو اس نکتہ پر خوب غور وفکر کرنا چاہئے۔

ٹیکسوں کی مقدار قابلِ برداشت اور حتی الامکان ان میں تخفیف پیدا کرنے کی شرط انتہائی اہم ہے، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بقول بھاری ٹیکسوں کے عائد کرنے کے پیچھے شاہانہ اخراجات، دولت کا بے دریغ استعمال اور vip کلچر کار بند ہوتی ہے، ملک وملت کی خوشحالی، ترقی اور عوام الناس کی آسودہ حالی کیلئے ضروری ہے کہ حکومت اپنے اخراجات بقدرِ ضرورت کرے۔

ساتویں شرط

ٹیکس وصول کرنے کا طریقہ کار آسان ہو، لوگوں کیلئے ایذاء رسانی اور تکلیف دہی کا باعث ہرگز نہ ہو۔

فی البدور البازغة(۸۵/۱)ولیراع الامام فی ذلک العدل ولیجتنب الجور والاعتساف والمصادرة.

امام وقت کو اموال اور ٹیکس جمع کرنے میں عدل وانصاف سے کام لینا چاہیے اور ظلم، ناانصافی، غصب اور جبر سے پرہیز کرنا چاہئے۔

عوام کی سہولت کے پیش نظر ٹیکس کا الگ محکمہ بنانا اور ٹیکس وصول کرنے کیلئے ملازمین اور عملہ کا تقرر بھی شرعاً درست ہے۔

فی حجة الله البالغة(۱۵۰/۲)ثم ان الامام لما کان لایستطیع بنفسه ان یباشرجبایة الصدقات واخذ العشور وفصل القضاء فی کل

ناحية وجب بعث العمال والقضاة.

البتہ یہ ضروری ہے کہ ٹیکس ملازمین، عملہ اورعاملین دیانت دار، نرم دل اور رشوت سے اجتناب کرنے والے ہوں، امام وقت پرلازم ہے کہ ان کیلئے ضابطہ اخلاق مرتب کرے اور انہیں عوام الناس پرظلم وستم کرنے سے باز رکھے، ٹیکسوں کی وصولیابی اورگوشواروں کے جمع کرنے کے سلسلے میں جھوٹ، دروغ گوئی اوررشوت کااحتمال غالب رہتاہے، حکومت کواس کی کڑی نگرانی کرنا لازم ہے۔

فی حجة الله البالغة(۲/۱۵۰)ثم وجب ان یؤمر العامل بالتیسر وینهی عن الغلول والرشوة وان یؤمرالقوم بالانقیادله لیتم المصلحة المقصودة.

جیساکہ اس بحث کی ابتداء میں عرض کیا گیاتھا کہ بعض حضرات مسلمانوں پرکسی قسم کےٹیکس عائدکرنے کے جواز کے قائل نہیں ہیں اور اگرکسی ملک نے ٹیکس لگایاتومسلمانوں پر اس کی پابندی لازم نہیں ہے، ان حضرات نے کئی دلائل پیش فرمائے ہیں۔

دلائل عدم جواز

دلیل اول

ٹیکس زمانہ جاہلیت میں رائج تھا، اسلام نے آکرٹیکس منسوخ کر دیااوراس کی جگہ زکوۃ وعشرکاعادلانہ نظام مقرر فرمایاجوکہ مسلمانوں کے حق میں عبادت بھی ہے اور ایک لحاظ سے اسے ٹیکس بھی کہاجاسکتاہے، لہٰذا زکوۃ وعشر نے ٹیکسوں سے مستغنی

کردیا ہے، زکوۃ وعشر کی موجودگی میں ٹیکس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی، ٹیکس کے منسوخ ہونے کی روایات پہلے آچکی ہیں۔

دلیل ثانی

سابق میں کئی احادیث نقل کی جاچکی ہیں جن میں خود ٹیکس لگانے والے اوروصول کرنے والے کی شدید مذمت کی گئی ہے حتی کہ اسے گناہ کبیرہ، فسق وفجور کہا گیا ہے، بعض احادیث میں اسے زنا سے بدتر اور بعض میں اس کے مرتکب کو جہنمی کہا گیا ہے، بعض میں اسے قتل کرنے کا حکم ہے، بعض میں ہے کہ اس کی مغفرت نہ ہوگی اور بعض میں ٹیکس والے کی بدترین سزا کا ذکر آیا ہے، یہ تمام احادیث اس بات کی دلیل ہیں کہ مسلمانوں پر ٹیکس لگانا جائز نہیں ہے اور مسلمان اس کی ادائیگی کے بھی پابند نہیں۔

دلیلِ ثالث

شرعی اصول ہے کہ "لیس فی مال المسلم حق سوی الزکوۃ" یعنی مسلمان کے مال میں زکوۃ کے علاوہ کوئی حق نہیں ہے اوراس اصول کی بنیاد فاطمہ بنتِ قیسؓ کی روایت کردہ وہ حدیث ہے جو پہلے سنن ابن ماجہ (ص ۱۲۸) کتاب الزکوۃ،باب ماادی زکوتہ لیس بکنز کے حوالے سے نقل کی جا چکی ہے "لیس فی المال حق سوی الزکوۃ" اس لئے مسلمانوں پرکسی قسم کا ٹیکس لگانا جائز نہیں ہے۔

دلیلِ رابع

اسلام نے شخصی ملکیت کا احترام کیا ہے اور ہر شخص کے جان ومال اورعزت کے تحفظ کی ضمانت دی ہے،چنانچہ کنزالعمال(۴/ ۴۱۶) میں مسند احمد اور صحیح ابن حبان کے حوالے سے بروایت سعید بن زیدؓ یہ حدیث مروی ہے قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:من قتل دون مالہ فھوشھیدومن قتل دون دینہ فھو شھید ومن قتل دون اھلہ فھو شھید رقم الحدیث ۱۱۱۸۰

یعنی جو اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہوا تووہ شہید ہے،اسی طرح اپنی جان اوراہل وعیال کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہواتووہ بھی شہید ہے۔

اسی طرح سنن ابی داؤدمیں حضرت حذیفہ الر قاشیؓ کی روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشادفرمایا:

لایحل مال امرأ مسلم الابطیب نفس منہ.کنزالعمال(۱/ ۹۲) رقم الحدیث ۳۹۷الفرع الثانی فی احکام الایمان المتفرقۃ.

یعنی کسی بھی مسلمان شخص کا مال ومتاع اس کی دلی خوشی کے بغیر حلال نہیں ہے۔

ان حضرات کااستدلال یہ ہے کہ شخصی ملکیت کے احترام کے برعکس ٹیکس میں مسلمانوں سے جبراً مال لیاجاتا ہے اورکوئی بھی اس کے دینے پر دل سے راضی نہیں ہوتا،اس لئے مسلمانوں پرٹیکس لگاناجائزنہیں اوروہ اس کی ادائیگی کے بھی پابند نہیں ہیں۔

جوابات

دلیلِ اول کا جواب

زمانہ جاہلیت میں ظالمانہ ٹیکس رائج تھا اور اسلام نے اس ظالمانہ وجابرانہ ٹیکس کو ختم کیا ہے، جہاں تک عادلانہ ومنصفانہ ٹیکس کا تعلق ہے جس کے بارے بحث ہو رہی ہے تو یہ زمانہ جاہلیت میں رائج رہا ہے اور نہ عہدِ نبوی اور اس کے بعد کے زمانوں میں، لہٰذا اس بارے میں شریعت نے نہ ثبوتاً حکم لگایا ہے اور نہ نفیاً یعنی قرآن وسنت نے نہ اسے صراحۃً جائز کہا ہے اور نہ حرام اور ناجائز، لہٰذا اسے اصول شرعیہ کی روشنی میں دیکھا جائے گا اور ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ منصفانہ ٹیکس اصولِ شرعیہ سے متصادم نہیں ہے، چند شرائط کے ساتھ اس کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

یہ بات کہ اسلام نے ظالمانہ ٹیکس کو منسوخ کیا ہے اور زمانہ جاہلیت میں نیز عہدِ نبوی میں کفار کے ہاں ظالمانہ ٹیکس رائج تھا، اس کی تصریح تقریباً سب محدثین، شارحین اور فقہاء کرام کرتے ہیں۔

قال الشیخ المفتی محمد تقی العثمانی فی تکملة فتح الملھم (۴۵۲/۲) المکس بفتح المیم والمکس دراھم کانت توخذ من بایعی السلع فی الجاھلیة والفاعل:الماکس کذا فی جمھرة اللغة لا بن درید (۴۶/۳)وقال ابن الاعرابی:المکس دراھم کان یأ خذ ھا المصدق بعد فراغه کما فی لسان العرب لا بن منظور(۱۰۵/۸)،واصل المکس النقص فکان الماکس اذا اخذ درھما،انتقص من ثمن السلعة.

قال الشیخ خلیل احمد السھانفوری رحمہ اللہ فی بذل المجھود(۱۱۸/۴)کتاب الخراج تحت حدیث " لایدخل الجنۃ صاحب مکس،،:قال فی النھایۃ:المکس الضریبۃ اللتی یأخذ ھاالماکس وھوالعشارلان الغالب فیہ الظلم فالامیریستحق النارباٖمرہ بذلک والعشاریستحق النار باعانتہ فی ذلک،قال فی القاموس:مکس فی البیع بمکس اذا جبامالا والمکس النقص والظلم ودراھم کانت تؤخذ من بائع السلع فی الاسواق فی الجاھلیۃ اودراھم کان یأخذھا المصدق بعد فراغہ من الصدقۃ.

قال فی الحاشیۃ:الماکس من العمال من ینقص من حقوق المساکین لایعطیھا کاملابتمامھا واما من یأخذ الصدقۃ والعشر بحق ففیہ اجر وھو مثاب.

دلیلِ ثانی کے جوابات

اس دلیل کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

جواب اول

دلیل اول اوردلیل ثانی کا مآل ایک ہی ہے،دلیل اول یہ تھی کہ اسلام نے زمانہ جاہلیت کے ٹیکس کومنسوخ کردیاہے،دلیل ثانی میں ان احادیث کاحوالہ ہے جن میں زمانہ جاہلیت کے ٹیکس کومنسوخ کیا گیاہے،لہذا دونوں دلیلوں کا مآل ایک ہی ہوا اور اس کاجواب آگیا کہ مذکورہ احادیث میں "مکس" یعنی ٹیکس سے مراد وہ ظالمانہ

ٹیکس ہیں جو اسلام سے پہلے دنیا میں مروج تھے کہ یہ ٹیکس بغیر حق کے لئے جاتے اوران کے مصارف میں عدل وانصاف کوملحوظ نہ رکھا جاتا تھا۔نیز یہ کہ وہ ٹیکس شہریوں کی قدرت واستطاعت سے زیادہ ہوتے اور ملی مصالح پر خرچ ہونے کی بجائے بادشاہوں کی عیش وعشرت پرخرچ ہوتے تھے۔

قال ابن نجیم فی البحرالرائق(۲/۲۳۱) باب العاشر:وفی التبیین :ان هذاالعمل مشروع وما ورد من ذم العشار محمول علی من یاخذ اموال الناس ظلما کما تفعله الظلمة الیوم .

علامہ ابن نجیمؒ "کتاب التبیین" سے نقل کرتے ہیں کہ جن احادیث میں عشار (ٹیکس وصول کنندہ لوگوں) کی مذمت آئی ہے ان میں عشار سے مراد وہ لوگ ہیں جوظلماً لوگوں سے ان کا مال لیں۔

فی الدرالمختار(۲/۳۱۰) باب العاشر،وما ورد من ذم العشار محمول علی الاخذ ظلماً.

صاحب الدرالمختار فرماتے ہیں کہ جن احادیث میں ٹیکس وصول کرنے والوں کی مذمت آئی ہے اس سے مراد ظلماً لوگوں کا مال لینا ہے۔

وفی تبیین الحقائق شرح کنزالدقائق(۱/۲۸۲)باب العاشر، وانما ینصبه لیامن التجار من اللصوص ویحمیهم منهم فیأخذ الصدقات من الاموال ...والاخذ یحمله علی الحمایة فیشرع وماورد من ذم العشار محمول علی من یاخذ اموال الناس ظلماً کما یفعله الظلمةالیوم.

جواب ثانی

مذکورہ احادیث میں ”صاحب مکس“ اور ”عشار“ سے مراد ظالم و خائن عامل زکوۃ ہے یعنی وہ عامل زکوۃ ہے جو لوگوں پر ظلم اور تعدی کرے اور ان سے ناحق اموال وصول کرے یا وہ عامل مراد ہے جس کے پاس زکوۃ کے اموال ورقوم جمع جائیں تو ان میں خیانت کر کے کچھ خود رکھ لے، نیز خیانت میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ عامل اپنے جاننے والوں سے کم زکوۃ وصول کرے یا بعض لوگوں سے رشوت لے کر ان کے اموال اور گوشوارے کم ظاہر کرے۔

قال الملا علی القاری فی المرقاۃ(۷/ ۲۲۱) تحت حدیث ”لایدخل الجنة صاحب مکس“ یعنی الذی یعشر الناس(قوله صاحب مکس) بفتح اوله، ....فی النھایة:ھوالضریبة التی یأخذ ھا الماکس وھو العشار، (یعنی)ای یرید النبی صلی الله علیه وآله وسلم بصاحب المکس (الذی یعشر الناس) بفتح الیاء وسکون العین وضم السین وفی نسخة من باب التفعیل،ففی المصابیح یقال:عشرت المال عشرامن باب قتل وعشورا اخذت عشره وعشرت القوم عشرا من باب ضرب،صرت عاشرھم وعشرھم یعشرھم عشراوعشورا وعشرھم اخذ عشر اموالھم والعشار قابضه وقال الجزری:ھذا التفسیر من محمد بن اسحاق بن مندة وفی شرح السنة:اراد بصاحب المکس الذی یأخذ من التجار اذا مروامکسا باسم العشر فاما الساعی الذی یأخذ الصدقة ومن یأخذ من اھل الذمة العشر الذی صولحوا علیه فھو محتسب مالم یتعد فیأثم

بالتعدی والظلم .

حاصل یہ کہ صاحب مکس سے مراد لوگوں سے عشر وزکوۃ لینے والا ہے، اگر وہ ظلم اور تعدی کرتا ہے تو سخت گناہگار ہے اور احادیث وعید کا مصداق یہی ہے اور اگر جائز طریقہ سے زکوۃ وعشر لیتا ہے یا اہلِ ذمہ سے جزیہ لیتا ہے تو درست ہے اور اسے اس پر اجر وثواب ملے گا۔

تائید جواب

اس جواب اور احادیث مکس کے مذکورہ محمل کی کئی امور سے تائید ہوتی ہے ۔مثلاً:

(۱) اگر ٹیکس میں ظلم، تعدی، اورزیادتی گناہ اور ناجائز ہے تو زکوۃ وعشر کی وصولی میں ظلم اورزیادتی بطریق اولی گناہ اورناجائز ہوگی، کیونکہ زکوۃ وعشر ایک عبادت ہے جبکہ ٹیکس ایک انتظامی اور قانونی چیز ہے۔

(۲) اس کی تائید ان احادیث کثیرہ صحیحہ سے بھی ہوتی ہے جو عامل زکوۃ اور عاشر کے ظلم وزیادتی کے بارے آتی ہیں اور ان میں اس پر سخت وعیدوں اور عقوبات کا ذکر ہے جن میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) فی مشکوۃ المصابیح (۱۵۵/۱) اول کتاب الزکوۃ، عن ابن عباسؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعث معاذا الی الیمن فقال انک تاتی اقواما من اھل کتاب...فاعلمھم ان اللہ قد فرض علیھم صدقۃ تؤخذ من اغنیائھم فترد علی فقرائھم فان ھم اطاعوا لذلک فایاک وکرائم اموالھم واتق دعوۃ المظلوم فانہ لیس بینھا وبین اللہ حجاب، متفق علیہ.

یہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت ہے حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر بنا کر روانہ کیا تو فرمایا کہ آپ اہل کتاب لوگوں کے پاس جا رہے ہیں پھر آپ نے وصیتیں کیں اور آخر میں یہ فرمایا کہ انہیں بتادو کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوۃ فرض کی ہے جوان کے اغنیاء سے لے کر ان کے فقراء کو دی جائے گی،لہٰذا اگر وہ یہ بات مان لیں تو آپ ان کے عمدہ اور نفیس مال لینے سے بچیں اور درمیانہ مال زکوۃ میں لیں اور مظلوم کی بددعا سے بچیں (کسی سے حق سے زیادہ نہ لیں) کیونکہ مظلوم کی بددعا اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔

(۲)وفیھاایضاً (۱/۱۵۶) عن عدی بن عمیرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:من استعملناہ منکم علی عمل فکتمنا مخیطا فما فوقہ کان غلولاًیأتی بہ یوم القیمۃ رواہ مسلم.

یہ صحیح مسلم کی روایت ہے عدی بن عمیرہؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ تم میں سے جس کو ہم عامل بنادیں پھر وہ سوئی کے برابر یااس سے کم وبیش کوئی چیز چھپالے تو یہ خیانت ہے،وہ اسے قیامت کے دن ساتھ لائے گا۔

(۳) فی سنن ابی داؤد (۱/۲۳۴) کتاب الزکوۃ،باب فی زکوۃ السائمۃ،عن انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال المعتدی فی الصدقۃ کمانعھا.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صدقہ وزکوۃ میں حد سے بڑھنے والا ایسے ہے جیسے زکوۃ کو روکنے والا۔

(۴)السنن الکبری للبیھقی(۱۵۷/۴) کتاب الزکوۃ،باب ترک التعدی علی الناس فی الصدقۃ. میں حدیث ابورغال منقول ہے،جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ کے بیٹے حضرت قیسؓ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عامل بنایا تو حضرت سعد بن عبادہؓ نے اس سے کہا کہ پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عہد لے لو پھر جاؤ،وہ کریم نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

یاقیس لاتاتی یوم القیمۃ علی رقبتک بعیرلہ رغاء اوبقرۃ لھا خوار اوشاہ لھایعار ولاتکن کابی رغال.

یعنی ایسا نہ ہو کہ تم خیانت کر بیٹھو اور قیامت کے دن آؤ تو تمہاری گردن پر اونٹ گائے اور بکری آواز دے رہی ہو اورابو رغال کی طرح مت بنو،حضرت سعدؓ نے پوچھا کہ ابورغال کون ہے؟ نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اسے عامل بنا کر بھیجا تھا،وہ ایک شہر گیا،وہاں ایک شخص کے پاس سو کے قریب بکریاں تھیں اورسب میں دودھ کم تھا البتہ ایک میں دودھ زیادہ تھا،اس شخص کا ایک چھوٹا بیٹا تھا،جس کی والدہ فوت ہوچکی تھی،اس بچے کی زندگی اس ایک بکری کے دودھ پر بسر ہوتی تھی،بکریوں والے نے ابورغال سے پوچھا آپ کون ہیں؟اس نے کہا کہ میں رسول اللہ کا قاصد ہوں تو اس نے مرحبا کہا اور کہا کہ جو بکری آپ کو اچھی لگے لے جاؤ،اس کی نظر دودھ والی بکری پر پڑی اور کہا یہ لے جاتا ہوں،مالک نے

کہا کہ یہ بچہ آپ دیکھ رہے ہیں،اس بکری کے علاوہ اس کا کوئی طعام وشراب نہیں ہے،ابورغال نے کہا کہ اگر تجھے دودھ پسند ہے تو مجھے بھی پسند ہے،مالک نے کہا کہ اس کی جگہ دو بکریاں لے لو یہاں تک کہ پانچ دینے کو تیار ہوا لیکن ابورغال انکار کرتا رہا،جب مالک نے یہ صورت حال دیکھی تو اپنی کمان اٹھائی اوراسے قتل کردیا پھر مالک حضرت صالح علیہ السلام کے پاس آیااور پوری تفصیل بتائی،حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایااے اللہ ابورغال پر لعنت بھیج،دوبار کہا،نبی ﷺ نے فرمایا کہ کوئی اس طرح کی خبرلیکر میرے پاس نہ آئے،حضرت سعد بن عبادہؓ نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیس کو عامل بنانے سے معذرت قبول فرمائیں۔

جواب ثالث

مذکورہ احادیث مطلق ٹیکس کی ممانعت اورحرمت پر قطعی نہیں ہیں،ان میں اجمال وابہام ہے۔

ان مذکورہ احادیث مقدسہ میں ابہام واجمال اس طرح ہے کہ ان میں لفظ ''مکس''اور''عشر''اور''عشار''وارد ہوا ہے،اورشریعت ولغت دونوں کی رو سے ان کے معانی ومطالب واضح اور متعین نہیں ہیں،جب ان کا معنی اور محمل واضح نہیں تو ان سے مطلق ٹیکس کی حرمت پر استدلال درست نہیں ہے۔

محدثین،شارحینِ حدیث اوراہل لغت نے اس کے مختلف معانی بیان فرمائے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔

(۱)فی جمهرة اللغةللامام ابن دریدؒ (۳/۴۶)"المکس"بفتح المیم،والمکس دراهم کانت تاخذمن بایعی السلع فی الجاهلیة،والفاعل

الماکس.تکملة فتح الملهم(۲/ ۴۵۲)

یعنی مکس سے وہ دراہم مراد ہیں جوزمانہ جاہلیت میں سامان فروخت کنندہ سے لئے جاتے تھے۔

(۲)فی لسان العرب لابن منظوررحمه الله(۸/ ۱۰۵)قال ابن الاعرابی:المکس دراهم کان یاخذهاالمصدق بعدفراغه واصل المکس:النقص،فکأن الماکس اذااخذدرهماًانتقص من ثمن السلعة.

ابن اعرابیؒ کہتے ہیں کہ زکوۃ لینے والازکوۃ وصول کرنے کے بعدجوکچھ لیتاہے وہ مکس ہے اورمکس کے اصل معنی کم کرنے کے ہیں،گویاکہ ماکس جب ایک درہم لیتاہےتوسامان کےثمن میں کمی آجاتی ہے۔

(۳)عن عقبة بن عامرؓقال:سمعت رسول الله ﷺیقول:لایدخل صاحب مکس الجنة،قال یزیدبن هارون:یعنی العشار،اخرجه ابوداؤدفی سننه من وجه آخرعن محمدبن اسحاق والمکس هوالنقصان فاذاکان العامل فی الصدقات ینتقص من حقوق المساکین ولایعطیهم ایاهابالتمام فهوحینئذصاحب مکس یخاف علیه الاثم والعقوبة.

السنن الکبری للبیهقیؒ(۷/ ۱۶)کاب الصدقات،باب لایکتم منهاشیء،،اداره تالیفات اشرفیه ملتان.

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ مکس اورصاحب مکس سے مرادوہ عاملِ زکوۃ ہے جومسکینوں کے حقوق میں کمی کرتاہے اوران کوان کے حقوق کے مطابق زکوۃ نہیں دیتا،ایسے شخص پرسخت گناہ اوروبال کاخطرہ ہے۔

(۴) اکثر حضرات نے اس سے ظالمانہ ٹیکس مراد لیا ہے جس کی وضاحت آچکی ہے۔

(۵) کچھ حضرات نے اس سے زکوۃ، عشر اور صدقات کے وصولیابی میں ظلم وزیادتی کرنا مراد لیا ہے جس کی تفصیل آچکی ہے۔

جواب رابع

بعض حضرات نے احادیث مکس کا یہ جواب دیا ہے کہ ایسی روایات ضعیف ہیں یا ان میں سے اکثر کا صحیح ہونا ثابت نہیں ہے، چنانچہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی فقہ الزکوۃ (۲/۶۸۸) میں لکھتے ہیں:

مکس کی مذمت میں جو احادیث وارد ہیں ان میں سے اکثر کا صحیح ہونا ثابت نہیں ہے۔

تبصرہ:

یہ جواب درست نہیں ہے، ان احادیث میں سے اکثر صحیح اور حسن ہیں، سب کو ضعیف یا اکثر کو غیر صحیح کہنا غلط ہے، ہم ابتداء میں ایسی احادیث نقل کر چکے ہیں اور جہاں ضرورت پیش آئی تخریج کے ساتھ ساتھ حدیث کی اسنادی حیثیت بھی نقل کر دی ہے۔

، نیز جب ایک موضوع کے بارے احادیث کثیرہ موجود ہوں تو ایسی صورت میں قدر مشترک کو دیکھا جاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ ان سے قدر مشترک یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسلام میں ٹیکس نہیں ہے، یہ الگ بحث ہے کہ اس سے مراد ظالمانہ ٹیکس

ہے،اورعادلانہ ٹیکس بھی شرعی حکم نہیں،قانونی اورانتظامی ہے،اگراس میں شرائط موجودہوں توشریعت اس کی اجازت دیتی ہے،نیزبالفرض اگراحادیث مکس ضعیف اورغیرصحیح ہوں توان کامفہوم توصحیح ہے اورشریعت مقدسہ کاعام اصول اورضابطہ ہے۔

دلیل ثالث کے جوابات

جوابِ اول

"لیس فی مال المسلم حق سوی الزکوۃ"میں حق سے حق شرعی مراد ہے یعنی شریعت نے زکوۃ کے علاوہ بطورعبادت کوئی مالی حق واجب نہیں کیا،جبکہ ٹیکس کالزوم ایک انتظامی اور قانونی معاملہ ہے لہٰذا عادلانہ ٹیکس کالزوم اس اصول کے منافی نہیں ہے۔

جوابِ ثانی

"لیس فی مال المسلم حق سوی الزکوۃ" والااصول متفق علیہ نہیں ہے،امت مسلمہ کاایک بڑاطبقہ اس بات کابھی قائل ہے کہ مسلمان کے مال میں زکوۃ کے علاوہ حقوق بھی واجب ہیں،صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ،علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ،عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا،ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ،ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ،حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور فاطمہ بنت قیسؓ اور تابعین میں سے حضرت امام شعبیؒ،مجاہدؒ،طاؤسؒ اور حضرت عطاءؒ کی یہی رائے ہے اور علامہ ابن حزم ظاہری رحمۃ اللہ علیہ نے المحلی میں اس مسلک کی پرزور وکالت کی ہے اورجوحضرات"لیس فی مال المسلم حق سوی الزکوۃ"کے قائل ہیں ان کا

یہ قول بھی مطلق نہیں ہے بلکہ ان حضرات کے ہاں بھی مسلمان پر زکوۃ کے علاوہ مالی حقوق واجب ہیں، مثلاً:

(۱) والدین اگر ضرورت مند ہوں اور اولاد غنی ہو تو اولاد پر والدین کا نفقہ شرعاً واجب ہے۔

(۲) بیوی اور نابالغ اولاد کا خرچہ بھی شرعاً واجب ہے۔

(۳) دوسرے رشتہ دار اگر تنگدست ہوں تو فی الجملہ ان کا خرچہ بھی واجب ہے البتہ جزئیات میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔

(۴) مضطر یعنی مجبور شخص کو کھانا کھلانا، کپڑا پہنانا اور اسے ٹھکانا دینا مجموعی طور پر واجب ہے۔

(۵) مسلمانوں پر نازل ہونے والے عام مصائب کا دور کرنا بھی فرض ہے مثلاً دشمن کا خطرہ دور کرنا، مسلمان قیدیوں کو کافروں کی قید سے چھڑانا اور قحط وافلاس کا مقابلہ کرنا وغیرہ۔

معلوم ہوا کہ شریعت کا مذکورہ اصول مطلق نہیں ہے بلکہ اس میں کچھ تفصیل ہے اور جمہور فقہاء کے ہاں بھی زکوۃ کے علاوہ دوسرے حقوق مالیہ فی الجملہ واجب ہیں لہٰذا بوقت ضرورت لاگو کیا جانے والا منصفانہ ٹیکس بھی ان حقوق مالیہ میں شمار کیا جا سکتا ہے، البتہ ظالمانہ ٹیکس کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے۔

جواب ثالث

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے مجموع الفتاوی، کتاب الایمان الکبیر (۳۱۶/۷) میں شرعی اصول " لیس فی مال المسلم حق سوی

الزکوۃ" اور اس بارے وارد حدیث کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ مسلمان کے مال میں بسبب مال زکوۃ کے علاوہ کوئی حق واجب نہیں ہے، سبب مال کے علاوہ دیگر اسباب کی وجہ سے مسلمان کے مال پر واجبات عائد ہو سکتے ہیں، اس کی بہت سی صورتیں ہیں جن میں سے ایک صورت یہ بھی ہے کہ کسی عارضی سبب کی وجہ سے مسلمانوں کے مال پر ایک تناسب سے کچھ واجب عائد کر دیا جائے۔ فرق یہ ہوگا کہ زکوۃ کے وجوب کا سبب مال ہے اور دوسرے واجبات کے وجوب کا سبب کوئی اور ہوگا، مال وجوب کیلئے شرط ٹھہرے گا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کردہ اس مطلب کی روشنی میں کسی عارضی سبب کے پیشِ نظر عادلانہ ٹیکس نافذ کرنا مذکورہ اصول کے خلاف نہیں ہے۔

دلیلِ رابع کا جواب

پہلے اس بارے تفصیل آچکی ہے کہ ٹیکس کی دو اقسام ہیں (۱) عادلانہ و منصفانہ ٹیکس (۲) ظالمانہ و جابرانہ ٹیکس، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اسلام نے شخصی ملکیت کا احترام کیا ہے اور ہر شخص کے مال ومتاع کو تحفظ فراہم کیا ہے، لیکن بوقت ضرورت قانونی طور پر عادلانہ ٹیکس لاگو کرنا شخصی ملکیت کے احترام کے منافی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ شریعت مقدسہ نے مسلمانوں کے اموال پر زکوۃ اور دیگر کئی مالی حقوق واجب کئے ہیں، اگر کوئی مسلمان زکوۃ ادا نہیں کرتا تو حکومتِ وقت اس سے زبردستی لے سکتی ہے، جب یہ حقوق مالیہ شخصی ملکیت کے احترام کے منافی نہیں ہیں تو بوقت ضرورت جائز ٹیکس عائد کرنا بھی اس کے احترام کے منافی نہیں ہے

کیونکہ معاشرے کے ہرفرد کی ذمہ داری ہے کہ ملک وملت ، جماعت اورقوم کی تعمیر وترقی میں حصہ لے اور بوقت ضرورت جماعت کے مفاد کوفرد کے مفاد پر مقدم رکھے ۔ہاں ظالمانہ ٹیکس واقعی شخصی ملکیت کے احترام کے منافی ہے اور اسلام ظالمانہ ٹیکس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔

موجودہ ٹیکسوں میں شرائط کی رعایت

سابقہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ راجح اور صحیح مذہب کے مطابق چند شرائط کے ساتھ مسلمانوں پرعادلانہ ٹیکس لگانا جائز ہے لیکن اب یہ دیکھنا ہے کہ موجودہ ٹیکسوں میں ان شرائط کی رعایت موجود ہے یانہیں اور مروجہ ٹیکس منصفانہ ہیں یانہیں؟ یہ ایک نازک اور تحقیق طلب پہلو ہے اور مختلف ممالک میں اس کا حکم بدل سکتا ہے۔

کیاپاکستان کانظام ٹیکس یہ شرائط پوری کرتا ہے ؟اس پر ایک کلی حکم لگانا تو مشکل ہے، صحیح یہی ہے کہ یہاں عادلانہ ٹیکس بھی نافذ ہے اورظالمانہ ٹیکس بھی،اس طرح ہرٹیکس کی انفرادی حیثیت بدل سکتی ہے لیکن مجموعی طور پر ان ٹیکسوں میں شرعی شرائط کوملحوظ نہیں رکھا گیااورظالمانہ ٹیکس کی کثرت ہے،ہم نے سابق میں منصفانہ ٹیکس کی سات شرائط بیان کی ہیں،اور شریعت کااصول یہ ہے کہ متعدد شرائط میں سے کوئی ایک شرط مفقود ہوتوحکم لاگونہیں ہوسکتا،اس اصول کی روشنی میں اگر مذکورہ شرائط میں سے کوئی ایک شرط موجود نہ ہو تواس ٹیکس کوظالمانہ کہاجائیگا،لیکن یہ شرائط منصوص نہیں مستنبط ہیں،اوراصولِ شرعیہ پرمبنی ہیں اور کچھ کا تعلق انتظام وانصرام سے بھی ہے،اسلئے حق یہ ہے کہ ان سب شرائط کی حیثیت برابر درجے کی نہیں اور ہر ہر شرط کے بارے نہیں کہاجاسکتا کہ اگر وہ موجودنہ ہوتو وہ ٹیکس لازمی طور پرظالمانہ کہلائے۔

بنا بریں یہ درست معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ماہرین مالیات نے ٹیکس کے متعدد اصول لکھے ہیں جن کی تفصیل آگے آئے گی اوران اصول کے بارے کہا ہے کہ کسی نظام ٹیکس کے منصفانہ ہونے کیلئے اس میں ان اصول کا مجموعی طور پر پایا جانا ضرور ہے،اسی طرح مذکورہ شرعی شرائط میں سے جو حقیقی شرائط ہیں ان کا تو ہر صورت پایا جانا ضروری ہے،البتہ دوسری انتظامی شرائط سمیت سب کا مجموعی طور پر پایا جانا ضروری ہے۔

زیادہ تفصیل کی شاید ضرورت نہ ہو،اگر غور کیا جائے تو مذکورہ شرائط میں سے دو شرائط بہت اہم اور ضروری ہیں (۱) ٹیکس لگانے کی واقعی ضرورت ہو (۲) ٹیکس سے حاصل شدہ رقم اس کے مصارف پر خرچ کی جائے۔کم از کم ان دو شرائط کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ مروجہ نظام میں ان کی رعایت بالکل نہیں کی گئی،جس کی وجوہ کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) ٹیکس کی واقعی ضرورت ہے یا نہیں ؟ یہ بات طے کرنے کیلئے سرکاری ذرائع آمدن اوراخراجات کا موازنہ کرنا پڑے گا اوراخراجات بھی صرف وہ قابلِ اعتبار ہیں جو واقعی ہوں،اس وقت حکومتوں نے شاہانہ خرچوں،تعیشات اور غیر ضروری اشیاء کو اخراجات میں شامل کر دیا ہے،جس کی وجہ سے ذرائع آمدن ان کی کفایت نہیں کر سکتے،اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانے میں حکومتی اخراجات بڑھ گئے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی عیاں حقیقت ہے کہ ذرائع آمدن میں بھی اضافہ ہوا ہے،جس کا پہلے تصور نہ تھا جیسے بجلی،گیس،پانی،ٹیلیفون کے بلز،پی آئی اے،ریلوے،محکمہ ڈاک،وتار وغیرہ،اگر ان تمام محکموں کی آمدن دیانت داری کے ساتھ وصول کر کے

دیانت داری کے ساتھ جائز مصارف و اخراجات پر لگائی جائے تو ٹیکس کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

(۲) ٹیکس سے حاصل شدہ رقم جائز اور صحیح مصارف پر نہیں لگائی جاتی، ٹیکس کی خطیر رقم وصول ہی نہیں ہوتی، بہت سے ٹیکس دہندہ محکمہ ٹیکس کے کارندوں کو رشوت وغیرہ دے کر جان چھڑا لیتے ہیں اور جو رقم وصول ہوتی ہے اس میں سے معتد بہ رقم ٹیکس وصول کنندگان کی تنخواہوں اور دوسرے دفتری امور میں خرچ ہو جاتی ہے۔ بہت سی رقم ان کی خیانت اور گھپلوں کی شکار ہو جاتی ہے، اس کے بعد جو رقم حکومتی خزانے میں جمع ہوتی ہے، اس کا اکثری استعمال بھی غلط مصارف میں ہوتا ہے، عوام الناس کی فلاح و بہبود اور عوامی مصارف میں بہت کم رقم استعمال ہوتی ہے، آئے دن اخبارات میں اس بارے خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں، نیز ٹیکس کی شرح بھی واضح نہیں ہوتی اور وصولی کا طریق کار اور اصول وضوابط بڑے پیچیدہ ہوتے ہیں، بڑے تجار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی اس کا طریق کار سمجھانے کیلئے مختلف میٹنگز ہوتی ہیں، کانفرنسز منعقد ہوتی ہیں اور اخبارات میں طریقہ کار شائع کیا جاتا ہے، ایک طرف ترغیبات دیجاتی ہیں اور دوسری طرف ترھیبات اور دھمکیاں ہوتی ہیں، اللہ اللہ کر کے جب نظام ٹیکس کا ایک طریقہ سمجھ میں آجاتا ہے تو حکومت بدل جاتی ہے یا کسی حادثہ کی وجہ سے وہ طریقہ کار تبدیل کر دیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ ہمیشہ چلتا رہتا ہے، خود اس تشہیر پر خطیر رقم خرچ کر دی جاتی ہے، اس طرح کی مشکلات و تکلفات اور بدنظمی نہ صرف اسلامی اصول کے خلاف ہے بلکہ خود ماہرین ٹیکس کے وضع کردہ اصول کے بھی خلاف ہے، اس حقیقت کے باوصف ایسے ٹیکس کو کیسے منصفانہ کہا جائے ؟

جب ٹیکس کے بارے میں لکھنا شروع کیا تو اخبارات میں ٹیکس گھپلوں کے بارے خبریں شائع ہورہی تھیں، بندہ انہیں جمع کرتا رہا، ایسی خبریں اتنا زیادہ جمع ہوئیں کہ اگر ان کو مرتب کیا جائے تو بذاتِ خود ایک مستقل کتاب بن جائے، پھر ساتھ ساتھ اندازہ ہوا کہ یہ سب کچھ معمول کے مطابق ہے اور اس میں کوئی ایسی نئی بات نہیں کہ یہاں لکھا جائے، جسے یہ حقیقت جاننی ہو وہ ہر روز اخبارات میں دیکھ سکتا ہے، یہاں صرف دو خبریں نقل کی جاتی ہیں۔

(۱) ایف بی آر نے بڑے ٹیکس چوروں کا سراغ لگا لیا۔

ایف بی آر نے بڑے ٹیکس چوروں کا سراغ لگالیا، کراچی اور لاہو کے لارج ٹیکس پیئرز یونٹوں میں انکم اور سیلز ٹیکس کی ادائیگی میں اربوں کی خردبرد کی گئی۔

اسلام آباد (وقائع نگار خصوصی) باخبر ذرائع کے مطابق فیڈرل بورڈ آف ریونیو نے بڑے ٹیکس چوروں کا سراغ لگالیا ہے، ذرائع کے مطابق کراچی اور لاہور کے لارج ٹیکس پیئرز یونٹوں کے عہدیدار نے انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس کی ادائیگی میں اربوں روپے کی خردبرد پکڑلی، ایک درجن سے زئد کارپوریٹ سیکٹر کے اداروں کے سیلز ٹیکس اور انکم ٹیکس کے معاملات کی گزشتہ ماہ سے سکروٹنی کی جارہی تھی، تقریباً نصف درجن بڑے ٹیکس چور اداروں کا پتہ چلا لیا گیا ہے، یہ کامیابی فیڈرل بورڈ آف ریونیو کے ممبر آڈٹ اور انکے عملے کی بتائی گئی ہے، فیڈرل بورڈ آف ریونیو کے ممبر ڈائریکٹ ٹیکس عثمان خالد اور ممبر سیلز ٹیکس مسرت جبیں کے ذریعے ایف بی آر کے چیئرمین اور سیکرٹری جنرل ریونیو ڈویژن محمد عبداللہ یوسف کو لاہور اور کراچی کے پائلٹ پروجیکٹوں کے نتائج سے آگاہ کر دیا گیا ہے، دونوں بڑے شہروں کے لارج ٹیکس پیئرز یونٹوں

نے کارپوریٹ سیکٹر کے مزیداداروں کے معاملات کی آڈٹ ٹیمیں جائزہ لے رہی ہیں،دریں اثناء ایف بی آر کے ممبر ڈائریکٹ ٹیکس عثمان خالدمرزا سے جب رابطہ کیا گیاتوانہوں نے بتایاکہ یونیورسل سیلف اسسمنٹ سکیم پر لفظی اورمعنوی اعتبار سے عمل کیاجائے،سکیم کے والینٹری کمپلائنس (رضاکارانہ عملدرآمد)ہماری پالیسی ہے،اسکی حوصلہ افزئی کاسلسلہ جاری رکھاجائے گا.....

روزنامہ جنگ راولپنڈی بدھ 5دسمبر 2007ء

(۲) کسٹمز کیئر کا نظام ختم کیا جائے

کسٹمز کےکلئیرنس کے نئے نظام (کیئر) کے ذریعے بعض تاجروں نے کھربوں روپے کے ٹیکس چوری کر لئے ہیں،کسٹمز حکام اس سلسلے میں تحقیقات کرر ہے ہیں۔

ایک اخباری رپورٹ کے مطابق شیخ شکیل احمد دھنگوہ نے کہاہے کہ دوسال سے ایک سال کے اندر۱۰۰ارب روپے سے زائد کی رقم کی ڈیوٹیز اور ٹیکسز چوری کئے گئے ہیں،انہوں نے کہاکہ نئے نظام میں تاجروں کوخودت شخیصی کی بے بہاآزادی اورکلئیرنس کی جواجازت دی گئی ہے،اس سے سی بی آر کے سواکوئی دوسراچیک نہیں کرسکتا،جس سے فائدہ اٹھا کر لاکھوں روپے کی ڈیوٹیز اور ٹیکسز چوری کیئے گئے ہیں،اس اخباری رپورٹ کے مطابق کسٹمز نے تحقیقات کے دوران دوہزار سے زائدکنٹینرز کاسراغ لگایاہے جنہیں اس نظام کے ذریعے مس ڈیکلریشن کے ذریعے کلئیر کردیا گیاجبکہ کلئیر کرنے اور ڈیوٹی چوری کرنے والاشخص بیرون ملک

فرار ہو چکا ہے۔

روزنامہ اسلام جمعۃ المبارک شوال ۱۴۲۸ھ۔۱۹ اکتوبر ۲۰۰۷ جلد ۴ شمارہ ۱۱۱

ایک ماہر معاشیات تبصرہ نگار اس پر لکھتے ہیں۔

ہمارے قومی خزانے کو جس طرح آبائی ورثہ سمجھ کر لوٹ کھسوٹ کی جارہی ہے اوراس سلسلے میں قوانین اورقواعدو ضوابط میں جس قدر نقائص ہیں اوران سے ایسے ناپسندیدہ عناصر جس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں مذکورہ بالارپورٹ اس کی محض ایک مثال ہے، کسٹمز کا کیئر نظام رائج کرتے وقت بڑے بڑے دعوے کئے گئے تھے لیکن اس رپورٹ سے ثابت ہورہاہے کہ اس نظام کا اصل فائدہ دراصل کس کو ہوا ہے اورہورہاہے، کسٹمز حکام کچھ اور نہیں کرسکتے تو کم ازکم اس نظام ہی کو ختم کردیں ورنہ وہ بتائیں کہ قوم کے خزانے کو پہنچنے والے اس نقصان کو وہ کس طرح روک سکتے ہیں؟اور یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟اور یہ ایک کھرب روپے کس کے اکاؤنٹس میں گئے ہیں؟ کیا کسٹمز حکام اس بارے میں بھی تحقیقات کرکے اس کے ذمہ داروں کوقوم کے سامنے لاسکیں گے؟

ظالمانہ ٹیکس کے بچاؤ کے طریقے

جو ٹیکس واقعی ظالمانہ ہے اوراس میں گزشتہ شرعی شرائط کی رعایت نہیں کی گئی شرعاًایسے ٹیکسوں سے اپنے آپ کو بچانااورانہیں نہ ادا کرنا جائز ہے اوراس کیلئے موقعہ محل کی مناسبت سے کوئی جائز طریقہ اختیار کیاجاسکتا ہے،بشرطیکہ اس میں صریح جھوٹ بولنے اور رشوت دینے کی نوبت نہ آئے اورہتک عزت کا خطرہ نہ ہو،کوئی بھی ایساطریقہ اختیار کرناجائز نہیں جس میں صریح جھوٹ بولنا پڑے یارشوت دینی

پڑے یا ہتک عزت کا خطرہ ہو۔

البتہ جتنا ممکن ہو یہ ٹیکس ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، روایات میں آتا ہے کہ بعض مالکوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شکایت کی کہ عاملین ہم سے زیادہ وصول کرتے ہیں، انکی شکایت درست تھی یا غلط تاہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم یہی تھی کہ ان کو دے دینا چاہیے، کچھ لوگوں نے جب یہ کہا کہ جس قدر وہ زیادتی کرتے ہیں، اگر اس حد تک مال چھپالیں تو درست ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو۔

فی المشکوۃ (۱/۱۵۷)عن بشیر بن الخصاصیۃؓ قال:قلنا ان اہل الصدقۃ یعتدون علینا افنکتم من اموالنا بقدر یعتدون قال لا:رواہ ابو داؤد،انظر(۱/۲۳۴) کتاب الزکوۃ،باب رضی المصدق.

بشیر بن خصاصیہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی کہ صدقہ وصول کرنے والے ہم سے زیادتی کرتے ہیں کیا ہم بقدرِ زیادتی اپنا مال چھپالیا کریں؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔

آئندہ سطور میں ظالمانہ ٹیکس سے بچنے کی چند شرعی طریقوں کی وضاحت کی جاتی ہے تاکہ بوقتِ ضرورت ان سے کام لیا جاسکے۔

(۱)حیلہ (Stratagem)

ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری (۱۲/۴۰۴) کتاب الحیل میں حیلہ کی تعریف ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

ھی مایتوصل بہ الی مقصود بطریق خفی

یعنی حیلہ میں ایک مخفی راستہ سے مقصود تک پہنچا جاتا ہے لیکن حیلہ کی جامع اور صحیح تعریف وہ ہے جو حضرت مولانا ظفراحمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اعلاء السنن (۴۲۴/۱۸) کتاب الحیل میں فرمائی ہے۔

ان الحیلة ترک لطریق فیه مفسدة الی مطلوب مباح واختیار لطریق لا مفسدة فیه .

یعنی شرعی مفسدہ والے طریقہ کو چھوڑ کر جائز طریقہ سے جائز و مباح مقصد حاصل کرنا۔

اس تعریف کی رو سے حیلہ کے اجزاء ترکیبی تین ہیں۔

(۱) مقصد جائز اور شرعی ہو، اگر مقصد ہی ناجائز ہو تو حیلہ بھی ناجائز ہوگا۔

(۲) مفسدہ والا طریقہ چھوڑ دیا جائے، اگر وہ طریقہ خود درست ہو تو حیلہ کی ضرورت ہی پیش نہ آئیگی۔

(۳) جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس میں شرعی مفسدہ نہ ہو، اگر اس میں بھی شرعی مفسدہ ہو تو حیلہ ناجائز اور حرام ہوگا، گویا کہ شرعی حیلہ میں حرام سے بچ کر مقصود حاصل کیا جاتا ہے جو کہ جائز بلکہ مستحسن ہے، اس کی مثال صحیح بخاری وغیرہ کتب حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں موجود ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو خیبر کا عامل بنا کر بھیجا، عامل عمدہ قسم کی کھجور لایا تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ کیا خیبر کی تمام کھجوریں اس طرح عمدہ ہوتی ہیں؟ اس نے کہا نہیں بلکہ ہم ادنی کھجور کے دو صاع دے کر اعلی کھجور کا ایک صاع خرید لیتے ہیں، یہ چونکہ صریح

سود بنتا ہے، اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو، جائز طریقہ یہ ہے کہ ادنی کھجور کے دو صاع دراہم کے عوض فروخت کر دیا کرو پھر ان دراہم کے عوض ایک صاع عمدہ کھجور خرید لیا کرو۔

یہاں مقصود یہ تھا کہ دو صاع ادنی قسم کی کھجوروں کے عوض ایک صاع اعلی قسم کی کھجور حاصل کی جائے، یہ مقصود درست تھا، اس میں کوئی قباحت نہ تھی کیونکہ بیع وشراء کا مقصد فریقین کا نفع حاصل کرنا ہے لیکن وہ لوگ یہ مقصد جس طریقہ سے حاصل کرتے تھے، وہ سودی تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو مقصود حاصل کرنے کا جائز طریقہ بتایا، اس طرح کا حیلہ اپنانا شرعاً جائز بلکہ بعض صورتوں میں ضروری ہو جاتا ہے، قرآن و سنت اور تعامل سلف سے ایسے حیلے کا ثبوت ملتا ہے، علامہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے المبسوط (۲۲۸/۳۰) کتاب الحیل میں اس بار میں مدلل گفتگو کی ہے اور علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اعلاء السنن (۴۲۴/۱۸) کتاب الحیل میں اس بارے شبہات کا مفصل جواب دیا ہے، تفصیل وہاں دیکھی جا سکتی ہے۔

قال اللہ تعالیٰ وخذ بیدک ضغثا فاضرب بہ ولا تحنث.

(سورۃ ص الآیۃ ۴۴)

قال اللہ تعالیٰ ولماجھزھم بجھازھم جعل السقایۃ فی رحل اخیہ الی قولہ تعالی: ثم استخرجھا من وعاء اخیہ کذلک کدنا لیوسف.

(سورۃ یوسف الآیۃ ۷۰ الی الآیۃ ۷۶).

قال اللہ تعالیٰ اللہ تعالیٰ: ولا تقولن لشئی انی فاعل ذلک غدا الا ان یشاء اللہ. (سورۃ الکھف الایہ ۲۳)

وقال الله تعالیٰ:ستجدنی ان شاء الله صابرا.

(سورة الکهف الآیة ۹ ۶)

قال الله تعالیٰ:ومن یولهم یومئذ دبره الا متحرفا لقتال او متحیزا الی فئة فقد باء بغضب من الله ومأویٰهم جهنم وبئس المصیر.الانفال الآیه۱٦ ا)

فی تفسیر ابن کثیر(۲۸۲/۳) ومن یولهم یومئذ دبره الا متحرفا لقتال:ای یفربین یدی قرنه مکیدة لیریه انه خاف منه فیتبعه ثم یکرعلیه فیقتله فلاباس علیه فی ذلک نص علیه سعید بن جبیر والسدی وقال الضحاک:ان یتقدم عن اصحابه لیری غرة من العدو فیصیبها الخ

قال الله تعالیٰ ومن یتق الله یجعل له مخرجا.(سورة الطلاق: ۲)

استدل الحافظ ابن حجربهذه الآیةعلی جوازالحیلة فی فتح الباری اول کتاب الحیل،(۳۰۳/۱۲)

فی صحیح المسلم (۸۳/۲) کتاب الجهاد باب جواز الخداع فی الحرب،عن جابرؓوابی هریرةؓ بالاسنادین المختلفین، قال النبی صلی الله علیه وآله وسلم الحرب خدعة .

قال النووی:واتفق العلماء علی جواز خدع الکفار فی الحرب کیف امکن الخداع الاان یکون فیه نقض عهد او امان فلا یحل وقد صح فی الحدیث،جواز الکذب فی ثلثة اشیاء،احدهافی الحرب،قال الطبری:انمایجوزمن الکذب فی الحرب المعار یض دون حقیقة الکذب

فانه لایحل،هذا کلامه والظاهر اباحة حقیقة نفس الکذب لکن الاقتصار

علی التعریض افضل.

راجع للتفصیل ایضاًاحکام القرآن للجصاص(۳/۷۶ ایضاً)

حیلہ کی اقسام

مقصد کے اعتبار سے حیلہ کی مختلف اقسام ہیں مثلاً اگر حیلہ کے ذریعے حق کا ابطال کرنا ہو یا باطل کا اثبات ہو تو یہ حرام ہے اوراگر مقصد حق کا اثبات یا باطل کا دفعیہ ہو تو ضروری یا مستحب ہے اوراگر مقصد مکروہ عمل سے احتراز ہو تو ایسا حیلہ مستحب یا مباح ہے اور اگر مقصد ایک مندوب و مستحب عمل کو ترک کرنا ہو تو مکروہ ہے۔

کماقال ابن حجر فی فتح الباری(۲/۴۰۴) وقواعد نا لاتأباه.

(۲)توریہ /DISSIMULATION) SYLLEPSIS)

توریہ (SYLLEPSIS)علمِ بلاغت کی ایک اصطلاح ہے جو علم بدیع کی ایک صفت پر دلالت کرتی ہے،اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی ایسا لفظ استعمال کیا جائے جس کے دومعنی ہوں،ایک قریب کا اوردوسرا دور کا اور دور کا معنی قریبی معنی میں اس طرح مخفی ہو کہ سامع کے ذہن میں اس کا خیال نہ آئے لیکن متکلم کی مراد وہی دور کا معنی ہو، اسے ایہام بھی کہتے ہیں،مثال کے طور پر لڑائی کے وقت کوئی مجاہد حواس باختہ کرنے کیلئے کافروں سے کہے کہ مات امامکم یعنی تمہارا امام مرگیا اور اس کی مراد یہ ہو کہ پہلے کوئی کافرامام مرا ہے جبکہ مخاطب یہ سمجھتا ہے کہ ہمارا موجودہ

امام ہلاک ہو چکا ہے۔

ماخذہ:تکملة فتح الملهم(۵/۱۲)

فی معجم لغة الفقهاء(ص ۱۵۱) التوریة من ورّی،ارادة المتکلم بکلامه امرا خفیا غیر الظاهر منه.

وفی التعریفات للسید عمیم الاحسان المجددیؒ (ص ۲۴۱) التوریة:هی ان یرید المتکلم بکلامه خلاف ظاهره مثل ان یقول فی الحرب "مات امامکم"وهو ینوی به احدامن المتقدمین .

(۳)تعریض:(EUPHEMISM)

تعریض توریہ کے مترادف ہے،تعریض کہتے ہیں:ارادة المتکلم من کلامه معنی یفهمه السامع من غیر تصریح به.

معجم لغة الفقهاء(ص ۱۳۵)

متکلم کا اپنے کلام سے ایسے معنی کا قصد کرنا جو سامع کو سمجھ آسکے لیکن اس کی تصریح نہ ہو۔

توریہ اور تعریض کا حکم

عام حالات میں توریہ وتعریض کا استعمال درست نہیں البتہ دفعِ ظلم اور بوقت ضرورت اس کا استعمال جائز ہے۔

فی الادب المفرد للامام البخاری (ص ۲۳۹) باب المعاریض.

عن عمرؓ انه قال:حسب امرأ من الکذب ان یحدث بکل ماسمع قال

وفیما اری قال:قال عمر:اما فی المعاریض مایکفی المسلم الکذب؟ وفیہ ایضاً عن عمران بن حصینؓ قال:ان فی المعاریض لمندوحة عن الکذب. قال الامام البخاری فی کتاب الادب من صحیحہ مبوبا ان فی معاریض الکلام لمندوحة عن الکذب.

وراجع للتفصیل ایضاً تکملة فتح الملھم (۳/ ۳۱،۳۳)کتاب الجھادوالسیر،حکم الکذب فی الحرب والفتاوی الحدیثیة لابن حجر الھیثمیؒ (ص ۱۹۷)

صریح جھوٹ کا حکم

حالت اضطرار میں صریح جھوٹ کی اجازت ہے لیکن کیاعام حالات میں دفع ظلم یا دفع شر کیلئے صریح جھوٹ بولنے کی اجازت ہے ؟ فقہاء احناف کا تقریباً اتفاق ہے کہ عام حالات میں مذکورہ مقصد کیلئے صریح جھوٹ بولناجائز نہیں ہے،حرام ہے،صرف تعریض،توریہ اور حیلہ سے کام چلانے کی اجازت ہے،البتہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اورفقیہ النفس حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا مؤقف یہ ہے کہ حدیث میں جن تین مواقع میں بظاہر جھوٹ بولنے کی اجازت دی گئی ہے اگروہاں تعریض وتوریہ سے کام نہ چلتا ہوتو صرف وہاں صریح جھوٹ کی بھی اجازت ہے۔

وھوما مال الیہ صاحبا اعلاء السنن وتکملة فتح الملھم .

شافعیہ اور کچھ دوسرے حضرات عام حالات میں دفع ظلم کیلئے صریح جھوٹ کی بھی اجازت دیتے ہیں،ان کا استدلال چند روایات سے ہے۔

فی سنن الترمذی(۲/ ۲۵۸)ابواب البروالصلة،باب ماجاء فی اصلاح ذات البین،عن اسماء بنت یزیدؓ قالت قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم:لایحل الکذب الا فی ثلاث،یحدث الرجل امرأته لیرضیها والکذب فی الحرب والکذب لیصلح بین الناس.

وعن ام کلثوم بنت عقبةؓ قالت سمت رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم یقول:لیس بالکذب من اصلح بین الناس فقال خیرا اونما خیرا.

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی روایات میں ''الکذب'' سے صریح جھوٹ مرادنہیں بلکہ توریہ،تعریض اور کنایہ ہی مراد ہے۔

فی الکوکب الدری(۳/ ۵۳) باب ماجاء فی اصلاح ذات البین ،ابواب البر والصدقة والمراد بالکذب ھھناھو معنا ہ الحقیقی الاان العلماء احتاطوافقالواالمراد به التوریة ردعاللعوام من الاجتراء علیه وتسمیته کذبا بحسب ما فھمه المخاطب من کلامک .

وفیه ایضا(۴/ ۲۰۳)ولذلک جوز الکذب لارضاء الزوجة اذالم یتضمن اتلاف حق .

قال شیخنا الفقیه الاعظم فی تکملة فتح الملھم له(۳/۳۲) ولم اجد فی فقھاء الحنفیة القدامی من جو زصریح الکذب فی حالة ما،الافی حالة الاضطرار،ولکن حکی الشیخ ظفراحمد العثمانی عن الامام الشیخ اشرف علی التھانوی رحمة الله علیه انه قال:الحق جواز الکذب الصریح

اذالم يقدر على التعريض فى المواضع الثلاثة المذكورة فى حديث اسماء وعدم جوزه اذاقدرعليه واما ما ذكره فى شرح السير ان الكذب المحض لا رخصة فيه فمبنى على الاحتياط.

ويؤيد الشيخ رحمه الله تعالى ماروى عن بعض الصحابة:ان فى معاريض الكلام لمندوحة عن الكذب ....ويؤ يده ايضا قصة الحجاج بن العلاء ...الخ انظر ايضاً اعلاء السنن (٦٦/١٢)

فى الدرالمختار(٤٢٧/٦) كتاب الكراهية،الكذب مباح لاحياء حقه ودفع الظلم عن نفسه،والمراد التعريض لان عين الكذب حرام قال: وهو الحق،قال تعالىٰ:قتل الخراصون اه

وقد ذكر العلامةالشامى رحمه الله تعالى الضابط الكلى فى جوازالكذب وتحريمه عن احياء العلوم فى حاشيته على الدر(٤٢٧/٦) وانظر الاحياء مع اتحاف السادة المتقين للزبيدى (٢٧٧/٩) ثم قال الشامى مائلا الى حرمة الكذب الصريح:ويؤيده ماورد عن على وعمران بن حصينؓ وغيرهما"ان فى المعاريض لمندوحة عن الكذب،، وهوحديث حسن له حكم الرفع كماذكره الجراحى،وذلك كقول من دعى لطعام اكلت يعنى امس وكما فى قصة الخليل عليه الصلوة والسلام الخ

وفى المرقاة شرح المشكوة(٦٧٧/٩) قال عياض:الصحيح ان الكذب لايقع منهم مطلقا اما الكذبات المذكورات فانما هى بالنسبة الى فهم السامع لكونها فى صورة الكذب واما فى نفس الأمر فليست كذبات

ووافقه شارح من علمائنا حيث قال انما سماها كذبات وان كانت من جملة المعاريض الخ وكذا في الكوكب الدرى على جامع الترمذى (۴/ ۲۰۳)

چند حیلے

(۱) اثاثے کم ظاہر کرنا

اگر ظالمانہ ٹیکس سے بچنے کی کوئی اور صورت ممکن نہ ہوتو بطور توریہ وتعریض زبانی یا حکومت کی طرف سے جاری کردہ فارم میں مال کی تعداد و قیمت کم ظاہر کرنے کی بھی گنجائش ہے، بشرطیکہ اس کے لئے کسی گناہ مثلاً رشوت وغیرہ کا ارتکاب نہ کرنا پڑے، تعداد یا قیمت کم ظاہر کرنا بھی تعریض وتوریہ کی ایک قسم ہے، جھوٹ اور کذب نہیں ہے۔

في الهندية(۵/ ۳۳۹) كتاب الكراهية، الباب الحادى عشر، رجل قال لآخر: كم اكلت من تمرى؟ فقال: خمسة وهو قد اكل العشرة لايكون كاذبا، وكذا لو قال بكم اشتريت هذا الثوب فقال: بخمسة وهو قد اشترى بعشرة لايكون كاذبا كذا في الخلاصة.

انظر خلاصة الفتاوى(۴/ ۳۶۲) كتاب الكراهية.

مثلاً ایک شخص ایک کروڑ اثاثوں کا ملک ہے اور اس سے ظالمانہ ٹیکس وصول کیا جاتا ہے، اس بنا پر وہ فارم میں لکھ دے کہ مثلاً میں بیس لاکھ کا مالک ہوں، تو یہ جھوٹ نہیں کیونکہ وہ بلاشبہ بیس لاکھ کا بھی مالک ہے اور وہ اس پر حلف لے لے تب

بھی درست ہے لیکن یہ اس وقت درست ہے جبکہ اس سے زیادہ کی نفی نہ طلب کی گئی ہو، اگر زبانی یا تحریری طور پر یہ بھی پوچھ لیا گیا کہ کیا تمہاری ملکیت میں اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے، تو اس صورت میں پوری ملکیت بتانی پڑے گی، اس حیلہ سے کام نہیں چل سکے گا۔

☆ مذکورہ اصول کے تحت نکاح فارم میں مہر کی مقدار کم ظاہر کرنا بھی داخل ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ آجکل بعض یونین کونسلو میں مہر کی مقدار کے تناسب سے ٹیکس لگایا جاتا ہے، مہر جتنا زیادہ ہوا اتنا ہی زیادہ ٹیکس وصول کیا جاتا ہے، یہ ٹیکس بلاشبہ ظالمانہ ہے، اس کا مقصد سنت نکاح کی شرح کم کرنے اور شرعی حکم کی حوصلہ شکنی کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے، ایسی صورت میں اگر زبانی طور پر مہر کچھ زیادہ رکھ لیا جائے لیکن نکاح فارم میں کم ظاہر کر کیا جائے تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں ہے البتہ زبانی طور پر جو مہر طے ہوا ہے وہ بہر صورت پورا دینا ضروری ہے، اگر اس بارے اختلاف کا اندیشہ ہو تو فریقین الگ سے ایک دستاویز میں لکھ دیں تا کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

امداد الفتاوی (۱۵۲/۴) کتاب الحظر والاباحۃ میں ہے۔

سوال: زید ٹیکس ادا کرنے کی حیثیت رکھتا ہے تاہم معافی خیال کے سے اپنے مالِ تجارت کو تشخیص کنندہ ٹیکس سے چھپا کر اپنے کو ناقابل ثابت کرتا ہے؟ آیا یہ فعل زید کا ازروئے شرع شریف کیسا ہے؟

جواب: گناہ تو نہیں لیکن خطرے میں پڑنا بھی شرعاً پسندیدہ نہیں۔

آپ کے مسائل اوران کا حل (۲۷۹/۸) میں ہے۔

سوال: ہم باہر سے جو سامان لاتے ہیں اس پر چنگی ناکہ ادا کرنا پڑتا ہے اور چنگی والے خریداری بل دیکھ کر چار فیصد وصول کرتے ہیں، ہم سیٹھوں سے جعلی بل بنوالیتے ہیں، جس سے ناکہ کم ادا کرنا پڑتا ہے، کیا ایسا کرنا یعنی جعلی بل بنوا کر چنگی کم ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ سرکاری ناکہ کم ہوتا ہے لیکن ٹھیکہ دار بولی بڑھا بڑھا کر تقریباً دوگنا زیادہ کر لیتے ہیں، اگر یہ ٹھیکیدار بولی بڑھا کر زیادہ نہ کریں تو سرکاری شرح کم ہوگی۔

جواب: جعل سازی کو جائز تو نہیں کہا جاسکتا مگر چنگی وصول کرنا خود بھی ظلم ہے اور ظلم سے بچنے کیلئے اس میں کچھ تخفیف ہو جائے تو ہو جائے۔

نیز (۱۹۳/۶) میں ہے۔

سوال: محصول چونگی لینا یا دینا کیسا ہے؟ اگر کوئی شخص مال چھپا کر لے گیا تو اس کیلئے وہ مال کیسا ہے؟ اور کیا چونگی ٹھیکدار کو اس کی شکایت لگانا چاہئے؟

جواب: محصول چونگی شرعاً جائز نہیں، اگر مال وآبرو کو خطرہ نہ ہو تو نہ دی جائے۔

فتاوی محمودیہ (۱۸۵/۴) میں ہے۔

سوال: تجارتی مال کا محصول وچونگی دونوں دینی چاہئے یا محض محصول دیدے اور چونگی نہ دے، اس لئے کہ اس کی دکان اس شہر میں ہے، سنا جاتا ہے کہ چونگی نہیں دینی چاہئے۔

جواب: ریل اور ڈاک کا محصول تو دیدیا جائے اور چونگی ظلماً لی جاتی ہے، اس

سے حتی الوسع بچے لیکن دفع ظلم اور حفظ عزت کیلئے جائز ہے۔

(۲) اپنی کمائی دوسرے ملک بھیج کر منگوانا

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ کے بارے مثلاً زید ایک پاکستانی تاجر ہے اور یہاں تجارت کرتا ہے، اس کے پاس دس لاکھ روپیہ ہے، اس نے حکومت کو ٹیکس دینا ہوتا ہے، وہ ٹیکس سے بچنے کیلئے یہ حیلہ کرتا ہے کہ بیرونِ ملک مثلاً سعودی عرب میں اس کا دوست خالد مقیم ہے، زید دس لاکھ کا چیک بنا کر خالد کو بھیج دیتا ہے پھر خالد خود وہی چیک یا چیک کیش کر کے وہ رقم زید کے نام بھیجتا ہے، زید یہاں محکمہ ٹیکس کو کہتا ہے کہ یہ رقم میری یہاں کی کمائی نہیں بلکہ بیرونِ ملک سے خالد نے بھیجی ہے، اس طرح وہ ٹیکس سے بچ جاتا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ:

(۱) زید کیلئے مذکورہ طریقہ سے ٹیکس سے فرار اختیار کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں

(۲) خالد اس خدمت پر کچھ رقم بھی کاٹتا ہے مثلاً ایک لاکھ پر ایک ہزار روپیہ کاٹ لیتا ہے اور باقی بھیج دیتا ہے اور یہ گویا اس کا کاروبار بن چکا ہے، کیا خالد کیلئے اس پر رقم لینا جائز ہے؟

میاں شفاء الرحمٰن اڈیالہ روڈ راولپنڈی

الجواب حامداو مصلیا

(۱) مذکورہ صورت میں زید کیلئے ٹیکس سے بچنے کیلئے یہ کہنا جائز نہیں کہ یہ میری یہاں کی کمائی نہیں کیونکہ یہ صریح جھوٹ ہے اور ایسے موقع پر صریح جھوٹ بولنا شرعاً جائز نہیں، البتہ حکومتی ٹیکس چونکہ ظالمانہ ہوتے ہیں اور دفع ظلم کیلئے توریہ سے کام لینے کی اجازت ہے لہٰذا زید کیلئے یہ جائز ہے کہ مذکورہ طریقہ اختیار کر کے محکمہ

ٹیکس کو یہ کہہ دے کہ یہ رقم تو خالد نے بیرون ملک سے بھیجی ہے یا اس قسم کا کوئی اور ایسا جملہ کہدے کہ جو صریح جھوٹ میں بھی نہ آئے اوراس سے مقصد بھی حاصل ہوجائے۔

فی الدرالمختار:(۶/۴۲۷)الکذب مباح لاحیاء حقه ودفع الظلم عن نفسه والمراد التعریض لان عین الکذب حرام قال:وهوالحق قال تعالیٰ قتل الخراصون.

وفی ردالمحتار:(۶/ ۴۶۸)(قوله جازالکذب)..... نقل فی البزازیة انه ارادبه المعاریض لاالکذب الخالص.

(۲)خالد کیلئے مذکورہ خدمت پر اجرت کے طور پر رقم کاٹنے کی گنجائش ہے بشرطیکہ یہ اجرت پہلے سے طے شدہ ہو۔

فی الدرالمختار:(۶/۵)وشرطها کون الاجرة والمنفعة معلومتین لان جهالتهما تفضی الی المنازعة:

وفی ردالمحتار:(۶/۹۲)قال فی جامع الفصولین:للقاضی ان یاخذ مایجوز لغیره وماقیل فی کل ألف خمسة دراهم لانقول به ولایلیق ذلک بالفقه وای مشقةللکاتب فی کثرة الثمن؟وانماأجرمثله بقدر مشقة قلیلة اوبقدرعمله فی صنعته ایضاًکحکاک وثقاب یستأجرباجر کثیرفی مشقة قلیلة اه قال بعض الفضلاء:افهم ذلک جوازاخذالاجرة الزائدة وان کان العمل مشقة قلیلة ونظرهم لمنفعة المکتوب له.فقط والله اعلم بالصواب

بندہ ضیاء الرحمٰن عفی عنہ
دارالافتاء تعلیم القرآن راولپنڈی
۱۴۲۸/۹/۶ھ

الجواب صحیح
ریاض محمد
دارالافتاء تعلیم القرآن راولپنڈی
۱۴۲۸/۹/۶ھ

انکم ٹیکس سے بچنے کیلئے انشورنس

جدید فقہی مسائل (۴۱۹/۱) میں ہے:

اگر انشورنس کی وجہ سے گورنمنٹ انکم ٹیکس سے چھوٹ دیتی ہو تو انکم ٹیکس سے بچنے کی نیت سے انشورنس کرایا جاسکتا ہے، البتہ اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ جتنی رقم خود اس نے جمع کی ہے اتنی تو اس کیلئے حلال ہے اور کمپنی جو اضافی رقم دے وہ اس کے لئے جائز نہیں، اس کو بلا نیتِ صدقہ غرباء پر یا رفاہی کاموں میں خرچ کر دینا چاہئے، ہاں اگر فرقہ وارانہ فسادات میں اس کو جانی یا مالی نقصان پہنچے تو اب پوری رقم اس کیلئے جائز ہوگی اور یہ زائد رقم حکومت کی طرف سے تحفظ میں کوتاہی کا ہرجانہ تصور کیا جائیگا۔

دھوکہ اور غش

DECEPTION,FRAUD).

شرعاً غش اور دھوکہ دہی حرام ہے اور اس کے نتیجہ میں جو کچھ کمایا ہے وہ بھی بقدرِ غش حرام ہے، اس مسئلہ کی رو سے اگر کسی شخص کے پاس جعلی نوٹ آگیا تو اسے آگے چلانا جائز نہیں ہے ہاں جس نے اسے جعلی نوٹ دیا ہے، اگر وہ معلوم ہوجائے

تو اسے لوٹادے، اگر لوٹانا ممکن نہ ہوتو اس کے مال سے اس قدر اس کی اجازت کے بغیر بھی لے سکتا ہے۔وھی مسئلة الظفر بمال المدیون۔

جعلی نوٹ آگے چلانا اس لئے جائز نہیں کہ ایک تو اس میں دھوکہ ہے اور دوسری وجہ شریعت کا یہ اصول ہے کہ مظلوم اپنے ظالم سے بدلہ لے سکتا ہے لیکن مظلوم کیلئے کسی تیسرے شخص پر ظلم کرنا جائز نہیں ہے، جسے جعلی نوٹ ملا ہے وہ مظلوم ومغرور ہے، وہ اصل ظالم اور غار پر رجوع کرسکتا ہے لیکن تیسرا شخص غیر ظالم اور غیر غار ہے، اس پر ظلم کرنا صحیح نہیں ہے۔

فی قواعد الفقه(ص ۱۲۴) لعمیم الاحسان المجدوی،المظلوم له ان یدفع الظلم عن نفسه بماقدرعلیه لکن لیس له ان یظلم غیره.رقم القاعدة ۳۳۲

وفیهاایضاً(ص ۱۲۶)المغروریرجع علی الغاربماغره.

رقم القاعدة ۳۴۰

فی الهدایة(۱۳۰/۳) کتاب الکفالة،قال زفر:لایرجع لانه لما انکرفقد ظلم فی زعمه فلایظلم غیره.

وفی الدر(۳۳۲/۵)کتاب الکفالة والاصل ان المغرورانما یرجع علی الغاراذاحصل الغرور فی ضمن المعاوضة اوضمن الغار صفة السلامة للمغرورنصاً.

وفی الشامیة(قوله فی ضمن المعاوضة)احترزعمااذا کان فی ضمن عقد التبرع کالهبة والصدقة.

ظالمانہ ٹیکس میں جعلی نوٹ دینا

ظالمانہ ٹیکس میں جعلی نوٹ دینا جائز ہے؟اس بارے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس میں جعلی نوٹ دیکر جان چھڑانا جائز ہے اوران کا استدلال الاشباہ کی مندرجہ ذیل عبارت سے ہے۔

فی الاشباہ والنظائرلابن نجیم(۲/۱۵۵)الفن الثانی:الفوائد کتاب البیوع رقم المسئلة ۱۳۳۱.الغش حرام الا فی مسألتین،احد هما فی"الولوالجیة"اشتری المسلم الاسیر من دارالحرب ودفع الثمن دراهم زیوفا اوعروضا مغشوشة جاز ان کان حراوان کان الاسیر عبدا لم یجز. الثانیة یجوز اعطاء الزیوف والناقص فی الجبابات .

وفی غمزعیون البصائرللحموی تحته:قوله یجوز اعطاء الزیوف والناقص فی الجبایات،جمع جبایة مما یجبی من الناس ظلماً،قال بعض الفضلاء:تلحق بالجبایات محصول القاضی فی زماننا،انتهی وقد صحف بعض الفضلاء الجبایات بالباء بالجنایات بالنون واستشکل دفع الزیوف فیها بان الارش الذی یعطی فی الجنایات حق شرعی.

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ دو مواقع میں دھوکہ دینا جائز ہے۔

(۱)ایک آزاد مسلمان دارالحرب میں قید ہے وہ وہاں کافروں سے کوئی چیز خرید کر ناقص اور کھوٹے دراہم یاملاوٹ کا سامان بطور ثمن دے دے تو درست ہے۔

(۲) ظالمانہ ٹیکس میں کھوٹے اور ناقص درہم دینا صحیح ہے۔

لیکن صحیح یہ ہے کہ ظالمانہ ٹیکس میں جعلی نوٹ چلانا جائز نہیں ہے،اس

میں دھوکہ دہی ہے، اس کا گناہ ہوگا البتہ اس کے نتیجہ میں جو صحیح نوٹ بچ جائیں وہ حلال ہیں، یہ عمل ناجائز ہے اور دلیل اس کی غش اور دھوکہ کی دہی سے ممانعت والے نصوص کا عموم ہے کہ شرعاً دھوکہ دہی مطلقاً حرام ہے اور جن حضرات نے الاشباہ کے مذکورہ جزئیہ سے استدلال کیا ہے یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں چاندی کے جو ناقص زیوف اور کھوٹے دراہم ہوتے تھے وہ عرفاً اور شرعاً مال ہی تصور کئے جاتے تھے، فرق صرف وصف جودۃ اور رداء ت کا ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص جید دراہم کی جگہ زیوف ادا کردیتا تو شرعاً ادائیگی درست تسلیم کی جاتی تھی، بخلاف جعلی نوٹوں کے کہ یہ کسی کے ہاں مال نہیں، بلکہ ان کو چلانے والا عرفاً، قانوناً اور شرعاً قابلِ مواخذہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ جعلی نوٹ دراہم زیوف کی طرح نہیں ہیں بلکہ دراہم کاسدہ کی طرح ہیں لہٰذا جعلی نوٹ کو زیوف پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔

نیز ٹیکس میں جعلی نوٹ ادا کرنے میں ہتکِ عزت کا خطرہ ہے کیونکہ اگر پکڑا گیا تو سزا مل سکتی ہے اور عزت مجروح ہوسکتی ہے، حیلہ اور توریہ وغیرہ میں ہتک عزت کا خطرہ نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر ہتک عزت کا خطرہ ہو تو حیلہ اور توریہ بھی درست نہیں ہے۔ چنانچہ اثاثے کم ظاہر کرنے کی صورت میں اگر پوچھ گچھ ہو اور پھنس جانے اور عزت مجروح ہونے کا غالب گمان ہو تو اثاثے کم ظاہر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

فی الهداية(۱۱۰/۳) كتاب البيوع، مسائل منثورة قبيل كتاب الصرف، ومن له على اخر عشرة دراهم جياد فقضاه زيوفا وهو لايعلم

فانفقها اوهلک فهوقضاء عند ابی حنیفة ومحمدؒ وقال ابویوسفؒ یرد مثل زیوفه ویرجع بدراهمه لان حقه فی الوصف کهوفی الاصل،ولایمکن رعایته بایجاب ضمان الوصف لانه لاقیمة له عند المقابلة بجنسه فوجب المصیرالی ماقلنا ولهما انه من جنس حقه حتی لوتجوزبه فیما لایجوزالاستبدال جاز فیقع به الاستیفاء ولایبقی حقه الافی الجودة ولایمکن تدارکهابایجاب ضمانها لما ذکر نا وکذا بایجاب ضمان الاصل لانه ایجاب له علیه ولا نظیر له.

بعض حضرات کا موقف اور ایک شبہ

سابقہ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ظالمانہ ٹیکس سے شرعی حدود وشروط میں رہ کر اپنے آپ کو بچانا اور حیلہ اختیار کرنا جائز ہے،اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اگرکوئی شخص اس طرح ٹیکس سے بچ جائے تو یہ دوقسم کے مظالم کا سبب بنے گا۔

(۱)حکومت کے پاس ٹیکس کی مطلوبہ رقم جمع نہ ہوگی اوراخراجات پورے نہ ہوں گے تو حکومت مزید ظالمانہ ٹیکس لگائے گی،یہ واقعہ ہے کہ حکومت ٹیکس کی مد میں وصول کی جانے والی رقوم کا اندازہ کرتی ہے پھر جب وہ وصول نہیں ہوتی تو مختلف قسم کے دیگر ٹیکس لگا کراس کو پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے،اور جہاں قدرت ہوتی ہے تو مہنگائی کردی جاتی ہے،مثلاً پٹرول کی قیمت بڑھادی جاتی ہے،غرضیکہ حکومت کا ظلم تو ایک مستقل عامل(Facter)ہے ہی لیکن جولوگ ٹیکس لاگوہونے کے بعدنہیں دیتے یاکم دیتے ہیں وہ بھی کسی درجہ میں مزیدٹیکسوں کے لاگوہونے اورمہنگائی کا سبب بنتے ہیں۔

(۲) یہ ٹیکس دوسرے افراد سے وصول کیا جائے گا اور یہ شخص دوسرے افراد پر حمل ظلم کا سبب بنے گا لہٰذا یہ جائز نہیں ہونا چاہئے، اسی وجہ سے بعض حضرات کا مؤقف یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے اپنے ذمہ کا ٹیکس دینا ضروری ہے، کوئی حیلہ اختیار کر کے خود ٹیکس سے بچنا اور دوسروں پر اس کا بوجھ ڈالنا صحیح نہیں ہے اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ٹیکس دو طرح کا ہوسکتا ہے۔

(۱) کسی خاص علاقے، جماعت اور قوم پر ایک متعین مقدار میں ظالمانہ ٹیکس مقرر کر دیا گیا ہے، اتنی مقدار بہر صورت ان سے وصول کرنی ہے، ایسے ٹیکس سے بچنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر یہ بچ گیا تو لازماً وہ مقدار اس طبقہ کے دوسرے لوگوں سے وصول کی جائیگی اور یہ شخص حمل الظلم علی الغیر کا سبب بنے گا۔

(۲) عمومی ٹیکس ہو اور ادا کنندہ گا متعین نہ ہوں، اس صورت میں حیلہ کر کے اس ٹیکس سے بچنا جائز ہے، اس میں حمل الظلم علی الغیر نہیں ہے، اگر ٹیکس نہ دیا تو حکومت کے ٹیکس میں صرف کمی آجائیگی۔

حضرت مولانا مفتی ڈاکٹر عبدالواحد صاحب ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

غرض یہی بات راجح نظر آتی ہے کہ ہر شخص اپنے حصے کا ٹیکس ادا کرے پھر بہت سے ٹیکس تو دینے پڑتے ہیں البتہ انکم ٹیکس ایسی چیز ہے کہ آمدنی کم دکھا کر کم ٹیکس ادا کیا جائے لیکن جب ہم یہ کہیں کہ ہر شخص اپنے حصے کا ٹیکس پورا ادا کرے تو ہمارے ملک کا نظام آڑے آجاتا ہے، اگر ایک شخص اپنی پوری آمدنی دکھا کر پورا ٹیکس ادا کرے تو محکمہ والے اسے سچا سمجھنے پر تیار نہ ہوں گے اور وہ اسے جھوٹا اور چور سمجھ

کر زائد ٹیکس تشخیص کریں گے اور اس طرح سچ بولنے والے کو سچ بہت مہنگا پڑے گا
اس کا حل یہ ہے کہ:

آمدنی والا اپنی آمدنی پر جتنا ٹیکس قانوناً بنتا ہے اس کی تشخیص کرے پھر اس میں سے جتنا ٹیکس وہ زیادہ سے زیادہ دے سکتا ہو، سرکاری خزانے میں جمع کرادے باقی رقم صدقہ کردے، اب محکمہ والوں کو جو کچھ رشوت کے طور پر دینا پڑے گا وہ محض دفع ظلم کیلئے ہوگا، اس طرح سے وہ دوسروں پر ظلم کا سبب بھی نہیں بنے گا، کیونکہ وہ تو پورا ٹیکس دینے کیلئے تیار ہے چونکہ نظام آڑے آرہا ہے لہٰذا وہ حتی المقدور ٹیکس جمع کرا کے باقی رفاہِ عامہ میں صدقہ کردے جو کہ ٹیکس کا ایک اہم مصرف ہے۔

تنبیہ: چونکہ رشوت خوری کی کثرت ہے لہٰذا جب دفع ظلم کے نام پر رشوت دیں گے جو اگرچہ ان کے حق میں رشوت نہ بھی ہو اور خاندان کے خاندان رشوت اور حرام پر پلیں گے تو نئی نسل کو حرام اور رشوت سے کیوں پرہیز ہوگی؟ کیا ان کی حرام خوری میں دینے والے سبب نہیں بنیں گے جبکہ کوئی مجبوری نہ ہو لہٰذا ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ کمائی کا ایک درجہ ضرورت کا ہے اور ایک کچھ آسانی کا، اس کے بعد مباح ہے، مباح کیلئے جو کچھ رشوت دینی پڑے وہ دینا بھی ناجائز ہے کیونکہ مباح کی تحصیل صرف اس وقت جائز ہے جبکہ کوئی حرام وناجائز کام نہ کرنا پڑے، اس قول کی تائید میں یہ جزئیہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔

فی ردالمحتار(۸۸/۴) کتاب السرقة، لوسعی الی سلطان بمن یؤذیه والحال انه لا یدفع بلا رفع الی السلطان اوسعی بمن یباشر الفسق ولایمتنع بنهیه اوقال لسلطان قد یغرم وقدلایغرم انه قد وجد کنزا فغرمه

السطان شيئا لا يضمن في هذه المذكورات ولوغرم السلطان البتة بمثل هذه السعاية ضمن وكذا يضمن لوسعى بغير حق عند محمد زجراًله:اى للساعي،وبه يفتى وعزراه.

اس مسئلہ میں ساعی سبب ہے اورسلطان مباشر مختار ہے لیکن اس کے باوصف ساعی پر ضمان لازم کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ جہاں سبب اور مباشر جمع ہوں تو ضروری نہیں کہ فعل کی نسبت مباشر کی طرف ہی ہو بلکہ مسبب کی طرف بھی نسبت ہوسکتی ہے حتی کہ اس پر ضمان بھی لازم ہوسکتا ہے ۔

جواب

صحیح یہی ہے کہ حیلہ کے ذریعہ ناجائز ٹیکس سے بچنا جائز ہے اور مذکورہ اعتراض یابعض حضرات کی دلیل کاجواب یہ ہے کہ کسی معصیت اور شر کا تسبب (سبب بنا)مطلق ناجائزنہیں ہے بلکہ اس بارے کچھ تفصیل ہے،حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بزبانِ عربی اس موضوع پر دوعمدہ رسالے تحریر فرمائے ہیں ۔

(۱)تفصيل الكلام في مسئلة الاعانة على الحرام.

یہ رسالہ جواہر الفقہ (۴۳۹/۲)میں موجود ہے اور اسکے ساتھ اردو میں اس کا خلاصہ بھی تحریر کردیا ہے ۔

(۲)الابانة لمعنى التسبب والاعانة.

یہ رسالہ احکام القرآن للتھانوی (۷۴/۳)میں موجود ہے، تفصیل وہاں دیکھی جاسکتی ہے، یہاں حضرت کے اردومقالے سے اس بحث کاخلاصہ نقل کیا

جاتا ہے۔

اگر "تسبب" کے مفہوم کو مطلقاً سبب کیلئے عام رکھا جائے تو شاید دنیا کا کوئی مباح کام بھی مباح اور جائز نہیں رہے گا، مثلاً زمین سے غلہ اور پھل اگانے والا اس کا بھی سبب بنتا ہے کہ اس غلہ اور ثمرات سے اعداء اللہ (اللہ کے دشمنوں) کو نفع پہنچے، کپڑا بننا، مکان بنانا، ظروف اور استعمالی چیزیں بنانا، ان سب میں بھی یہ ظاہر ہے کہ ہر ایک نیک اور فاجران کو خریدتا ہے اور استعمال کرتا ہے اور اپنے فسق وفجور میں بھی استعمال کرتا ہے اور سبب اس کا ان چیزوں کا بنانے والا ہوتا ہے، اگر اس طرح حرمت کو عام کیا جائے تو شاید دنیا میں کوئی کام بھی جائز نہ رہے، ضروری ہے کہ سبب قریب اور بعید کا فرق کیا جائے، سبب قریب ممنوع اور سبب بعید مباح ہو، مذکورہ مثالیں سب کی سب سبب بعید کی مثالیں ہیں، اس لئے وہ جائز رہیں گی۔

پھر سبب قریب کی بھی دو قسمیں ہیں ایک سبب جالب وباعث جو گناہ کیلئے محرک ہو کہ اگر یہ سبب نہ ہو تو صدور معصیت کیلئے کوئی اور ظاہری وجہ نہ تھی، ایسے سبب کا ارتکاب گویا معصیت ہی کا ارتکاب ہے، علامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ نے موافقات کی جلد اول کے مقدمہ میں ایسے ہی اسباب کے متعلق فرمایا ہے کہ: ایقاع السبب ایقاع للمسبب یعنی سبب کا ارتکاب مسبب ہی کا ارتکاب ہے، چونکہ ایسے اسباب معصیت کا ارتکاب گویا خود معصیت ہی کا ارتکاب ہے، اسلئے معصیت کی نسبت اس شخص کی طرف کی جائیگی جس نے اس سبب کا ارتکاب کیا ہے، کسی فاعل مختار کے درمیان میں حائل ہونے سے معصیت کی نسبت اس سے منقطع نہیں ہوگی۔ جیسا کہ حدیث شریف میں دوسرے شخص کے ماں باپ کو کوئی گالی دینے والے کے

حق میں اپنے ماں باپ کو گالی دینے والا کہا گیا ہے کیونکہ ایسا تسبب للمعصیۃ بنص قرآن وحدیث خود ایک معصیت ہے۔

سبب قریب کی دوسری قسم یہ ہے کہ وہ سبب قریب تو ہے مگر معصیت کیلئے محرک نہیں بلکہ صدورِ معصیت کسی دوسرے فاعل مختار کے اپنے فاعل سے ہوتا ہے۔ جیسے: بیع العصیر ممن یتخذ خمرا یا اجارۃ الدار لمن یتعبد فیھا للاصنام وغیرہ۔

تو یہ بیع اور اجارہ اگرچہ ایک حیثیت سے معصیت کا سبب قریب مگر بذات خود جالب اور محرک للمعصیت نہیں ہیں، ایسے سبب قریب کا حکم یہ ہے کہ اگر بیچنے یا اجارہ پر دینے والے کا مقصد مشتری اور متاجر کی اعانت علی معصیۃ ہو تو یہ خود ارتکاب معصیت اور اعانت علی المعصیۃ میں داخل ہوکر قطعاحرام ہے اور اگر بیچنے والے اور کرایہ پر دینے والے کا یہ مقصد نہ ہو تو پھر دو صورتیں ہیں، ایک یہ صورت ہے کہ بیچنے والے کو معلوم ہی نہ ہو کہ وہ شخص شیرہ انگور خرید کر سرکہ بنائے گا یا شراب بنائے گا، اس صورت میں تو یہ بیع بلا کراہت جائز ہے اور اگر بائع کو معلوم ہو کہ یہ شخص شیرہ انگور سے شراب بنائے گا تو اس صورت میں بیچنا مکروہ ہے، پھر اس مکروہ کی بھی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ وہ مبیع کسی تغیر اور تبدیلی کے بغیر بعینہٖ معصیت میں استعمال ہوتی ہو تو اس صورت میں اس کی بیع مکروہ تحریمی ہے، دوسری یہ کہ وہ مبیع کچھ تصرف اور تبدیلی کے بعد معصیت میں استعمال ہو سکے گی تو اس صورت میں اس کی بیع مکروہ تنزیہی ہے۔

جواہر الفقہ (۴۶۲،۴۶۰/۲) تلخیص از فقہی مقالات (۳۱،۲۸/۳)

اب دیکھنا یہ ہے کہ ظالمانہ ٹیکسوں سے بچنے کا حیلہ اختیار کرنا، دوسروں پر وضع ظلم، مزید ٹیکس لاگو کرنے اور مہنگائی کا کیسا سبب ہے، اگر یہ سبب قریب بھی ہو تو ظاہر ہے کہ جالب ومحرک نہیں ہے یعنی یہ ضروری نہیں کہ اگر یہ حیلہ اختیار نہ کیا جائے تو حکومت مزید ٹیکس ہرگز نہیں لگائے گی، اسی طرح حیلہ اختیار کرنے والے کی نیت بھی یہ نہیں ہوتی کہ حکومت مزید ٹیکس لگائے یا میرے حصے کا ٹیکس دوسرے ادا کریں اور ہر شخص کو اس کا بھی علم نہیں ہوتا کہ حیلہ اختیار کرنے کی صورت میں مذکورہ مسببات ضرور مرتب ہوں گے اور واقعہ میں بھی ان کا تحقق ضروری نہیں ہوتا، اور اگر معلوم ہو جائے کہ یہ مسببات ضرور متحقق ہوں گے تو بھی چونکہ یہاں کوئی ایسی نیت موجود نہیں کہ اسکے ساتھ معصیت متحقق ہو، اس لئے اس تسبب کو مکروہ تنزیہی بھی نہیں کہا جا سکتا۔

اور شامیہ کے مذکورہ جزئیہ سے بھی استدلال درست نہیں ہے، اس کی توضیح یہ ہے کہ فعل کی نسبت کب مباشر کی طرف ہوگی اور کب مسبب کی طرف؟ اس بارے اصول میں کچھ تعارض سا پایا جاتا ہے، استاذی المکرم شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے تمام اصول وضوابط کا تجزیہ کر کے جو خلاصہ لکھا ہے وہ یہ ہے۔

(۱)اذاکان المباشرهوالسبب الوحيد في الاتلاف فهوضامن، سواء كان متعديا اوغير متعد، بمعنى انه لم يفعل فعلا محظورا في نفسه.

(۲)اذااجتمع المباشرو المسبب وليس احد منهما متعديا بالمعنى المذكور فالضمان على المباشر.

(۳) اذا اجتمع المباشر والمسبب والمباشر متعد والمسبب غیر متعد فالضمان علی المباشر.

(۴)اذااجتمع المباشروالمسبب وکل واحدمنهمامتعد،فالضمان علی المباشرایضاً.

(۵)اذااجتمع المباشروالمسبب والمسبب متعد والمباشر غیر متعد فالضمان علی المسبب اھ

بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة (۱/۳۱۰)قواعدومسائل فی حوادث المرور.

اس کی رو سے مسبب کی طرف فعل کی نسبت کرنے اوراس پر ضمان واجب کرنے کی صرف ایک صورت ہے،وہ یہ کہ مسبب متعدی ہو اور مباشر متعدی نہ ہو حتی کہ اگر دونوں متعدی ہوں تو بھی مسبب پر ضمان واجب نہیں ہے، معلوم ہوا کہ اگر مسبب متعدی نہ ہوتو فعل کی نسبت اس کی طرف نہیں ہوسکتی،شامیہ کے مذکورہ جزئیہ میں ساعی متعدی ہے،اس لئے اس پر ضمان واجب کیا گیا ہے۔

وکذایضمن لوسعی بغیرحق الخ اورولوغرم السلطان البتة الخ ضمان کی وہ صورت بنتی ہے جس میں مسبب کو معلوم ہوتا ہے کہ میری چیز ناجائز استعمال ہوگی،جبکہ اس کے برعکس ناجائزٹیکس سے بچنے کیلئے حیلہ اختیار کرنے والا غیرمتعدی مسبب ہے اورحکومت فاعل مختاراورمتعدی مباشر ہے اوریہ مذکورہ پانچ صورتوں میں سے تیسری صورت بنتی ہے،لہٰذا حیلہ اختیارکرنے کی صورت میں جو خرابیاں پیش آتی ہیں ان کی نسبت حکومت کی طرف ہوگی،حیلہ کرنے والے کی طرف

نہ ہوگی۔

فی الدرالمختار(۳۳۶/۲)دفع النائبة والظلم عن نفسه اولی الااذا تحمل حصته باقيهم.

وفی الشامية:(قوله دفع النائبة والظلم عن نفسه اولی الخ) النائبة ما ينوبه من جهة السلطان من حق او باطل اوغيره كما فی القنية عن البزدوی والمراد دفع ماكانت بغير حق، ولذا عطف الظلم تفسيرا ولهذا عن شمس الائمة السرخسی:توجه علی جماعة جباية بغيرحق فلبعضهم دفعها عن نفسه اذالم يحمل حصته علی الباقين والا فالاولی ان لا يدفعها عن نفسه ثم نقل صاحب القنية عن شيخه بديع ان فيه اشكالا لان اعطاء اعانة للظالم علی ظلمه فان اكثر النوائب فی زماننا بطريق الظلم فمن تمكن من دفع الظلم عن نفسه فذلک خير له ملخصا وعليه مشی ابن وهبان فی منظومه واجاب ابن الشحنة بان الا شكال مدفوع بما فيه من انواع الظلم علی الضعيف العاجزبواسطة دفعه عن نفسه اه قلت: فيه نظر فان ماحرم اخذه حرم اعطائه كما فی الاشباه الالضرورة فاذا كان الظالم لا بد من اخذه المال علی كل حال لايكون العاجز عن الدفع عن نفسه المابالاعطاء بخلاف القادر فانه باعطائه مايحرم اخذه يكون معينا علی الظلم باختياره تأمل(قوله حصته)مفعول تحمل وباقيهم فاعله ای باقی جماعته .

قال الرافعی:(قول الشارح دفع النائبة والظلم عن نفسه اولی

الخ)ليس المراد به مايتبادر منه بل انه لازم (قوله يكون معينا على الظلم الخ)هو وان كان كذلک يتحمل لدفع الضرر عن الضعيف ولودفع عن نفسه يكون معينا على ظلم الفقير فيرتكب الاخف تأمل.

فى القنية(ص١٧٣)كتاب الكراهية والاستحسان،باب فى الاستحلال وردالمظالم والخروج عن عهد تها ومايتعلق بالنواب والجبايات.

توجه على جماعةجباية بغير حق فلبعضهم دفعه عن نفسه اذالم يحمل حصته من الباقين والا فالا ولى ان لايد فعها عن نفسه،قال رحمه الله:وفيه اشكال لان اعطائه اعانة للظالم على ظلمه ثم ذكرالسرخسى مشاركة جرير بن عبداللهؓ وولده مع سائر الناس فى دفع النائبة بعد الدفع عنه ثم قال هذا كان فى ذلک الوقت لانه اعانة على الطاعة واكثر النوائب فى زماننا بطريق الظلم فمن تمكن من دفع الظلم عن نفسه فذلک خيرله.

فى ردالمحتار(٣٣٢/٥) كتاب الكفالة (تتمه) من اصحابنا من قال:الافضل ان يساوى اهل محلته فى اعطاء النائبة قال القاضى:هذاكان فى زمانهم لانه على اعانة على الحاجة والجهاد،امافى زماننا فاكثر النوائب تؤخذ ظلما ومن تمكن من دفع الظلم عن نفسه فهو خيرله،نهر وتمامه فى الفتح،ونقل فى القنية ان الاولى الامتناع ان لم يحمل حصته على الباقين والا فالاولى عدمه،ثم قال:وفيه اشكال لان الاعطاء اعانة

للظالم علی ظلمه .

قال الرافعی:(قوله وفیه اشکال لان الاعطاء اعانة للظالم علی ظلمه)یندفع الاشکال بان الظلم هنا محقق وتحمله له اولی من تحمله لغیره والا ولی منه ان یعطی من هو عاجزعن دفع الظلم عن نفسه اعانة له علی دفع الظلم عن نفسه.

رشوت دے کر ظالمانہ ٹیکس سے بچنے کی تحقیق

جو ٹیکس واقعۃً ظالمانہ ہے اور اس سے بچنے کا رشوت کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ کارآمد نہ ہو تو رشوت دیکر اس سے جان چھڑانے کی گنجائش ہے بشرطیکہ رشوت دیکر ٹیکس کی معتد بہ رقم بچ جاتی ہو، اگر رشوت کی رقم ہی ٹیکس کی رقم کے برابر یا اس کے قریب قریب ہے تو ایسی صورت میں رشوت دینا درست نہیں، اس سے بہتر یہی ہے کہ ٹیکس کی پوری رقم دیدے، رشوت کا ارتکاب نہ کرے، کیونکہ ٹیکس کی رقم کے بارے امید کی جاسکتی ہے کہ شاید وہ یا اس کا بعض حصہ مفاد عامہ میں صرف ہوجائے اور ملک وملت کی تعمیر میں حصہ بن جائے لیکن رشوت تو بہر حال کسی ایک یا چند افراد کے ہاتھ لگے گی۔

جن حضرات نے ظالمانہ ٹیکس سے بچنے کیلئے رشوت دینے کی اجازت نہیں دی تو یہ سدا للذریعہ ہے یعنی شرعی اصول وقواعد کی رو سے اس کی اجازت تو ہے لیکن اگر اس کی عام اجازت دیدی جائے تو عوام الناس چونکہ شروط وقیود کی رعایت نہیں کرتے، اس لئے ظالمانہ اور عادلانہ ٹیکس کا فرق نہیں کریں گے، اور رشوت کی سنگینی دل سے نکل جائیگی، اس لئے فی نفسہ اجازت کے باوجود حتی الامکان اس سے

احتراز ضروری ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ چند شرائط کے ساتھ رشوت دیکر ظالمانہ ٹیکس سے بچنا جائز ہے۔

(۱) وہ ٹیکس واقعی ظالمانہ وجابرانہ ہو۔

(۲) رشوت کے علاوہ بچنے کی کوئی صورت، طریقہ اور حیلہ کارگر ثابت نہ ہو

(۳) رشوت کے نتیجہ میں ٹیکس کی معتد بہ رقم بچتی ہو۔

(۴) رشوت کا ارتکاب بقدرِ ضرورت کیا جائے۔

(۵) اس کی عام تشہیر کرنا صحیح نہیں ہے۔

فی الدر المختار ۶ / ۴۲۳) کتاب الکراھیة،فصل فی البیع،لابأس بالرشوة اذاخاف علی دینه والنبی صلی الله علیه وآله وسلم کان یعطی الشعراء ولمن یخاف لسانه وکفی بسهم المؤلفة من الصدقات دلیلا علی أمثاله.

وفی الشامیة:(قوله اذاخاف علی دینه)عبارة المجتبی لمن یخاف وفیه ایضا دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولا ستخراج حق له لیس برشوة یعنی فی حق الدفع اه(قوله کان یعطی الشعراء)فقد روی الخطابی فی الغریب عن عکرمة مرسلا قال: اتی شاعر النبی صلی الله علیه وآله وسلم فقال یابلال اقطع لسانه عنی فاعطاه اربعین درهما.

فتاوی رحیمیہ (۲۵۶/۶) میں ایک سوال کے جواب میں ہے۔

میونسپلٹی کا ٹیکس بچا کر پولیسوں اورافسروں کو رشوت دینااوران کواس کا عادی بنانا کوئی اچھا کام نہیں ہے،اس سے بہتر تو یہی ہے کہ ٹیکس پورا دیدیا جائے،نہ دینے میں کبھی ذلیل اور بے عزت ہونے کا موقعہ آجاتا ہے اورخود کوذلیل کرنا شرعاً جائز نہیں۔

آپ کے مسائل (۱۷۹/۶) میں ایک سوال کے جواب میں ہے:

رشوت اگر دفع ظلم کیلئے دی گئی ہو تو امید کی جا سکتی ہے کہ دینے والے کی بجائے صرف لینے والا گنہگار ہوگا۔

ٹیکس اور مسئلہ ظفر بالمال

اگر کسی شخص کا دوسرے کے ذمہ دین ہو اور مدیون کسی وجہ سے ادا نہ کرتا ہو،ٹال مٹول سے کام لیتا ہو تو شرعاً دائن مدیون سے اپنا حق چوری چھپے اور غصب کر کے بھی لے سکتا ہے اور متاخرین کا فتوی یہ ہے کہ اپنے حق کی جنس کے علاوہ جنس سے بھی وصول کرسکتا ہے، لیکن صرف اپنے حق کی مقدار لے سکتا ہے،اس زائد نہیں لے سکتا۔

اس اصول کی روشنی میں حکومت وقت نے اگر کسی سے ظالمانہ ٹیکس وصول کیا ہے جس کی واپسی کی کوئی دوسری صورت نہیں ہے اور اسے شدید ضرورت بھی ہے تو وہ شخص دیانۃً کسی بھی طریقہ سے حکومت سے اپنا حق وصول کرسکتا ہے، مثلاً سرکاری املاک بجلی ،گیس، ٹیلیفون، ریلوے، وغیرہ سے استفادہ کرلے اور اس کا معاوضہ نہ ادا کرے یعنی جس قدر اس سے ظالمانہ ٹیکس وصول کیا گیا ہے،اتنی مقدار کی حدتک سرکاری املاک سے فائدہ اٹھالے تواس کی دیانۃً اجازت ہے، تاہم قضاء اور قانوناً

چونکہ اس کے خلاف کاروائی ہوسکتی ہے اگرچہ دیانۃً وہ گناہگار نہ ہوگا،اس لئے اس سے حتی الامکان احتراز ضروری ہے۔ھذا مما یعرف ولا یعرف

خلاصہ یہ کہ مسئلہ ظفر بالمال کے تحت حکومت کی املاک سے استفادہ کی چند شرائط کے ساتھ گنجائش ہے (۱) ٹیکس واقعی ظالمانہ ہو(۲) اس رقم کی واپسی کی کوئی دوسری صورت نہ ہو اور نہ ابتداءً اس ظالمانہ ٹیکس سے بچنے کا کوئی حیلہ موجود ہو(۳) اس کی واقعی ضرورت ہو(۴) صرف اپنے حق کی حد تک استفادہ ہو،اس سے زیادہ ہرگز جائز نہیں(۵)ھذا مما یعرف ولا یعرف.

فی الدرالمختار(۹۴/۴) کتاب الحدود،باب حد السرقہ ومثل دینہ ولو دینہ مؤجلا الخ

قال الامام الشامی رحمہ اللہ: فاذا ظفر بمال مدیونہ لہ الاخذ دیانۃ بل لہ الأخذ من خلاف الجنس علی مانذکرہ قریبا.

وفی الدرایضا واطلق الشافعی اخذ خلاف الجنس للمجانسۃ فی المالیۃ:قال فی المجتبی وھو اوسع فیعمل بہ عند الضرورۃ.

قال الامام الشامیؒ:(قولہ واطلق الشافعیؒ اخذ خلاف الجنس) ای من النقود اوالعروض لان النقود یجوزاخذ ھاعند نا علی ماقررنا ہ انفاً قال القھستانی:وفیہ ایماء الی ان لہ ان یاخذ من خلاف جنسہ عند المجانسۃ فی المالیۃ،وھذا اوسع فیجوز الأخذ بہ وان لم یکن مذھبنا،فان الانسان یعذرفی العمل بہ عندالضرورۃ کمافی الزاھدی اہ قلت:وھذا ما قالوا لا انہ مستندلہ لکن رأیت فی شرح نظم الکنز للمقدسی من کتاب

الحجرقال:ونقل جد والدی لامه الجمال الاشقرفی شرحه للقدوری ا
عدم جوازالاخذمن خلاف الجنس کان فی زمانهم لمطاو عتهم ل
الحقوق والفتوی الیوم علی جواز الاخذ عند القدرة من ای مال کان ل
سیمافی دیارنا لمدا ومتهم للعقوق:

عفاء علی هذا الزمان فانه.... زمان عقوق لازمان حقوق

وکل رفیق فیه غیر مرافق....وکل صدیق فیه غیر صدوق

قال الامام الرافعی:(قوله الفتوی الیوم علی جواز الأخذ
القدرة الخ) ای عندالضرورةکما یفیده عبارة المجتبی اذ عندعدمها
یؤخذ بمذهب الغیروبه یرد علی من جوزه مطلقا،سندی عن شرح نظم
الکنزاه

چند اسلامی ٹیکس

شریعت میں غیر مسلموں پر چند منصفانہ ٹیکس لگائے گئے ہیں، اس طرح کے ٹیکس تقریباً چار ہیں، جن کا کچھ خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

پہلا ٹیکس ''خراج''

خراج کی لغوی تعریف

خراج باب نصر ینصر سے یا تو مصدر ہے یا اسم مصدر جس کا معنی ہے ''ظاہر ہونا'' لسان العرب میں ہے کہ الخرج والخراج دونوں ایک ہی معنی میں ہیں یعنی اپنے مال سے متعین مقدار نکالنے کا نام الخرج یا الخراج ہے۔

والخرج والخراج واحد وهو شئی یخرجه القوم فی السنة من مالهم بقدر معلوم.لسان العرب(۲/۱۱۲۶)

امام زجاجؒ نے خرج اور خراج میں تھوڑا سا فرق بیان کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ خرج مصدر ہے اور خراج اسم مصدر ہے، خراج کا اطلاق لغۃ اس غلہ پر بھی ہوتا ہے جو زمین یا کسی دوسری چیز سے حاصل ہو۔

انیس الفقہاء میں ہے: **الخرج مایخرج من غلة الارض الخ انیس الفقهاء فی تعریف الالفاظ المتداولة بین الفقهاء(۱/۱۸۵)**

حدیث ''الخراج بالضمان'' میں لفظ خراج کا استعمال غلہ ہی کے معنی میں ہے جس کی پوری تفصیل معجم لغۃ الفقہاء(۱۹۴) اور لسان العرب(۲/۱۱۲۶) میں موجود ہے، خراج کا اطلاق لغۃً اجرت اور کرایہ کے معنی پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ آیت

کریمہ"ام تسالھم خرجا فخراج ربک خیر"میں خراج کا معنی اجرت کے ہے،امام فراء نے آیت کریمہ کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ام تسالھم اجرا.

خلاصہ یہ ہے کہ خراج کا لغوی معنی ظاہر ہوتا ہے اور لغت میں اس کا اطلاق غلہ پر بھی ہوتا ہے اور اجرت پر بھی۔

خراج کی اصطلاحی تعریف

خراج اصطلاح شریعت میں اس اسلامی ٹیکس کو کہتے ہیں جس کو اسلامی حکومت ان اراضی سے لیتی ہے جن کو بزور شمشیر فتح کیا ہو یا مالکان نے اس کے دینے پر صلح کرلی ہو۔

ماتأخذه الدولة من الضرائب على الارض المفتوحة عنوةً اوالارض التى صالح اهلها عليها.معجم لغة الفقهاء(۱۹۴)

الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے کہ خراج کے دو معانی ہیں: ایک عام،دوسرا خاص۔

خراج کا عمومی معنی

خراج عمومی معنی کے اعتبار سے ان اموال کو کہتے ہیں جن کے جمع وصرف کی ذمہ داری حکومت کی ہو،اس معنی کے اعتبار سے خراج کا اطلاق ان تمام صدقات واجبہ و نافلہ پر ہوگا،جن کی وصولیابی اوران کے مصارف پر صرف کرنے کا حق حکومت کو ہے۔

خراج کا خصوصی معنی

خراج اپنے خاص معنی کے اعتبار سے اس ٹیکس کو کہتے ہیں جس کو امام وقت

کسی قابلِ کاشت خارجی زمین پر مقرر کرتا ہے۔

للخراج فی اصطلاح الفقهاء معنيان عام و خاص،فالخراج بمعنى العام:هوالاموال التى تتولى الدولة امرجبايتهاوصرفهافى مصارفها واما الخراج بالمعنى الخاص فهوالوظيفةاوالضريبة التى يفرضهاالامام على الارض الخراجية النامية.

ابو یعلیؒ نے خراج کی تعریف یوں کی ہے.ماوضع على رقاب الارض من حقوق تؤدى عنها.الاحكام السلطانية لابى يعلى(١٦٦)

خراج کا ثبوت قرآن کریم سے

خراج کا ثبوت صراحۃً قرآن کریم سے نہیں ملتا،البتہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں جب عراق، مصر اور شام فتح ہوااور کچھ صحابہ کرامؓ نے وہاں کی زمین اصول کے مطابق غانمین وفاتحین کے درمیان تقسیم کرنے کا مطالبہ کیاتو حضرت عمرفاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وہاں کی زمین کوفاتحین کے درمیان تقسیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے مصلحت عامہ اور تمام مسلمانوں کے لئے وقف قرار دیااور مالکان کے قبضہ میں رکھتے ہوئے ان کی زمینوں پر خراج عائد کیا،اس مسئلہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آیات فئی سے استدلال کیا،حضرت عمرؓکاطریقہ استدلال اس طرح تھا کہ مال فی میں اللہ تعالیٰ نے بعد میں آنے والوں کوبھی شریک کیا ہے،اگر زمین فاتحین کے درمیان تقسیم کر دی جائے تو بعد میں آنے والے محروم رہیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک وقت ایسا آئے کہ غنیمت کی کل جائیداد کا مالک ایک شخص بن جائے او راس کی اولاد میں وہ لوگ بھی ہوں

جومسلم دشمن اور اسلام مخالف ہوں اور مالِ غنیمت کو اسلام کی مخالفت اوردوسروں کواس سے روکنے میں استعمال کریں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عراق، مصراور شام کی مفتوحہ زمین کو فاتحین کے درمیان تقسیم نہ کرنے اور اس پر خراج عائد کرنے میں آیات فئی سے استدلال کیا۔

الموسوعة الفقهية(۱۹/ ۵٦)میں ہے۔

بينت الآيات السابقةالتي احتج بهاالامام عمربن الخطاب رضي الله تعالىٰ عنه حكم مسئلة وقف ارض السواد على جميع المسلمين.

خراج کاثبوت حدیث سے

خراج کاثبوت جس طرح آیات قرآنیہ سے ہے،اسی طرح احادیث نبویہ اورآثار صحابہؓ سے بھی ہے۔

(۱)ابوداؤدشریف میں سہل بن ابی حثمہؓ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیبر کی زمین کو دوحصوں میں تقسیم کرکے ایک حصہ فاتحین کے درمیان تقسیم کردیااور ایک حصہ مصالح عامہ اور تمام مسلمانوں کے لئے وقف کردیااور مالکان کے قبضہ میں رکھ کران سے خراج وصول کیا۔

في سنن ابى داؤد(۲/ ۷۵)كتاب الخراج،باب ماجاء في حكم ارض خيبر،عن سهل بن ابي حثمةؓ قال:قسم رسو ل الله صلى الله عليه وآله وسلم خيبرنصفين نصفا لنوائبه وحاجته ونصفا بين المسلمين، قسمها بينهم على ثمانية عشر سهما.

اس سے معلوم ہوا کہ ہر وہ زمین جو بزورشمشیر فتح کی گئی ہو اور فاتحین کے درمیان تقسیم نہ کی گئی ہو وہ مصلحت عامہ اورتمام مسلمین کے لئے وقف ہوگی اور اس کو مالکان کے قبضہ میں رکھ کرخراج وصول کیا جائے گا۔

الموسوعة الفقهية(۱۹/ ۵۷)میں سہل بن حثمہؓ کی مذکورہ روایت ذکرنے کے بعدلکھاہے:

فالحديث فيه تصريح بماوقع من النبى صلى الله عليه وآله وسلم فى شان خيبرحيث وقف نصفها لمصلحة المسلمين وكذلک الحكم بالنسبة للارض المفتوحة عنوةً.

(۲) صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ کی ایک حدیث میں ہے:

منعت العراق درهمهاوقفيزهاومنعت الشام مديها ودينارها ومنعت مصر ربعتهاودينارا وعد تم من حيث بدأتم قالها ثلاثا شهد على ذلک لحم ابى هريرة رضى الله تعالىٰ عنه ودمه(صحيح المسلم ۲/ ۳۲۴)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم ہوچکاتھا کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم فتح کے بعد زمینوں پرخراج مقرر کریں گے لیکن آپ نے ان کو اس سے منع نہیں کیا بلکہ اس عمل کو باقی رکھا اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے آپ ﷺ نے اس کی حکایت کی۔

الموسوعۃ الفقہیہ (۵۷/۱۹) میں ہے:

ووجه الاستدلال بهذا الحديث ان النبى صلى الله عليه وآله

وسلم علم ان الصحابة رضوان الله عليهم اجمعين سيضعون الخراج على الارض ولم يرشدهم الى خلاف ذلك بل قرره وحكاه لهم ولذلك قال يحيى بن آدم: يريد من هذا الحديث ان رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم ذكر القفيز والدرهم قبل ان يضعه عمر على الارض.

ان روایات کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے ان فیصلوں سے بھی خراج کا ثبوت ملتا ہے، جن میں زمین بزور شمشیر فتح کرکے مالکان کے قبضہ میں رکھتے ہوئے ان سے خراج وصول کیا گیا ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

خراج کا ثبوت اجماع سے

خراج کا ثبوت اجماع سے بھی ہے، خراج کی مشروعیت پر امت کا اتفاق بھی ہے اوراس پر عمل بھی رہا ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں جتنی فتوحات ہوئیں آپ نے ان سب میں خراج عائد کیا۔

خراج کا ثبوت قیاس سے

خراج کی مشروعیت عقلاً اور قیاساً بھی ثابت ہے اور اس کی مشروعیت میں ایک خاص حکمت اور مصلحت بھی ہے، جس مصلحت کے پیش نظر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عراق، شام اور مصر کی زمینوں کو فاتحین کے درمیان تقسیم کرنے سے انکار کردیا اور مصالح عامہ اور تمام مسلمانوں کیلئے وقف کردیا۔

رأى امير المومنين عمر بن الخطاب رضى الله تعالىٰ عنه ان من

المصلحة عدم تقسيم الارض المفتوحة عنوةً ووقفها على جميع المسلمين وضرب الخراج عليها واهم مااقتضى به المصلحة فى ذلک.الموسوعة الفقهية(۱۹/ ۵۷)

خراج کا حکم

خراج ایک خالص اسلامی ٹیکس ہے اور اس میں عبادت کا پہلو بالکل نہیں ہے لہٰذا یہ ابتداءً صرف غیر مسلم رعایا کی زمینوں پر لازم کیا جاتا ہے، ابتداءً مسلمانوں کی زمینوں پر خراج عائد کرنا درست نہیں ہے، البتہ انتہاءً خراج مسلمان پر بھی واجب ہوسکتا ہے، گویا کہ انتہاءً وجوب خراج میں عموم ہے، اور ہر اس شخص پر واجب ہے جس کے پاس قابل کاشت خراجی زمین ہو، خواہ مسلمان ہو یا کافر، بچہ ہو یا بڑا، عاقل ہو یا مجنون، اور مرد ہو یا عورت، کیونکہ خراج قابلِ کاشت زمین کا فریضہ ہے، اور زمین سے نماء کے حصول میں مسلم وکافر، بالغ ونابالغ، وعاقل ومجنون، اور مرد وعورت سبھی برابر ہیں، لہٰذا ان سب لوگوں کی خراجی زمین پر خراج واجب ہوگا۔

الموسوعۃ الفقہیہ (۵٦/۱۹) میں ہے:

الخراج واجب على كل من بيده ارض خراجية نامية سواء كان مسلما ام كافرا،صغيرا ام كبيرا عاقلاام مجنونا،رجلا ام مرأة وذلک لان الخراج مؤنة الارض النامية وهم فى حصول النماء سواء.

سببِ وجوبِ خراج

خراج کے وجوب کا سبب زمین کا قابلِ کاشت ہونا ہے خواہ پیداوار حقیقۃً

موجود ہو یا تقدیراً، اگر پیداوار حقیقۃً موجود نہیں ہے لیکن تقدیراً ہے مثلاً زمین قابل کاشت ہے، یعنی اگر کھیتی کی جائے تو پیداوار حاصل ہوسکتی ہے لیکن کسی وجہ سے کھیتی نہیں ہوگی تو ایسی صورت میں اگرچہ پیداوار حقیقۃً موجود نہیں لیکن تقدیراً ہے، اس لئے اس صورت میں خراج واجب ہوگا، بنجر زمین جو قابل کاشت نہیں ہے، اس میں پیداوار نہ تو حقیقۃً ہے اور نہ تقدیراً، لہذا بنجر زمین میں سبب وجوب خراج نہ پائے جانے کی وجہ سے خراج عائد نہیں ہوگا۔

وجوبِ خراج کی شرطیں

بنیادی طور پر وجوب خراج کی دو شرطیں ہیں، جب دونوں شرطیں پائی جائیں گی تو خراج واجب ہوگا ورنہ نہیں۔

(۱) پہلی شرط زمین کا خراجی ہونا ہے، اگر زمین خراجی نہیں ہے تو اس میں خراج واجب نہیں ہوگا، خراجی زمین کی پوری تفصیل آگے آرہی ہے۔

(۲) وجوب خراج کی دوسری شرط یہ ہے کہ زمین میں نمو کی صلاحیت ہو، اگر زمین بنجر اور ناقابلِ کاشت ہے، اس میں نمو کی صلاحیت نہیں ہے تو پھر خراج واجب نہیں ہوگا۔

اسباب مسقطہ للخراج

(وہ اسباب جن سے خراج ساقط ہوجاتا ہے)

کچھ اسباب ایسے ہیں جن کی وجہ سے وجوب خراج کی شرطیں پائے جانے کے باوجود خراج ساقط ہوجاتا ہے، اور وہ اسباب یہ ہیں:

(۱) کسی خارجی سبب سے زمین کے اندر نمو کی صلاحیت نہ ہو مثلاً زمین پر پانی کا غلبہ ہو یا پانی ختم ہو جائے جس کی وجہ سے زمین پیداوار نہ اگا سکے، تو ایسی صورت میں خراج ساقط ہو جائے گا۔

(۲) پیداوار کسی ساوی آفت سے ہلاک ہو جائے مثلاً کھیتی سیلاب سے غرق ہو جائے یا آگ لگنے سے جل جائے یا شدت ٹھنڈک سے ضائع ہو جائے اور سال کا اتنا حصہ باقی نہ ہو کہ اس میں دوبارہ کھیتی کی جا سکے تو ایسی صورت میں خراج ساقط ہو جائے گا اور اگر سماوی آفت سے پیداوار ضائع ہو گئی لیکن سال کا اتنا حصہ باقی ہے کہ اس میں دوبارہ کھیتی کی جا سکتی ہے جس کی مدت مفتی بہ قول کے مطابق تین ماہ ہے یا پیداوار کسی غیر سماوی ایسی آفت سے ختم ہوئی جس سے بچنا ممکن ہے مثلاً بندر، چوپائے، اور چوہے وغیرہ کے کھانے سے ضائع ہوئی ہے تو ان دونوں صورتوں میں خراج ساقط نہیں ہوگا۔

(۳) فصل کٹنے سے قبل اگر پیداور ہلاک ہو گئی کسی سماوی آفت سے یا غیر سماوی ایسی آفت سے جس سے احتراز ممکن نہیں تو بھی خراج ساقط ہو جائے گا، البتہ اگر فصل کٹنے کے بعد پیداوار ہلاک ہوئی ہے تو خراج مؤظف ساقط نہیں ہوگا لیکن خراج مقاسمہ ساقط ہو جائے گا، کیونکہ خراج مؤظف زمین پر واجب ہے اور خراج مقاسمہ پیداوار پر۔

(۴) خراجی زمین پر کوئی تعمیر کر دی گئی مثلاً رہائشی مکان یا سرائے خانہ بنا دیا گیا یا خراجی زمین کو قبرستان بنا دیا گیا تو ایسی صورت میں بھی خراج ساقط ہو جائے گا۔

(۵) کسی شخص نے زبردستی کھیتی کرنے سے روک دیا اور زمین دار کے اندر

مقابلہ کی صلاحیت نہیں تو ایسی صورت میں بھی خراج ساقط ہوجائے گا۔

(۶) امام وقت خراجی زمین سے خراج کو معاف کر دے، ایسی صورت میں بھی خراج ساقط ہوجائے گا۔

خراج کی قسمیں

خراج کی دو قسمیں ہیں: خراجِ مؤظف اور خراجِ مقاسمہ۔

خراجِ مقاسمہ

مقاسمہ کے معنی بٹائی کے ہیں، خراج مقاسمہ اس اسلامی محصول کو کہتے ہیں جس کو امام وقت خراجی زمین کی پیداوار پر مقرر کرتا ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں نے کسی ملک یا شہر پر عنوۃً یا صلحاً فتح حاصل کی اور امام وقت نے وہاں کی زمین مالکان کے قبضہ میں رکھتے ہوئے زمین کی پیداوار پر خراج عائد کر دیا اور معاملہ اس طرح طے پایا کہ پیداوار کا آدھا یا ایک تہائی یا ایک چوتھائی یا پانچواں حصہ زمین داروں کو ملے گا اور بقیہ حصہ اسلامی حکومت کو دینا ہوگا۔

خراجِ موظف

وہ اسلامی محصول ہے جس کو امام وقت خراجی زمین پر نقد کی صورت میں مقرر کرتا ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں جتنی فتوحات ہوئیں مثلاً عراق، مصر، شام وغیرہ سب جگہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خراج مؤظف مقرر کیا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے:

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

واستفید ان الخراج قسمان،خراج مقاسمة وهوما وضعه الامام على ارض فتحها ومنّ على اهلها بها من نصف الخارج اوثلثه اوربعه....وخراج وظيفة مثل الذى وظفه عمررضى الله تعالىٰ عنه على ارض السواد.ردالمحتار(۲/۲۵۹)

☆ کس خراجی زمین پر خراج مقاسمہ مقرر کیا جائے اور کس پر خراج مؤظف اور اس کی مقدار کیا ہو؟اس سلسلہ میں ضابطہ یہ ہے کہ اختیار شرعاً امام وقت کو ہوگا،وہ حالات کے پیش نظر خراج کی جو بھی قسم اور جو مقدار مقرر کرنا چاہے کرسکتا ہے،البتہ اس کی مقدار نصف سے زائد اور علامہ حدادیؒ کی صراحت کے مطابق خمس سے کم نہیں ہونی چاہئے البتہ خیر الرملیؒ کی تفصیل کے مطابق اگر کسی زمین کی پیداوار کم اور اخراجات زیادہ ہوں تو خمس سے کم بھی مقرر کیا جاسکتا ہے۔

فاذا فتح بلدة ومنّ على اهلها بأرضها له ان يضع الخراج عليها مقاسمة أو موظفا.....وتقديره مفوض الى راى الامام. (ایضاً)

واضح رہے کہ امام وقت ایک مرتبہ جس زمین پر خراج کی جو بھی قسم مقرر کر دے دوبارہ اس میں تبدیلی پیدا نہیں کی جاسکتی مثلاً اگر ایک مرتبہ خراج مقاسمہ مقرر کر دیا تو اس کو خراج موظف میں یا خراج موظف مقرر کر دیا تو اس کو خراج مقاسمہ میں تبدیل نہیں کرسکے گا،اس لئے کہ اس میں نقض عہد ہے جو حرام ہے،البتہ اگر زمین داران تبدیلی پر راضی ہوجائیں تو تبدیل کرنا جائز ہے۔

وفى الكافى:وليس للامام ان يحول الخراج الموظف الى المقاسمة اقول وكذلک عكسه فيما يظهر من تعليله لانه قال لان فيه

نقض العهد وهو حرام.

خراج مقاسمہ اور خراج موظف کے درمیان فرق

ان دونوں کے درمیان بنیادی طور پر فرق ہے کہ خراج مقاسمہ زمین کی پیداوار پر ہے اور خراج موظف خود زمین پر ہے، یہی وجہ ہے کہ خراج موظف سال میں صرف ایک مرتبہ واجب ہے اور خراج مقاسمہ زمین کی پیداوار پر واجب ہے سال میں جتنی مرتبہ پیداوار ہوگی اتنی مرتبہ خراج مقاسمہ ادا کرنا ہوگا۔

خراج کی مقدار

خراج مقاسمہ تو زمین کی پیداوار پر نصف یا ثلث یا ربع یا خمس یا سدس ہے، امام وقت حالات کے پیش نظر اور زمین کی صلاحیت کے مطابق پیداوار کی جو بھی مقدار مقرر کردے اسے ادا کرنا ہوگا، البتہ خراج موظف کے سلسلے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فیصلے موجود ہیں جن سے خراج موظف کی مقدار متعین ہوتی ہے، جن چیزوں میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خراج موظف مقرر فرمادیا ان میں مقرر کردہ مقدار کے خلاف کرنے کا اختیار کسی کو بھی نہیں ہے۔ البتہ جن چیزوں میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب سے کوئی مقدار متعین نہیں ہے، ان چیزوں میں زمین کی قوت وضعف کے اعتبار سے خراج مقرر کیا جاسکتا ہے جو نصف پیداوار سے زائد اور امام حدادیؒ کی صراحت کے مطابق خمس سے کم نہ ہو، البتہ خیر الرملیؒ کی صراحت کے مطابق اگر پیداوار کم ہو اور اخراجات زیادہ ہوں تو خمس سے کم بھی مقرر کیا جاسکتا ہے، جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کے دورِ خلافت میں عراق فتح ہوا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت حذیفہؓ کی نگرانی میں حضرت عثمان بن حنیفؓ کو عراق کی پوری زمین کی پیائش کا حکم دیا جب حضرت عثمان بن حنیفؓ نے عراق کی پوری مفتوحہ زمین کی پیائش کی تو تین کروڑ ساٹھ لاکھ جریب نکلی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عراق کی پوری مفتوحہ زمین پر جو قابلِ کاشت تھی اور اس پر پانی پہنچتا تھا، خراج مؤظف درج ذیل تفصیل کے ساتھ مقرر فرمایا۔

عام زمینوں پر فی جریب ایک درہم نقد اور ایک صاع گندم یا جو یا جو چیز اس میں بوئی جائے، ترکاری کی ایک جریب پر پانچ درہم اور انگور یا کھجور کے باغوں پر جو باہم متصل اور اس قدر گنجان تھے کہ انکے درمیان کاشت نہیں کی جاسکتی تھی فی جریب دس درہم مقرر فرمایا۔(ایضاً)

جریب، درہم اور صاع کی تحقیق

ایک جریب ساٹھ پائی ساٹھ ذراع کی ہوتی ہے اور ایک ذراع سات قبضہ کا اور ایک قبضہ چار انگل کا ہوتا ہے، اس طرح ایک جریب ۱۲۲۵ مربع گز کی ہوگی، ایک درہم تین ماشہ رتی چاندی کے برابر ہے، ۸ رتی کا ایک ماشہ اور ۱۲ ماشہ کا ایک تولہ ہوتا ہے، اس طرح دس درہم کا وزن ۳ تولہ ۷، ۱/۲ ماشہ چاندی کے برابر ہوا، ایک صاع کیلوگرام کے اعتبار سے ۳ کیلو ۳۸۲ گرام کا ہوتا ہے۔

خراجی زمین

کتاب و سنت،آثار صحابہ اور محدثین،مجتہدین وفقہاء کے اقوال کی روشنی میں مندرجہ ذیل زمینیں خراجی ہیں :

(۱)مسلمانوں نے کفار کے کسی ملک یا شہر کو بزور شمشیر فتح کرلیااوراس کی زمین غانمین و فاتحین کے درمیان تقسیم نہیں کی گئی، بلکہ تمام مسلمان اور مصلحت عامہ کیلئے وقف کرتے ہوئے مالکان کاقبضہ بدستور باقی رکھا گیااوران کی زمین سے اسلامی محصول مقرر کیا گیا، توان کی زمین شرعاً خراجی ہوگی اوراس زمین پر خراج عائد ہوگا،علامہ کاسانیؒ خراجی زمینوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

اماالخراج فمنهاالاراضی التی فتحت عنوة فمنّ الامام علیهم وترکهافی یدار بابهافانه یضع علی جماعتهم الجزیة اذالم یسلموا وعلی اراضیهم الخراج اسلموا اولم یسلمو.بدائع الصنائع(۱۲۲/۴)

(۲)کسی شہر یا کسی ملک پر مسلمان حملہ آور ہوئے،وہاں کے کفار نے بغیر کسی لڑائی کے مسلمانوں سے صلح کرتے ہوئے ان کی اطاعت قبول کرلی تو وہ بدستور اپنی زمین کے مالک ہوں گے اوران کی زمین شرعاً خراجی ہوگی۔

وکل أرض من اراضی الاعاجم صالح علیها اهلها وصاروا ذمة فهی أرض خراج. کتاب الخراج لابی یوسف(۶۹)

(۳)اسی طرح مسلمان کسی شہر یا ملک پر حملہ آور ہوئے اور وہاں کے غیر مسلم باشندے مسلمانوں کے خوف سے جلاوطن ہوگئے تو ان کی اراضی بھی ازروئے شرع خراجی ہوگی۔

(۴) بنجر اور نا قابل کاشت زمین کو کسی غیر مسلم نے قابل کاشت بنادیا تو وہ زمین بھی خراجی ہوگی اور اس پر خراج عائد ہوگا۔

(۵) کسی غیر مسلم نے مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو کر قتال کیا اور حاکم وقت نے غنیمت کی زمین میں سے کچھ زمین اس غیر مسلم کو بھی دے دی تو یہ زمین بھی شرعاً خراجی ہوگی اور اس پر خراج عائد ہوگی۔

(۶) کسی مسلمان نے اپنا مکان توڑ کر اس کو باغ یا کھیت بنا دیا اور اس کو خراجی پانی سے سیراب کیا تو ایسی زمین بھی خراجی ہوگی اور اس پر خراج عائد ہوگا۔

(۷) اسی طرح کسی غیر مسلم نے اپنا مکان توڑ کر اس کو باغ یا کھیت بنا دیا تو ایسی زمین بھی شرعاً خراجی ہوگی، خواہ خراجی پانی سے اس کو سیراب کرے یا عشری پانی سے۔

(۸) اگر کسی غیر مسلم کے پاس خراجی زمین ہو اور اس کو جلاوطن کر کے اس کی جگہ پر کسی دوسرے غیر مسلم کو آباد کیا جائے یا کسی علاقہ یا کسی شہر کے تمام غیر مسلموں کو جن کے پاس خراجی زمین ہو، جلا وطن کر کے ان کی جگہ پر دوسرے غیر مسلموں کو آباد کیا جائے اور ان کے قبضہ میں پہلے غیر مسلموں کی زمینیں چلی جائیں تو وہ بدستور خراجی رہیں گی، اس لئے کہ یہ لوگ پہلے والے لوگوں کے قائم مقام ہوجائیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر خراجی زمینیں دو طرح کی ہوسکتی ہیں۔

الف۔۔ مسلمانوں نے کفار کی زمین کو بزور شمشیر فتح کر کے زمین ان کے قبضہ میں چھوڑی، فاتحین کے درمیان تقسیم نہ کی ہو۔

ب۔۔کفار کی زمین صلح کے ساتھ فتح ہوئی اور کفا نے خراج دینے پر مصالحت کرلی ہو،ان دو بنیادی صورتوں کے علاوہ بھی خراجی زمین کی چند صورتیں ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔

عشری زمین خراجی کب بنتی ہے؟

عشری زمین خراجی کب بنتی ہے؟اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جب عشری زمین بیع وشراء یا دیگر جائز ذرائع کے ذریعہ کسی غیر مسلم کی ملکیت میں چلی جائے تو وہ عشری زمین خراجی بن جاتی ہے،اس لئے کہ عشر میں عبادت کا پہلو بھی ہے اور غیر مسلم عبادت کا اہل نہیں ہے، پھر مذکورہ عشری زمین کو جو غیر مسلم کی ملکیت میں جانے کی وجہ سے خراجی بن گئی دوبارہ کوئی مسلمان خریدے تو وہ عشری نہیں ہوگی،اس لئے کہ جب کوئی زمین ایک مرتبہ خراجی بن جائے تو مالک کے بدلنے سے وہ عشری نہیں ہوتی الا یہ کہ خراجی زمین کے مالک کا انتقال ہوجائے اور اس کا کوئی وارث موجود نہ ہو تو وہ زمین بیت المال کی ہوگی،بیت المال سے اگر مسلمان خرید لے تو وہ عشری ہوجائے گی۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

حتی ان الذمی لواشتری ارض عشر من مسلم فعلیه الخراج عنده....لان العشر فیه معنی العبادة والکافرلیس من اهل وجوب العبادة فلا یجب علیه العشر کمالاتجب علیه الزکوة المعهودة ولهٰذا لاتجب علیه ابتداء کذا فی حالة البقاء.

وفیه ایضاً:والارض اذاصارت خراجیة لا تنقلب عشریة بتبدل

المالک.

البتہ اگر کسی مسلمان نے کسی غیر مسلم سے عشری زمین فروخت کی اور دوسرے مسلمان نے حق شفعہ کے ذریعہ اس زمین کو لے لیا تو وہ زمین بدستور عشری ہی رہے گی اور یہ سمجھا جائے گا کہ اصل معاملہ مسلمان ہی سے ہوا ہے نہ کہ غیر مسلم سے، اسی طرح عشری زمین کی خرید وفروخت کا معاملہ کسی غیر مسلم سے ہوا لیکن کسی وجہ سے بیع فاسد ہوگئی اور وہ زمین اسی مسلمان کو واپس مل گئی تو دوبارہ عشر لوٹ آئے گا اور وہ زمین حسب سابق عشری ہی رہے گی، کیونکہ جب بیع فاسد ہوئی تو گویا کہ بیع کا معاملہ اس غیر مسلم سے ہوا ہی نہیں۔

(وعشران اخذها منه مسلم بشفعة اورد على البائع للفساد)اى يجب عشر واحد ان اخذها من الذمى مسلم بالشفعة اورد على البائع المسلم لفساد البيع اما الاول فلتحول الصفقة الى الشفيع كانه اشتراها من المسلم ......واما الثاني: فلانه بالرد والفسخ جعل البيع كان لم يكن لان حق المسلم وهوالبائع لم ينقطع بهذا البيع لكونه مستحق الرد.تبيين الحقائق(۱/۲۹۵)

خراجی زمین کے سلسلہ میں دورِ رسالت اور دورِ صحابہ کے کچھ فیصلے

اس بحث کے اخیر میں خراجی زمین کے سلسلے میں دورِرسالت اور دورِصحابہ کے چند فیصلے ذکر کیئے جارہے ہیں تاکہ ان فیصلوں کی روشنی میں خراجی زمین کا سمجھنا

آسان ہو جائے۔

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نصاری بنی نجران سے ایک خاص قسم کے خراج یعنی دو ہزار جوڑے اور ایک روایت کے مطابق دو ہزار دو سو جوڑے دینے پر صلح کی جس کو وہ لوگ دو وقتوں میں ادا کرتے تھے، نصف ماہ رجب میں اور نصف ماہ محرالحرام میں۔

لماروی ان رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم صالح نصاری بنی نجران من جزیة رؤوسهم وخراج ارضیهم علی الفی حلة وفی روایة علی الفی ومائتی حلة توخذ منهم فی وقتین لکل سنة نصفها فی رجب ونصفها فی المحرم. بدائع الصنائع

(۲) نصاری بنی تغلب کی زمین اصولاً خراجی تھی لیکن جب انھوں نے خراج کو ذلت سمجھ کر خراج کے نام پر کوئی رقم دینے سے انکار کیا اور عشر کے نام پر رقم دینے کیلئے تیار ہوئے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے دوگونا عشر لینے پر مصالحت کرلی، اگرچہ ان سے عشر کے نام پر رقم وصول کی جاتی تھی لیکن حقیقت میں وہ خراج ہی تھا، یہی وجہ ہے کہ انکی زمین کسی مسلمان کی ملکیت میں جانے کے بعد بھی خراجی ہی رہی اور مسلمان سے بھی خراج ہی وصول کیا گیا۔

تبیین الحقائق (۲۹۴/۱)

(۳) جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں عراق فتح ہوا تو کچھ صحابہؓ نے عراق کی زمین مجاہدین کے درمیان تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا جن میں بلال بن ابی رباحؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ پیش پیش تھے، دیگر صحابہ مثلاً حضرت

عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت طلحہ وغیرہ کی رائے یہ تھی کہ عراق کی زمین مجاہدین کے درمیان تقسیم نہ کی جائے بلکہ وہاں کی زمین مصالح عامہ اور مسلمانوں کے لئے وقف تسلیم کردی جائے، اس لئے کہ مجاہدین کے درمیان تقسیم کرنے کی صورت میں یہ ممکن ہے کہ کسی وقت پوری جائداد کسی ایک شخص کے قبضہ میں چلی جائے اور اس کی اولاد میں وہ لوگ بھی ہوں جو اس جائداد کو اسلام دشمنی اور مسلمانوں کی مخالفت میں استعمال کریں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آیاتِ فئی سے استدلال کرتے ہوئے عراق کی زمین مجاہدین کے درمیان تقسیم کرنے سے انکار کردیا اور تمام مسلمانوں اور دیگر مصالح عامہ کے لئے وقف قرار دیا اور زمین داران کے قبضہ میں رکھتے ہوئے ان سے خراج وصول کیا، اسی طرح شام اور مصر کی سرزمین میں بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہی فیصلہ کیا۔ (کتاب الخراج لابی یوسف)

علامہ ابن قدامہؒ اپنی مشہور کتاب مغنی میں فرماتے ہیں:

دورِ رسالت یا عہدِ فاروقی یا بعد کے دور میں جن ملکوں اور شہروں کو بزورِ شمشیر فتح کیا گیا، ان میں سے کسی بھی ملک یا شہر کی زمین مسلمانوں کے درمیان تقسیم نہیں کی گئی، بلکہ مصالح عامہ کے لئے وقف رہی اور زمین داران کے قبضہ میں رکھتے ہوئے ان سے خراج وصول کیا گیا، البتہ صرف خیبر کی آدھی زمین مجاہدین کے درمیان تقسیم کی گئی اور آدھی زمین مصالح عامہ کے لئے وقف رہی۔

المغنی لابن قدامہ (۷۱۶/۲)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے ان فیصلوں سے یہ بات

واضح ہوتی ہے کہ جوملک یاشہر بزورِ شمشیر فتح ہوتواس کی زمین مجاہدین وفاتحین کے درمیان حسب ضابطہ تقسیم کرنے یا تمام مسلمانوں اور دیگر مصالح عامہ کے لئے وقف قرار دینے کے سلسلے میں امام وقت کوشرعاً اختیار ہوگا،اگر مصلحت کا تقاضا یہ ہو کہ فاتحین کے درمیان زمین تقسیم کردی جائے تو امام وقت فاتحین کے درمیان زمین تقسیم کردے اور اگر مصلحت کا تقاضا یہ ہوکہ مصالح عامہ کے لئے وقف قرار دی جائے تو مصالح عامہ کے لئے وقف قرار دے۔

ابن قدامہؒ نے اس مسئلہ میں علماء وفقہاء کے تین اقوال نقل کئے ہیں۔

(۱)امام کوشرعاً اختیار ہوگا کہ جیسی مصلحت سمجھے اس کے مطابق عمل کرے۔

(۲)محض مسلمانوں کے قبضہ ہی سے زمین وقف قرار پائے گی،امام کومزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۳)مسلمانوں کے درمیان زمین کی تقسیم حسب ضابطہ ضروری ہے۔

علامہ ابن قدامہؒ مذکورہ تینوں اقوال اور ان کے دلائل ذکرکرنے کے بعد اورقول اول کوراجح قرار دیتے ہوئے اخیر میں فرماتے ہیں:

امام کو جو اختیار حاصل ہوگا وہ مصلحت کے پیش نظر ہوگا نہ کہ خواہشات کے پیشِ نظر،لہٰذا جس میں مصلحت سمجھے اس کے مطابق عمل کرنالازم ہوگااور اس سے اعراض جائزنہیں ہوگا۔

واذاثبت هذا فان الاختيار المفو ض الى الامام اختيار مصلحة لا اختيار تشه فيلزمه فعل مايرى المصلحة فيه ولا يجوز له العدول عنه.

المغنى لابن قدامه(۲/۹ ۱ ۷)

خراجی اور عشری پانی

جب کسی بنجر زمین کو آباد کرنا ہو تو اس کے عشری اور خراجی ہونے کا مدار امام محمدؒ کے ہاں پانی پر ہے یعنی اگر اسے خراجی پانی سے سیراب کیا گیا تو زمین خراجی ہوگی اور اگر عشری پانی سے سیراب کیا گیا تو زمین عشری ہوگیا، اسلئے خراجی اور عشری پانی کی تفصیل بھی ضروری ہے۔

وہ نہریں جو غیر مسلموں نے اپنی محنت صرف کر کے نکالی ہیں اور اسلامی فتح سے قبل وہ غیر مسلموں کی ملک تھیں، ان کا پانی خراجی ہے جیسے نہر الملک، نہر یزدجرد اور ہندوستان میں نہر گنگ، جمن وغیرہ۔

بارش، کنوؤں اور قدرتی چشموں کا پانی، اسی طرح بڑے بڑے دریا، ندیاں اور سمندر جو دنیا کے طول وعرض میں قدرتی طور سے جاری ہیں اور انکے جاری کرنے میں کسی حکومت، جماعت اور فرد کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا اور عموماً وہ کسی کی ملک بھی نہیں ہوتے ان سب کا پانی عشری ہے جیسے مصر میں دریائے نیل، عراق میں دجلہ وفرات، خراسان میں سیحون وجیحون، بھارت میں گنگا وجمنا اور پاکستان کے مشہور دریا، سندھ، جہلم، چناب، راوی، اور ستلج۔

دوسرا ٹیکس

”عشور“(Import Duty)

لغتِ عرب میں عشور مفرد بھی استعمال ہوتا ہے اور جمع بھی، اگر اسے مفرد استعمال کیاجائے تو اس کی جمع عشورات آتی ہے اور اگر جمع استعمال کیا جائے تو اس کا مفرد عشرآتا ہے بمعنی دسواں حصہ، دس میں سے ایک(One tenth) نیز عشر کی جمع اعشار بھی آتی ہے، اور عشور کی جمع الجمع عشورات آتی ہے۔

اصطلاح شریعت اورفقہ میں عشور سے مراد وہ محصول، کسٹم ڈیوٹی اورامپورٹ ڈیوٹی ہے جو غیر مسلموں اور ذمیوں کے ان اموال سے لی جاتی ہے جو وہ تجارت کرنے کی غرض سے دارالاسلام لاتے ہیں۔

معجم لغة الفقهاء(ص ۳۱۲) المادہ عشر، میں اس کی تعریف یوں کی ہے۔

مايؤخذ من تجارة اهل الحرب واهل الذمة عند مايتجاوزون بها حدود الدولة الاسلاميةوقد كان يؤخذ فى القديم عشرما يحملونه.

یعنی عشور سے مراد وہ ٹیکس ہے جو حربی اور ذمی تاجروں سے اس وقت لیا جاتا ہے جب وہ مال تجارت لیکر اسلامی ملک کی حدود سے گزرتے ہیں، اور عشور کے لغوی معنی اور اصطلاحی معنی میں مناسبت یہ ہے کہ عشر کے معنی دسویں حصہ کے آتے ہیں، پہلے ادوار میں مال تجارت کا دسواں حصہ بطور ٹیکس لیاجاتا تھا، اس لئے اس محصول کو عشور کہا جاتا ہے۔

قال الشیخ السہار نفوریؒ فی بذل المجہود(۴/ ۱۵۷) تحت حدیث" انما العشور علی الیہود والنصاری ولیس علی المؤ منین عشور" قال القاری:قال ابن الملک:اراد بہ عشر مال التجارۃ لاعشر الصدقات فی غلات ارا ضیہم،قال الخطابی:لایؤخذ من المسلم شئی من ذلک دون عشر الصدقات.

عشور کی ابتداء

عشور،تجارتی ٹیکس(Import Duty) کی ابتداء حضرت عمررضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِخلافت میں صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے ہوئی،عہدِ نبوی اور عہدِ صدیقی میں اس کاذکرنہیں ملتا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں اس کاآغاز اس طرح ہوا کہ آپ کے دور میں فتوحات کا سلسلہ وسیع ہوااور بین المما لک تجارت کوفروغ ملا،مسلمان غیرمسلم مما لک میں جاکر تجارت کرنے لگے،اہلِ منبج اور بحرعدن کے اس پار کے غیرمسلموں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خط لکھا کہ وہ اپنا سامانِ تجارت لیکر سرزمین عرب میں داخل ہوا کریں گے اور جیسا کہ ان کے ہاں رواج تھا،وہ مسلمانوں کوکل سامان کادسواں حصہ دیاکریں گے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ کرامؓ سے اس بارے مشورہ طلب کیا توسب حضرات نے اس تجویز سے اتفاق کیااور مشورہ دیاکہ ان کے رواج کے مطابق ان سے دسواں حصہ لیاجائے،اس اتفاق کے باوجود بھی حضرت عمرؓ نے دسواں حصہ لینے کا فیصلہ نہ کیا بلکہ اپنے عمال اور گورنروں کے ذریعہ جاننا چاہا کہ جب مسلمان تاجر غیرمسلم مما لک میں تجارت کیلئے جاتے ہیں تووہ لوگ ان سے کتنا ٹیکس وصول کرتے ہیں،گورنروں

اور مسلمان تاجروں نے پوچھنے پر بتایا کہ ان سے دسواں حصہ ہی لیا جاتا ہے پھر آپ نے فیصلہ فرمایا کہ وہ جتنا ٹیکس مسلمان تاجروں سے لیتے ہیں ہم بھی اتنا ان سے لیں گے۔

کتاب الخراج لابی یوسف(ص ۱۲۵)میں اہل منبج کا عریضہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

دعنا ندخل ارضک تجارا وتعشر نا فشاور عمر اصحاب رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم فی ذلک فاشاروا علیه به فکانوا اول من عشر من اهل الحرب .

ہمیں اپنے ملک میں تجارت کیلئے آنے کی اجازت دیدیں اور ہم سے دسواں حصہ وصول کر لیا کریں تو حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ سے مشورہ کیا تو انہوں نے اس بارے یہی مشورہ دیا، چنانچہ وہ اہلِ حرب میں سے پہلی قوم تھی جس سے تجارتی ٹیکس وصول کیا گیا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب غیر مسلم ریاستوں نے مسلمان تاجروں سے دسواں حصہ تجارتی ٹیکس وصول کرنا شروع کیا تو اس کے ردعمل کے طور پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اجازت سے غیر مسلم تاجروں سے مسلمانوں نے بھی دسواں حصہ لینا شروع کر دیا۔

کتاب الخراج میں ہی روایت ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خط لکھا۔

ان تجارا من قبلنا من المسلمین یأتون ارض الحرب فیأخذون

منهم العشر.

یعنی ہمارے ملک کے مسلمان تاجر جب حربی علاقوں میں جاتے ہیں تو وہ ان سے بطور تجارتی ٹیکس کے مال کا دسواں حصہ لیتے ہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے جواب میں لکھا۔

خذ انت منهم كما يأخذ ون من تجار المسلمين وخذ من اهل الذمة نصف العشرومن المسلمين من كل اربعين درهما درهما وليس فيما دون المأ تين شئی فاذا كانت مأ تين ففيها خمسة دراهم ومازاد فبحسابه.

آپ بھی ان سے دسواں حصہ وصول کریں جیسے وہ مسلمان تاجروں سے وصول کرتے ہیں، ذمیوں سے بیسواں حصہ اور مسلمانوں سے ہر چالیس درہم میں سے ایک درہم وصول کریں اور دو سو سے کم دراہم میں کچھ نہیں ہے، اگر دو سو درہم ہوں تو ان میں پانچ درہم وصول کریں اور اگر اس پر اضافہ ہو تو اس اسی حساب سے وصول کریں۔

ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عامل عثمان بن حنیفؓ نے ذمی تاجروں پر بیسواں حصہ تجارتی ٹیکس مقرر کیا پھر حضرت عمر کو خط لکھا تو حضرت عمرؓ نے اس کی اجازت دیدی، انہوں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ حربی تاجروں سے کتنا ٹیکس لیں؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کہ جب مسلمان تاجر وہاں جاتے ہیں تو وہ کتنا ٹیکس لیتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ دسواں حصہ، آپ نے فرمایا تم بھی دسواں حصہ لو۔

فی مصنف ابن ابی شیبة(۳/۸۸) کتاب الزکوة،باب فی نصاری بنی تغلب مایؤخذ منهم،عن ابی مجلزان عمر بن الخطابؓ بعث عثمان بن حنیفؓ فجعل علی اهل الذمة فی اموالهم اللتی یختلفون بهافی کل عشرین درهماًدرهماًوکتب بذلک الی عمرؓفرضی واجازه وقال لعمر:کم تامرناان ناخذمن تجاراهل الحرب؟قال کم یاخذون منکم اذااتیتم بلادهم؟قالوا:العشر،قال:فکذلک فخذوامنهم.

سب سے پہلے

عشور یعنی تجارتی ٹیکس کی منظوری سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے دی اور حضرت عمرؓ کے مشہور عامل زیادبن حدیرؒ نے سب سے پہلے تجارتی ٹیکس وصول کیااوراہل حرب میں سے اہل منبج نے سب سے پہلے یہ ٹیکس ادا کیا ہے۔

فی مصنف ابن ابی شیبة (۳/۸۹) کتاب الزکوة،باب من کان لا یری العشور فی السنة الامرة،عن زیاد بن حدیر قال اナاول من عشر فی الاسلام.

زیادی بن حدیرؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ اسلام کی تاریخ میں وہ پہلاشخص ہوں جس نے تجارتی ٹیکس وصول کیا۔

فی کتاب الاموال (ص ۵۳۲) الجزء الرابع،عن الشعبیؒ قال:اول من وضع العشر فی الاسلام عمرؓ.

حضرت شعبیؒ کہتے ہیں کہ اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلے تجارتی ٹیکس

لگانے والے حضرت عمرؓ ہیں۔

تجارتی ٹیکس کی مقدار

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غیر مسلم تاجروں سے کل مال کا عشر یعنی دسواں حصہ لینے کا حکم فرمایا تھا کیونکہ غیر مسلم ریاستوں میں مسلمان تاجروں سے بھی اسی شرح سے تجارتی ٹیکس لیا جاتا تھا، اس بناء پر تجارتی ٹیکس کا نام عشور رکھا گیا ہے اصل مسئلہ یہ ہے کہ تجارتی ٹیکس کی کوئی مقدار اس طرح مقرر نہیں ہے کہ اس میں کمی بیشی نہ ہوسکے بلکہ امیر وقت ضروریات مملکت، غیر مسلموں کے مسلمان تاجروں کے ساتھ معاملہ، غیر مسلم تاجروں کی مالی حیثیت اور وقت کے تقاضوں کے مطابق تجارتی ٹیکس کی کوئی بھی مناسب مقدار مقرر کرسکتا ہے، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں کمی بیشی بھی کی جاسکتی ہے اور عدل و انصاف کی حدود میں رہتے ہوئے اسے مخصوص حالات کے پیش نظر مندرجہ ذیل کمی بیشی اور اصول مقرر کرنے کا حق حاصل ہے۔

(۱) ہر مال تجارت پر تجارتی ٹیکس لے سکتا ہے خواہ کم ہو یا زیادہ، اور اگر چاہے تو ٹیکس لاگو کرنے کیلئے مالِ تجارت کی شرح بھی مقرر کرسکتا ہے، مثلاً اگر مالِ تجارت ایک ہزار تک ہو تو اس پر ٹیکس لیا جائے گا اور اگر کم ہو تو نہیں لیا جائے گا، اس طرح کی تجویز حضرت عمرؓ سے ثابت ہے۔

فی مصنف ابن ابی شیبة(۸۸/۳) کتاب الزکوة، باب فی نصاری بنی تغلب مایؤخذ منھم، عن ابی رزیق مولی بنی فزارة ان عمر بن الخطابؓ کتب الیہ خذ ممن مربک من تجار اھل الذمة فیما یظھرون من اموالھم

ویدیرون من التجارات من کل عشرین دینارا دینارا فما نقص منها فبحسابهاحتی تبلغ عشرة فاذا نقصت ثلاثة دنانیر فدعها لاتاخذ منها شیئا واکتب لهم براء ۃ الی مثلها من الحول بما تاخذ منهم.

بنو فزازہ کے مولی رزیق کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کولکھا کہ جو ذمی تاجر اموال ظاہرہ لیکر تجارت کی نیت سے تمہارے پاس سے گزریں تو ان سے ہر بیس دینار سے ایک دینار لے لیا کرو اور اگر اس سے کم ہوں تو اسی حساب سے لیا کرو، حتی کہ دس تک پہنچ جائیں، اس سے جب تین دینار کم ہوجائیں تو انہیں چھوڑ دو اور کچھ نہ لو اور جو رقم آپ ان سے لے لیں تو ایک سال تک اس مقدار میں ان کیلئے براءت (دستاویز، ثبوت نامہ) لکھدیا کرو۔

وفی کتاب الاموال(ص ۵۳۲) الجز الرابع، قال ابوعبید: فاذا مر الذمی بالمال علی العاشر فان سفیان کان یقول: ولایؤخذ عنه شیئا حتی یبلغ مائة درهم فاذا بلغ مائة اخذ منه نصف العشروقال غیره من اهل العراق: لایاخذ منه شیئا حتی یبلغ مائتی درهم، قالوا: فان قال علی دین اوقال لیس هذاالمال لی وحلف علیه فانه یصدق علی ذلک ولایاخذفیهاشیئ، قالوا: انمایاخذمنه الصامت والمتاع والرقیق وما اشبه من الاموال التی تبقی فی ایدی الناس فامااذامر بالفواکه واشباهها اللتی لاتبقی فی ایدی الناس فانه لایؤخذفیها منه شئی، قالوا: ولایوخذ منه فی المال الواحد اکثر من مرة فی السنة وان مر مراراً هذا قول اهل العراق، واما مالک فانه کان اشد من هذاقولاًفی هؤلاء قال: اذامرالذمی بالمال

علی العاشرلتجارۃ اخذمنه نصف العشر،وان لم یبلغ مأتین،قال:وان ادعی ان علیه دینالم یقبل منه قوله واخذ منه نصف العشر،قال: وکذلک یؤخذ منه ان مربفاکهة اوغیرهاممایبقی فی ایدی الناس اولایلقی،بعد ان یکون للتجارۃ،قال:ویوخذ منه کلما مروان مر بما له فی السنة مرارا.

(۲)اہلِ ذمہ پر ٹیکس کی شرح کم اور مستامنین یعنی ویزہ ہولڈر اہل حرب پر ٹیکس کی شرح زیادہ مقرر کرسکتا ہے۔

کتاب الاموال میں حضرت انسؓ کی روایت ہے حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا:

خذمن المسلمین من کل اربعین درھما درھما ومن اھل الذمة من کل عشرین درھما درھماوممن لاذمة له من کل عشرہ دراھم درھما.

یعنی مسلمانوں سے ہر چالیس دراہم پر ایک درہم (ڈھائی فیصد)اہلِ ذمہ سے ہر بیس دراہم پر ایک درہم (۵ فیصد) اور جو ذمی نہیں ہیں ان سے ہر دس دراہم پر ایک درہم (۱۰ فیصد) وصول کرو۔

واضح رہے کہ یہاں مسلمانوں سے اڑھائی فیصد جو لینے کا امر ہے یہ زکوۃ کے بارے ہے، اس کی تفصیل آگے آرہی ہے،ٹیکس مراد نہیں ہے۔

(۳) بعض اہل مذہب پر ٹیکس کی شرح زیادہ اور بعض پر کم رکھی جاسکتی ہے ۔جیسے عالمی تجارت ومعیشت پر قابض مکار یہودی تاجروں پر ٹیکس کی شرح زیادہ مقرر کردی جائے تو درست ہے۔

(۴)حربی تاجروں پر ٹیکس کی شرح مقرر کرنے میں ان کے مسلمانوں کے

ساتھ معاملہ کو بھی معیار بنایا جاسکتا ہے، یعنی مسلمان تاجر غیر مسلم ریاستوں میں جائیں تو وہ ان سے کتنا ٹیکس لیتے ہیں، ان غیر مسلم تاجروں سے بھی اتنا لیا جائے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے مقرر فرمایا تھا۔

فی مصنف ابن ابی شیبة(۸۸/۳) عن ابی مجلزؒ ان عمرؓ بعث عثمان بن حنیفؓ فجعل علی اهل الذمة فی اموالهم اللتی یختلفون بها فی کل عشرین درهمادرهما وکتب بذلک الی عمرؓ فرضی واجازه،وقال لعمرؓ: کم تأمر نا ان نأخذمن تجاراهل الحرب قال: کم یأخذ ون منکم اذا اتیتم بلادهم قالوا العشر قال فکذلک فخذوا منهم .

ابومجلزؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عثمان بن حنیفؓ کو عامل بنا کر بھیجا تو انہوں نے اہلِ ذمہ کے اموال تجارت پر ہر بیس درہم پر ایک درہم ٹیکس مقرر کردیا اور یہ بات لکھ کر حضرت عمرؓ کی طرف بھیجی تو آپ نے رضا مندی ظاہر کی اوراس کی اجازت دیدی اور انہوں نے خط میں حضرت عمرؓ سے یہ بھی پوچھا کہ ہم اہلِ حرب کے تاجروں سے کتنا ٹیکس وصول کریں؟ تو حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ جب تم مسلمان تاجران کے ممالک میں جاتے ہو تو وہ تم سے کتنا لیتے ہیں؟ انہوں نے جواب میں لکھا کہ دسواں حصہ، آپ نے فرمایا کہ تم بھی اسی طرح ان سے دسواں حصہ وصول کرو۔

(۵) مسلمانوں کیلئے بعض اشیاء کی تجارت شرعاً ممنوع اور حرام ہے، اہلِ ذمہ چونکہ فروع کے مکلف نہیں ہیں، اسلئے ان کیلئے ایسی اشیاء کی تجارت منع نہیں ہے، لیکن اسلامی مملکت میں ایسی تجارت کا برا اثر پڑتا ہے، اس لئے امیر وقت اس پر

پابندی لگا سکتا ہے اور امیر وقت کیلئے یہ بھی جائز ہے کہ ایسی تجارت کی حوصلہ شکنی کیلئے اس پر ٹیکس زیادہ مقرر کر دے مثلاً پہلے آچکا کہ اہلِ ذمہ پر بیسواں حصہ ٹیکس مقرر تھا لیکن حضرت ابراہیم نخعیؒ سے یہ بھی منقول ہے کہ انہوں نے اہل ذمہ پر شراب کی تجارت میں دسواں حصہ ٹیکس مقرر کرنے کا فتوی دیا ہے۔

فی المصنف ایضاً(۸۸/۳) عن حماد عن ابراهیمؒ قال: یؤخذ من اهل الذمة من کل عشرین درهما درهم ومن اهل الحرب من کل عشرة دراهم درهم ومن اهل الذمة اذااتجر وا فی الخمر من کل عشرة دراهم درهم.

حمادؒ حضرت ابراہیم نخعیؒ سے روایت ہے کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ اہلِ ذمہ سے ہر بیس درہم پر ایک درہم لیا جائے اور اہلِ حرب سے ہر دس درہم پر ایک درہم اور شراب کی تجارت کرنے والے اہلِ ذمہ سے ہر دس درہم سے ایک درہم لیا جائے۔

(۶) اگر ایک شہر میں خاص قسم کے مالِ تجارت کی کمی ہے تو امیر وقت وہاں اس قسم کے مال پر ٹیکس کی شرح کم کر سکتا ہے تا کہ تاجروں کا رخ اس طرف زیادہ ہو اور وہ چیز وافر مقدار میں پہنچ سکے، مثلاً حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں گیہوں اور زیتون کا تیل مکہ یا مدینہ درآمد کرنے والوں پر تجارتی ٹیکس دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں نصف کر دیا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مدینہ طیبہ میں یہ اشیاء وافر مقدار میں پہنچتی رہیں۔ کتاب الاموال (۵۳۳)

وفی المصنف ایضاً(۸۸/۳) عن عبیدالله بن عبدالله ان عمر بن

الخطابؓ استعمل اباه ورجلا اخر علی صدقات اهل الذمة مما یختلفون به الی المدینة فکان یأمرهم ان یأخذوا عن القمح نصف العشر تخفیفا علیهم لیحملوا علی المدینة ومن القطنیة وهی الحبوب العشر.

حضرت عبیداللہ بن عبداللہؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ان کے والد عبداللہ اور ایک دوسرے شخص کو مدینہ مال تجارت لانے والے اہلِ ذمہ سے ٹیکس وصول کرنے پر عامل مقرر فرمایا اور انہیں حکم دیا کہ ان سے گندم کا ٹیکس بیسواں حصہ وصول کرو اور اس کا مقصد اہل ذمہ پر آسانی پیدا کرنا تھی تاکہ وہ گندم افراط سے مدینہ لائیں اور عام اناج سے دسواں حصہ لینے کا حکم فرمایا۔

فی موطاالامام مالک(ص ۱۲۳)باب عشور اهل الذمة،عن سالم بن عبدالله عن ابیه ان عمر بن الخطابؓ کان یأخذ من النبط من الحنطة والزیت نصف العشر،یرید بذلک ان یکثر الحمل الی المدینة ویأخذ من القطنیة العشر.

تجارتی ٹیکس اموال ظاہرہ پر ہے باطنہ پر نہیں

عشور یعنی تجارتی ٹیکس شرعاً صرف اموال ظاہرہ پر ہے،اموالِ باطنہ پر تجارتی ٹیکس نہیں ہے،یہی حکم حضرت عمرؓ نے دیا تھا۔

مصنف ابن ابی شیبہ(۸۸/۳) میں رزیق مولی بنی فزارہ کی روایت ہے۔

ان عمربن الخطابؓ کتب الیه خذ ممن مربک من تجاراهل الذمة فیما یظهر ون من اموالهم ویریدون من التجارات من کل عشرین دینارا دینارا الخ

یعنی حضرت عمرؓ نے ان کو خط لکھا کہ اہل ذمہ کے جو تاجر اموال ظاہرہ لیکر تجارت کرنے کی غرض سے تمہارے پاس سے گزریں تو ان سے ہر بیس دینار پر ایک دینار وصول کرو۔

تجارتی ٹیکس کتنی بار لیا جائے؟

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ حکم جاری فرمایا تھا کہ تجارتی ٹیکس سال میں صرف ایک مرتبہ لیا جائے، اس سے زیادہ نہیں، اس کی رو سے اگر ایک تاجر ہزار روپے کا سامان لیکر آیا اور اس سے ٹیکس لے لیا گیا تو اگر وہ اس سال دوبارہ مثلاً دو ہزار کا سامان لاتا ہے تو اس سے اس مرتبہ صرف ان ایک ہزار کا ٹیکس لیا جائے گا، جو زائد ہیں، پہلے والے ہزار پر ٹیکس نہ ہوگا۔

فی المصنف(۸۹/۳)باب من کان لا یری العشورالا مرة،عن زیاد بن حدیرؓ قال استعملنی عمرؓ علی المارة فکنت اعشر من اقبل واد بر فخرج الیه رجل فاعلمه فکتب الی ان لاتعشر الا مرة واحدة یعنی فی السنة.

زیاد بن حدیرؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے گزرنے والے تاجروں پر عامل بنایا تو میں ہر آنے والے اور جانے والے سے تجارتی ٹیکس لیتا تھا تو ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا اور ان کو اطلاع دی تو انہوں نے مجھے خط لکھا کہ سال میں صرف ایک بار تجارتی ٹیکس لیا کرو۔

وفیه ایضاً(۸۹/۳) عن ابراهیم قال:جاء نصرانی الی عمرؓ فقال ان عاملک عشر فی السنة مرتین فقال من انت فقال انا الشیخ النصرانی

فقال له عمروانا الشیخ الحنیف فکتب الی عامله ان لاتعشر فی السنة الامرة.

حضرت ابراہیمؒ کہتے ہیں کہ ایک نصرانی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ آپ کا عامل سال میں دوبار ٹیکس وصول کرتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ آپ کون ہیں؟ اس نے کہا میں نصرانی شیخ ہوں تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ میں حنیف (ملتِ حنفیہ پر قائم) شیخ ہوں پھر آپ نے اپنے عامل کو خط لکھا کہ سال میں صرف ایک مرتبہ ٹیکس لیا کرو۔

دستاویز لکھ کر ثبوت دینا

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عمال کو یہ حکم دیا تھا کہ جب تم تاجر سے ایک مال کا ٹیکس وصول کرلو تو اسے ایک تحریری دستاویز بھی دیدو تا کہ وہ اس کے پاس ثبوت رہے اور آئندہ دوبارہ آئے تو دستاویز دکھادیا کرے تا کہ اس پر دوگنا ٹیکس لاگو نہ ہوسکے، حضرت رزیق کی مذکورہ روایت کے آخر میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خط کے یہ الفاظ منقول ہیں۔

واکتب لهم براءة الی مثلها من الحول بما تأخذ منهم .

یعنی جو ٹیکس تم وصول کرلو آئندہ سال تک کیلئے اتنی مقدار کی دستاویز لکھ کر انہیں دو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک عادلانہ واقعہ

علامہ سرخسیؒ نے المبسوط (۲۰۱/۱۲) میں اور علامہ زیلعیؒ نے تبیین الحقائق

(۶۸۵/۴) میں ٹیکس کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، جس سے اسلام کے عدل وانصاف پر مبنی قواعد ٹیکس اور ان پر عمل درآمد کا پتہ چل سکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک عاشر (تجارتی ٹیکس وصول کنندہ) نے رومی تاجر سے اس کے گھوڑے کا ٹیکس وصول کیا لیکن اتفاق سے اس کا گھوڑا فروخت نہ ہوا، جب وہ اپنے گھوڑے سمیت واپس ہوا تو عاشر نے اس سے پھر ٹیکس کا مطالبہ کیا اس نے کہا کہ میں نے جاتے ہوئے ایک بار ٹیکس دیدیا ہے، اس لئے مجھ پر کوئی ٹیکس باقی نہیں ہے، جب عاشر نے اصرار کیا تو اس نے اپنا گھوڑا اس عاشر کے پاس چھوڑ دیا اور سیدھا مدینہ منورہ پہنچ گیا، اس نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مسجد نبوی میں اس حالت میں پایا کہ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی کتاب یا خط کو دیکھ رہے تھے، نصرانی نے مسجد نبوی کے دروازے سے آواز دی کہ میں نصرانی شیخ ہوں، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ میں دین حنیف کو ماننے والا شیخ ہوں، کیا بات ہے؟ نصرانی نے عاشر کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ سنایا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ غور سے سنتے رہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کی گفتگو سن کر پھر اپنے کام میں مشغول ہوگئے، نصرانی نے دل میں کہا کہ امیر المؤمنین نے اس کی بات کو قابل توجہ نہیں سمجھا لہٰذا وہ خاموشی سے عاشر کے پاس آیا اور اسے دوبارہ ٹیکس دینے لگا لیکن عاشر کے پاس نصرانی کی واپسی سے پہلے ہی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ خط پہنچ چکا تھا کہ اگر اس سے ایک مرتبہ ٹیکس لے چکے ہو تو دوسری بار مت لینا، نصرانی نے کہا جس دین میں عدل وانصاف کی ایسی صفت موجود ہو وہی دین حق

اور سچا ہے اور وہیں مسلمان ہوگیا۔

مالک کو مال اور رقم دینے کا اختیار

اگر کوئی تاجر سامانِ تجارت لیکر اسلامی ملک آتا ہے تو ٹیکس دینے میں اسے اختیار ہے، اگر چاہے تو ٹیکس مالِ تجارت کی صورت میں دے دے اور اگر چاہے تو رقم کی صورت میں دیدے، یہ اختیار مالک کو حاصل ہے عاشر کو حاصل نہیں ہے۔

فی مصنف ابن ابی شیبة (۸۸/۲) باب فی نصاری بن تغلب مایؤخذ منهم،عن عبدالله بن محمد بن زیاد بن حدیرؒ قال کنت مع جدی فمرعلی نصرانی بفرس قیمته عشرون الفا فقال له ان شئت اعطیت الفین وان شئت اخذت الفرس واعطیناک قیمته ثمانیة عشر الفا.

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عاشر زیاد بن حدیرؒ کے پوتے عبداللہ بن محمد کہتے ہیں کہ میں اپنے دادے کے ساتھ تھا کہ ایک نصرانی ایک گھوڑا لیکر گزر رہا تھا جس کی قیمت بیس ہزار تھی، زیاد نے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو دس ہزار دیدیں اور اگر چاہیں تو گھوڑا میں لے لیتا ہوں اور ہم تجھے اس کی اٹھارہ ہزار قیمت دیدیں۔

تاہم اگر کسی جگہ عاشر کیلئے سامانِ تجارت کی صورت میں ٹیکس وصولی کرنا مشکل ہو جیسا کہ آجکل ہے تو ایسی صورت میں حکومت وقت مالک کے اختیار کو ختم کرسکتی ہے اور اسے نقد کی صورت میں ادائیگی کی پابند بنا سکتی ہے، یہ ایک انتظامی معاملہ ہے۔

تاجر سے حلف لینا اور تفتیش وتحقیق کرنا

تاجر اگر مالِ تجارت لیکرآتا ہے توعاشراس سے ظاہری مال سے ٹیکس لے لے اور اس کے پیچھے نہ پڑے، نہ تفتیش وتحقیق کرے کہ تمہارے پاس اور کتنا مال ہے؟اس کاٹن میں کیا کیا سامان ہے؟ اور نہ اس بارے میں قسم لے بلکہ اس کی بات پر یقین کرلے اور جوکچھ وہ دے وصول کرلیا کرے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عاملین کو یہی حکم دیا تھا۔

فی المصنف لابن ابی شیبة(۸۶/۳)باب ماقالوا فی العاشر یستحلف اویفتش احدا،عن عبدالله بن مغفل انه کا ن علی العشور فکان یستحلفهم فمربه ابو وائل فقال لم تستحلف الناس علی اموالهم ترمی بهم فی نار جهنم فقال انی لو لم استحلفهم لم یعطوا شیًا،قال انهم ان لایعطو ک خیر من ان تستحلفهم.

حضرت عبداللہ بن مغفلؓ فرماتے ہیں کہ وہ تجارتی ٹیکس پر عامل مقرر تھے اوران کا طریقہ یہ تھا کہ وہ تاجروں سے حلف لیا کرتے تھے،وہاں سے حضرت ابووائلؓ کا گزر ہواتوفرمایا کہ آپ لوگوں سے حلف کیوں لیتے ہیں؟اس کے ذریعہ انہیں جہنم میں پھینک دوگے،توعبداللہ بن مغفلؓ نے کہا کہ اگر میں ان سے حلف نہ لوں تو یہ کچھ بھی نہ دیں گے،ابووائلؓ نے کہا ان کا آپ کو کچھ بھی نہ دینا اس بات سے بہتر ہے کہ آپ انہیں قسم دیں اور گناہ میں مبتلا کریں۔

وفیه ایضاً عن ابی اسحاق قال: کان مسروق علی السلسلة فکان من مربه فاعطاه شیئا قبل منه ویقول هل معک شئی لنا فیه حق فان قال

نعم والا قال اذهب .

حضرت مسروقؒ سلسلہ مقام پر عاشر مقرر تھے،وہاں سے گزرتے ہوئے جو تاجر آپ کو کچھ دیدیتا تو آپ اس سے قبول کرلیتے اور فرماتے کہ کیا آپ کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جس میں ہمارا ٹیکس بنتا ہو پس اگر وہ کہتا کہ ہاں تو آپ اس سے ٹیکس لیتے اور اگر کہتا کہ نہیں تو آپ فرماتے کہ ٹھیک ہے، چلیں اور مزید تفتیش نہ کرتے تھے۔

وفیه ایضا عن زیادبن حدیرؒ قال:بعثنی عمرؓعلی العشور وامرنی ان لا افتش احدا.

زیاد بن حدیرؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے تجارتی ٹیکس وصول کرنے کیلئے بھیجا اور مجھے حکم دیا کہ میں کسی سے تفتیش وجستجو نہ کروں۔

وفیه ایضاً عن طاؤسؒ قال:انما کان العاشر یرید ابن السبیل ومن اتاه بشئی قبله .

حضرت طاؤسؒ کہتے ہیں کہ عاشر کا اصل کام مسافر کی راہنمائی کرنا تھا،البتہ اگر کوئی خود اسے کچھ دیدیتا تو وہ قبول کرلیتا۔

تاہم اس زمانے میں دیانت وامانت میں بہت کمی آچکی ہے،حلال وحرام کی تمیز نہیں،جھوٹ،دھوکہ اور خیانت معمولی چیز ہے،اس لئے عاشر تاجروں سے تفتیش وتحقیق کرسکتا ہے اور ضرورت پیش آنے پر ان سے حلف بھی لے سکتا ہے جیسا کہ عبداللہ بن مغفلؓ حلف لیا کرتے تھے اور ان کا یہ جواب **انی لو لم استحلفهم لم یعطو ا شیئا.** اس زمانے کے تاجروں پر صحیح صادق آتا ہے،نیز عبداللہ بن مغفلؓ کے

علاوہ دیگر حضرات سے بھی حلف لینے کا ثبوت ہے ملتا ہے۔

فی المصنف ایضا(۸۶/۳) عن قرة عمن حدثه قال مررت علی حمیدبن عبدالرحمن بسفینة فما ترکنی حتی استحلفنی مافیها.

حضرت قرہؒ ایک شخص سے نقل کرتے ہیں کہ اس شخص نے کہا کہ میں کشتی لیکر حمید بن عبد الرحمٰنؒ کے پاس سے گزرا تو انہوں نے جب تک مجھ سے اس میں موجود اشیاء کے بارے حلف نہ لیا مجھے نہیں چھوڑا۔

مسلمان پر شرعاً تجارتی ٹیکس نہیں ہے

مسلمان پر زکوۃ اور عشر واجب ہے،شریعت مقدسہ نے مسلمان پر تجارتی ٹیکس نہیں لگایا، صرف غیر مسلموں پر لگایا ہے،مسلمان پر تجارتی ٹیکس نہیں ہے،اس کے وہی دلائل ہیں جو ہم پہلے بعنوان ''مسلمان پر شرعاً ٹیکس نہیں ہے'' ذکر کر چکے ہیں،وہاں ہم نے روایات کثیرہ سے ثابت کیا ہے کہ مسلمان پر مطلقاً کسی قسم کا ٹیکس نہیں ہے،ان روایات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان پر تجارتی ٹیکس بھی نہیں ہے،اس کے علاوہ وہاں بعض روایات وہ بھی نقل کی ہیں جن میں تصریح ہے کہ مسلمان پر تجارتی ٹیکس بھی نہیں ہے، یہاں چند روایات مصنف ابن ابی شیبہ (۸۷/۳)باب من قال لیس علی المسلمین عشور سے نقل کی جارہی ہیں۔

(۱) عن ابی امامةؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم لیس علی المسلمین عشور،انماالعشورعلی الیهود والنصاری.

یہ حدیث مصنف میں دوسندوں کے ساتھ مروی ہے۔

(۲) عن سعید بن زیدؓ قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وآله

وسلم یقول یامعشر العرب احمد واالله الذی وضع عنکم العشور.

(۳)عن زیاد بن حدیر قال بعثنی عمرؓ علی السواد ونهانی ان اعشر مسلما او ذاذمة یؤدی الخراج (یهود او نصرانی)

(۴) عن عثمان بن ابی العاصؓ ان وفد ثقیف قدمواعلی رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم فاشترطوا علیه ان لایحشرو ولایعشرو ولا یستعمل علیهم غیرهم.

ایک شبہ اوراس کا ازالہ

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عاشر، عامل حضرات مسلمانوں سے بھی مالِ تجارت سے کچھ وصول کرتے تھے جیسا کہ پہلے کتاب الاموال کے حوالے سے روایت آچکی ہے، جس میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت انسؓ سے فرمایا:

خذ من المسلمین من کل اربعین درهما درهما.

اس سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں سے بھی تجارتی ٹیکس لینا شرعاً ثابت ہے۔

لیکن یہ شبہ درست نہیں ہے کیونکہ ایسی روایات میں مسلمانوں سے ٹیکس لینا مراد نہیں ہے بلکہ زکوٰۃ لینا مراد ہے، ایسی روایات کا تعلق اس "باب العاشر" سے ہے جو کتب فقہ میں قائم کیا جاتا ہے اور جس میں مسلمانوں کے اموال ظاہرہ سے زکوٰۃ لینے کے احکام لکھے جاتے ہیں، اس لئے عاشر اہل ذمہ اور حربیوں سے ٹیکس وصول کرتے تھے اور مسلمانوں سے صرف زکوٰۃ۔ اوردونوں کی حیثیت الگ الگ تھی، بہا

فرق امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

فی کتاب الخراج (ص ۱۲۵) وکل ما اخذ من المسلمین من العشور فسبیله سبیل الصدقة وسبیل مایؤخذ من اهل الذمة واهل الحرب سبیل الخراج.

یعنی مسلمانوں سے جوعشور کے نام سے ڈیوٹی وصول کی جاتی ہے،اس کا مصرف زکوۃ والا ہے اور اہل ذمہ اور حربیوں سے جو کچھ وصول کیا جاتا ہے،اس کا مصرف خراج والا ہے۔

مسلمان پر قانوناً تجارتی ٹیکس لگانا

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیگر صحابہ کرامؓ کے مشورہ سے غیر مسلموں پر تجارتی ٹیکس لگایا تھا،مسلمانوں پر نہیں لگایا،اسلئے شرعاً تو مسلمانوں کے ذمہ تجارتی ٹیکس لاگو نہیں ہوتا لیکن اگر کوئی ملک قانونی طور پر مسلمان تاجروں پر منصفانہ تجارتی ٹیکس لگادے تو مخصوص شرائط کے ساتھ اس کی اجازت ہے اور مسلمان اس کی ادائیگی کے شرعاً بھی پابند ہوں گے،اس کے جواز کے وہی دلائل ہیں جو ہم پہلے مطلق ٹیکس کے جواز کے سلسلے میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں اور مخصوص شرائط کی تفصیل بھی وہاں آچکی ہے۔

ایک شہر سے دوسرے شہر تجارتی مال لے جانے پر ٹیکس

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ کرامؓ کے مشورے سے ان غیر مسلم

تاجروں پر ٹیکس مقرر فرمایا تھا جو دوسرے ملک سے دارالاسلام آکر تجارت کرتے تھے، اس زمانے میں ایک شہر سے دوسرے شہر مال تجارت لیجانے پر بھی ٹیکس لیا جاتا ہے۔ اگر یہ ٹیکس منصفانہ ہوتو شرعاً اس کی بھی گنجائش ہے اور جواز کے دلائل بھی وہی ہیں جو ہم مطلق ٹیکس کے جواز کے سلسلے میں لکھ چکے ہیں۔

اس کے علاوہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت اور اس کے بعد اہل ذمہ سے بھی تجارتی ٹیکس لیا جاتا تھا۔

نیز صحیح یہ ہے کہ قانونی طور پر یہ ٹیکس مسلمانوں پر لاگو کیا جاسکتا ہے اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ مسلمان اور اہل ذمہ عموماً ملک کے اندر ہی تجارت کرتے ہیں، دوسرے ملک آنے جانے کی نوبت کم ہی آتی ہے۔

علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے المغنی (۵۱۷/۸) میں ''العشور'' کے معنی یہی لکھے ہیں کہ ایک شہر سے دوسرے شہر سامانِ تجارت لے جانے پر حکومت جو محصول لیتی ہے یہی عشور ہے۔

تیسرا ٹیکس ''ضریبۃ یا غلۃ''

ضریبہ یا غلہ بھی ایک اسلامی ٹیکس ہے جو غلاموں اور غیر مسلموں پر عائد کیا جاتا تھا، آزاد مسلمانوں سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا، اس کی صورت یہ ہے کہ مولی اپنے غلام کو کہے کہ مجھے ہر روز کما کر ایک سو روپے دینے ہوں گے اور غلام قبول کرلے، بہتر یہ ہے کہ ضریبہ غلام کے مشورے سے مقرر کیا جائے، تاہم اگر مولی اس

کے مشورے کے بغیر اس پر مقرر کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، کیونکہ شرعاوہ اس کا مالک ہے، تاہم اس کی شرط یہ ہے کہ ضریبہ منصفانہ ہو اور غلام معہود مدت میں اتنی کمائی کر سکتا ہو، اس میں غلام کا یہ فائدہ ہے کہ مقرر ضریبہ کے علاوہ کمائی اپنے استعمال میں لاسکے گا۔

فی صحیح البخاری (۳۰۴/۱) کتاب الاجارة، باب ضريبة العبد وتعاهد ضريبة الاماء، عن انسؓ قال: حجم ابو طيبة النبي صلى الله عليه وآله وسلم فأمر له بصاع اوصاعين من طعام و كلم مواليه فخفف عن غلة اوضريبة.

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ابو طیبہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سینگی لگائی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو ایک یادو صاع گندم دینے کا حکم فرمایا اور ان کے مالکوں سے ان کا ٹیکس کم کرنے کی بات کی تو ان کے ٹیکس میں کمی کر دی گئی۔

فی عمدة القاری (۶۳۴/۸) والضريبة بفتح الضاد المعجمة على وزن فعيلة بمعنى مفعولة: وهى مايقرره السيد على عبده فى كل يوم ان يعطيه ....قوله "فخفف من غلة" بالغين المعجمة وتشديد اللام وهى والخراج والضريبة والاجر بمعنى واحد.

چوتھا ٹیکس ”جزیہ“ (POLL TAX)

جزیہ کے لغوی معنی بدلے اور جزاء کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں جزیہ اس متعین رقم کو کہا جاتا ہے جو اسلامی حکومت کی رعیت میں معاہدہ کے تحت رہنے والے غیر مسلموں سے ان کے قتل کے بدلے میں لی جاتی ہے اور حکومت اسلامیہ اس رقم کے عوض ان کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت کرتی ہے اور ان کو مذہبی رسومات کی اجازت دیتی ہے اور جزیہ قتل کا بدلہ اس طرح ہے کہ کفر وشرک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی بغاوت ہے، جس کی اصل سزا قتل ہے مگر اللہ تعالی نے اپنی رحمت کاملہ سے ان کی سزا میں یہ تخفیف کردی کہ اگر وہ اسلامی حکومت کی رعیت بن کر عام اسلامی قانون کے تحت رہنا منظور کریں تو ان سے جزیہ لیا جائے گا اور انہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔

جزیۃ کی جمع جزی ہوتی ہے جیسے لحیۃ کی لحی نیز جزیات بھی آتی ہے، جزیہ کو جالیہ بھی کہتے ہیں، جس کی جمع جوالی آتی ہے۔

فی معجم لغۃ الفقہاء (ص ۱۶۴) الجزیۃ: من الجزاء، مافرضہ الدولۃ علی رؤوس اھل الذمۃ ج: جزی.

جزیہ کا ثبوت قرآن کریم اور احادیث کثیرہ صحیحہ سے ملتا ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الآخر ولایحرمون ماحرم اللہ ورسولہ ولایدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیۃ عن یدوھم صاغرون ٥سورۃ التوبۃ۹: ۳۰

فی جامع الترمذی (۱/ ۲۲۴) ابواب السیر، باب فی اخذ الجزیۃ

من المجوسی،عن بجالة بن عبدة قال:کنت کاتبا لجزء بن معاویة علی مناذر فجاء نا کتاب عمر انظرمجوس من قبلک فخذ منهم الجزیة فان عبدالرحمن بن عوفؓ اخبرنی ان رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم اخذ الجزیة من مجوس هجرهذا حدیث حسن.

وفیه ایضاًعن بجالة ان عمرؓ کان لایاخذ الجزیة من المجوس حتی اخبره عبدالرحمن بن عوفؓ ان النبی صلی الله علیه وآله وسلم اخذ الجزیة من مجوس هجر....هذا حدیث حسن صحیح.

فی اعلاء السنن (۱۲/ ۴۷۱) عن جبیربن حبة قال المغیرة بن شعبة لجند کسریٰ یوم نهاوند:امرنا نبینا رسول ربناان نقاتلکم حتی تعبد واالله وحده او تؤدواالجزیة.اخرجه الامام البخاری فی صحیحه فی حدیث طویل.

فی احکام القرآن للجصاص(۳/ ۹۲) عن الزهری ان النبی صلی الله علیه وآله وسلم صالح اهل الاوثان علی الجزیة الا من کان منهم من العرب وروی الزهری عن سعید بن المسیبؒ ان رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم اخذ الجزیة من مجوس هجر وان عمربن الخطابؓ اخذها من مجوس السوادوان عثمانؓ اخذها من بربر.

اقسامِ جزیہ:

بنیادی طور پر جزیہ کی دوقسمیں ہیں (۱) جزیہ صلحیہ (۲) جزیہ عنویہ۔

جزیہ صلحیہ

یہ وہ جزیہ ہے جو امیر وقت اہلِ ذمہ پر، بطور صلح، ان کے مشورہ اور رضامندی کے ساتھ کچھ چیز مقرر کردے، یہ قسم چونکہ صلح کے تحت انجام پاتی ہے، اہل ذمہ پر غلبہ نہیں ہوا ہوتا اس لئے شریعت نے اس کی کوئی مقدار متعین نہیں کی، فریقین جس مقدار پر راضی ہو جائیں درست ہے اور مقدار مقرر کرنے کے بعد اس میں تبدیلی کرنا جائز نہیں ہے، اس میں تغیر وتبدل خیانت اور دھوکہ ہے، البتہ جزیہ کی مقدار مکمل طور پر متعین اور معلوم ہونی چاہئے، تاکہ بعد میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہو، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یمن کے قریب رہائش پذیر نصاری کی ایک قوم اہل نجران سے ان کی رضا سے یہ معاہدہ فرمایا کہ ان کی پوری جماعت سالانہ دو ہزار حلے دے، ابوداؤد میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ آدھے حلے صفر کے مہینے میں اور آدھے رجب کے مہینے میں دینے ہوں گے۔

حلہ دو کپڑوں کے جوڑے کو کہا جاتا ہے، ایک تہبند اور ایک چادر، ہر حلہ کی قیمت کا اندازہ بھی طے کردیا گیا تھا کہ ہر حلہ ایک اوقیہ چاندی کی قیمت کا ہوگا، اوقیہ چالیس درہم یعنی ہمارے وزن کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے گیارہ تولہ چاندی ہوتی ہے۔ معارف القرآن (۳۶۱/۴)

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نصاری کے عرب قبیلے بنو تغلب سے یہ مصالحت فرمائی کہ ان میں سے ہر ایک مسلمان پر واجب زکوٰۃ کی دوگنی مقدار ادا کرے گا۔

جزیہ عنویہ

غیر مسلم امیر وقت کو رضامندی سے کچھ دینے کیلئے تیار نہ تھے، جہاد ہوا اور غیر مسلموں پر غلبہ حاصل ہوگیا، اور فیصلہ ہوا کہ وہاں کے باشندوں کی جائداد کو انہی کی ملکیت پر برقرار رکھا جائیگا، اور وہ لوگ بھی اسلامی حکومت کے تحت رعیت بن کر رہنے پر رضا مند ہوگئے تو اب امیر وقت ان پر جو جزیہ مقرر کرے گا اس میں ان کی رضامندی شامل نہ ہوگی، بلکہ اس جزیہ کی مقدار شریعت نے مقرر کر دی ہے، وہ بہر صورت ان پر لازم کردی جائے گی، اس قسم کے جزیہ کی شرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں نافذ فرمائی تھی۔

جس کی تفصیل یہ ہے کہ سرمایہ دار، متمول سے ماہوار چار درہم، متوسط الحال شخص سے اس کا نصف یعنی صرف دو درہم اور غریب سے جو تندرست ہے اور جو محنت مزدوری یا صنعت و تجارت کے ذریعہ کما سکتا ہے، اس سے اس کا بھی نصف یعنی صرف ایک درہم ماہوار لیا جائے گا، ایک درہم ساڑھے تین ماشے چاندی کے برابر ہے۔

☆ گویا کہ مالدار شخص سے سالانہ اڑتالیس درہم، متوسط شخص سے سالانہ چوبیس درہم اور کمائی پر قادر غریب شخص سے سالانہ بارہ درہم وصول کیئے جائیں گے۔ مالدار، متوسط الحال اور غریب ہونے کا معیار کیا ہے؟ اس بارے دو قول ہیں:

(۱) امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ جس کے پاس دس ہزار یا اس سے زیادہ درہم ہوں تو وہ غنی ہے، اور جس کے پاس دو سو یا اس سے زیادہ درہم ہوں تو وہ متوسط ہے اور جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو یا کچھ ہو لیکن دو سو درہم سے کم ہو تو وہ

فقیر اور غریب ہے،صاحب الدرؒ اس قول کے بارے فرماتے ہیں:وھواحسن الاقوال اور صاحب البحرؒ فرماتے ہیں: وعلیہ الاعتماد.

(۲) امام ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غنی اور فقر کا معیار عرف ہے یعنی ہر شہر اور علاقہ کے عرف کو دیکھا جائے گا،جس علاقے میں جس شخص کو غنی متوسط اور فقیر شمار کیا جائیگا اسی کے مطابق فیصلہ ہوگا اور یہ ممکن ہے کہ ایک ہی مقدار کا مالک ایک علاقے میں غنی شمار ہو اور دوسرے علاقے میں متوسط۔جیسا کہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا ہے کہ پچاس ہزار درہم کا مالک بلخ میں زیادہ مالدار شمار ہوتا ہے اور بغداد میں زیادہ مالدار شمار نہیں ہوتا۔

تاتارخانیہ ،والوالجیہ ،الدرالمنتقی ،الاختیار، قہستانی،شرنبلالیہ،احکام القرآن للجصاص،أعلاء السنن،شرح المجمع وغیرہ کتب فقہ وفتاوی میں اس قول کو صحیح اور راجح قرار دیا ہے، علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسے ترجیح دیتے ہیں اور اس کی وجہ یہ نقل فرماتے ہیں کہ فتح اور بحر میں اعتراف کیا گیا ہے کہ غنی، متوسط اور فقیر کی مذکورہ تحدید ظاہر الروایۃ میں موجود نہیں ہے اور جن مقدارات کے بارے نص وارد نہ ہو ان کے بارے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اصول یہ ہے کہ اسے مبتلی بہ کی رائے پر چھوڑ دیا جائے جیسا کہ ماء قلیل وکثیر کے بارے میں امام صاحبؒ مبتلی بہ کی رائے کا اعتبار کرتے ہیں،اس اصول کے مطابق غنی،متوسط اور فقیر ہونے کا معیار عرف ہے اور اس پر فتوی ہے۔

☆ جزیہ کی شرح اوصاف ثلاثہ یعنی غنا، توسط اور فقر کے تناسب سے بدلتی رہتی ہے جس کی تفصیل آچکی ہے۔لیکن ظاہر ہے کہ یہ اوصاف پورے سال ایک

جیسے نہیں ہوتے، ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے، کوئی سال کے شروع میں غریب ہوتا ہے اور سال کے درمیان یا آخر میں متوسط الحال یا غنی ہوجاتا ہے۔ وعلی العکس، اسلئے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ ان اوصاف کا کس وقت اعتبار کیا جائے گا؟ اس بارے اختلاف موجود ہے، بعض فرماتے ہیں کہ ان اوصاف کا اعتبار ابتداء سال میں ہوگا، لانہ وقت الوجوب، لہٰذا اگر ایک شخص سال کے شروع میں فقیر تھا تو اس سے پورے سال کے بارہ درہم لئے جائیں گے، اگرچہ وہ بعد میں غنی بن گیا ہو اور اگر سال کے شروع میں غنی تھا تو اس سے سال کے اڑتالیس درہم لئے جائیں گے، اگرچہ سال کے دوران وہ متوسط الحال یا فقیر بن گیا ہو۔ وھذا قول صاحب البحر، جبکہ بعض حضرات کا قول یہ ہے کہ اوصاف کا اعتبار سال کے آخر میں کیا جائے گا، لانہ وقت وجوب الاداء لہٰذا اگر کوئی شخص سال کے آخر میں غنی ہو تو اس سے سالانہ اڑتالیس درہم وصول کئے جائیں گے، اگرچہ ابتداء سال یا درمیان میں فقیر یا متوسط الحال رہا ہو، وعلی العکس، وھو قول صاحب النھر.

لیکن اس بارے صحیح یہ ہے کہ سال کے اکثر وقت کا اعتبار ہے، اگر اکثر سال وہ غنی رہا ہے تو اس سے سالانہ اڑتالیس درہم وصول کئے جائیں گے اور اگر اکثر سال متوسط الحال یا فقیر رہا ہے تو سالانہ چوبیس یا بارہ درہم وصول کئے جائیں گے جیسا کہ صحیح البدن اور تندرست ہونے میں سال کی اکثریت کا اعتبار ہے۔ وھو تطبیق الامام الشامیؒ.

☆ ذمیوں سے ابتداء سال میں پورا جزیہ وصول کیا جاسکتا ہے، اور یہی اصل حکم ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جزیہ قتل کا بدلہ ہے اور عقد ذمہ کرتے ہی وہ قتل سے

بچتے جاتے ہیں، گویاان کو بدل مل جاتا ہے،اس کا مقتضی یہ ہے کہ جزیہ بھی وہ ابھی ادا کرے، لیکن شریعت نے اہل ذمہ کی رعایت کی ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ وہ ہرماہ کی قسط مہینے کے آخر میں دے سکتے ہیں، بلکہ دوماہ کی اقساط دوماہ بعد دے سکتے ہیں، بلکہ پورے سال کی اقساط سال کے بعد دے سکتے ہیں۔

☆ جزیہ کا اہل بننے کیلئے ضروری ہے کہ وہ شخص حراور مکلف ہو، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔اس اہلیت کا اعتبار کس وقت ہوگا ؟ اس بارے صحیح یہ ہے کہ جس وقت امام ان پر جزیہ مقرر کرتا ہے اس وقت کا اعتبار ہے لہٰذا اگر جزیہ مقرر کرتے وقت ہی ایک شخص اہل نہ تھا مثلاً غلام تھا یا بچہ تھا تو اس پر جزیہ لاگو نہ ہوگا، اگر چہ سال کے دوران وہ اہل بن جائے مثلاً غلام آزاد ہوگیا یا بچہ بالغ ہوگیا، ہاں اگر ابتداء سال میں جزیہ مقرر کرتے وقت ایک شخص اہل تھا لیکن وصف موجود نہ تھا یا موجود تھا لیکن بعد میں تبدیل ہوگیا تو اس میں گزشتہ مسئلہ کی رو سے سال کے اکثر حصہ کا اعتبار ہوگا۔ مثلاً ایک شخص آزاد عاقل بالغ تھا، جزیہ کا اہل تھا لیکن فقیر یا مریض تھا اس بنا پر اس پر جزیہ مقرر نہ کیا گیا بعد میں وہ غنی یا تندرست ہوگیا تو اگر سال کے اکثر حصہ وہ غنی یا تندرست رہا ہے تو اس پر جزیہ واجب ہے یعنی غنی پر غنی والا جزیہ واجب ہوگا اور اگر سال کے اکثر حصے میں وہ فقیر یا مریض رہا تو اس پر جزیہ واجب نہیں ہے، اسی طرح ابتداء سال میں وہ اہل تھا لیکن جزیہ کا سبب نہ تھا یعنی کسی وجہ سے کمائی پر قادر نہ تھا لیکن بعد میں قادر ہوگیا تو اگر سال کے اکثر حصہ وہ قادر تھا تو اس پر جزیہ واجب ہے اور اگر اکثر حصہ وہ قادر نہ تھا تو اس پر جزیہ واجب نہیں ہے۔

☆ اگر ابتداء میں اہل تھا اور اس پر جزیہ مقرر ہوگیا لیکن بعد میں اہلیت ختم

ہوگئی اور وہ سال کے اکثر حصے میں اہل نہ رہا تو اس سے جزیہ ساقط ہو جائے گا۔
کما سیجیئی فی اسباب السقوط.

جزیہ اہل ذمہ سے ایک معاہدہ کے تحت لیا جاتا ہے اور ذمیوں کے ساتھ جو معاملہ ہوتا ہے اسے امان مؤبد اور عقد ذمہ کہا جاتا ہے، اس کے جائز ہونے کی متعدد شرائط ہیں۔

عقد ذمہ کی تعریف

ذمہ کے لغوی معنی عہد کے ہیں اور اصطلاحی معنی ہیں: هو التزام تقرير الكفار في ديارنا وحمايتهم والدفاع عنهم ببذل الجزية والاستسلام من جهتهم.

یعنی کافروں کے ساتھ اس بات پر عہد کرنا کہ وہ تابعدار رہ کر دار الاسلام میں رہیں گے اور جزیہ ادا کریں گے اور امیر وقت ان کی حفاظت اور ان کا دفاع کرے گا۔

اس کی لغوی معنی سے مناسبت یہ ہے کہ اس میں ذمی سے عہد کیا جاتا ہے یعنی اس میں امان، ضمان اور کفالت کا عہد ہوتا ہے۔

صیغہ عقد

عقدِ ذمہ کے صیغے دو قسم کے ہیں۔

(۱) صریح جیسے لفظ عقد اور عہد وغیرہ یعنی جن میں باقاعدہ تصریح ہوتی ہے کہ ذمی یہاں رہے گا اور جزیہ ادا کریگا۔

(۲) دلالت یعنی کوئی ایسا فعل جو قبول جزیہ پر دلالت کرے مثلاً حربی ویزہ لیکر دارالاسلام آتا ہے اور ایک سال رہنے کا معاہدہ کرتا ہے، سال کے بعد اسے کہا گیا کہ چلے جاؤ ورنہ ذمی بن جاؤ گے۔ لیکن وہ یہاں رہنے کو اختیار کرتا ہے تو وہ ذمی ہو جائے گا۔

☆ شریعت کی رو سے عقد ذمہ کا شمار "مصالحت عظمیٰ" میں ہوتا ہے، اس لئے یہ عقد مسلمانوں کی طرف سے صرف امام یا اس کا نائب کر سکتا ہے، عام کوئی شخص یہ عقد نہیں کر سکتا۔

حکمت و مصلحت

اس عقد میں کئی حکمتیں ہیں مثلاً:

(۱) اس عقد سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان امن وسلامتی والی زندگی کا تحقق ہوتا ہے۔

(۲) غیر مسلم مسلمانوں کے معاشرے میں رہیں گے وہ اسلامی تعلیمات، اصول، احکام اور حکومت اسلامی کی بہاریں دیکھیں گے تو شاید مسلمان ہو جائیں۔

شرائط عقد ذمہ

(۱) معاہدہ کرنے والا مشرکین عرب میں سے نہ ہو، اگر مشرکین عرب میں سے ہو تو اس کے ساتھ عقد ذمہ کرنا جائز نہیں ہے، وہ اسلام ہی قبول کرے گا، اگر اسلام قبول نہ کرے تو اسے قتل کیا جائے گا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم .... فخلوا سبیلھم.

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو قتل کرنے کا حکم فرمایا ہے اور پرزور الفاظ میں تاکید کی ہے کہ جہاں پاؤ ان کو قتل کردو اور آخر میں فرمایا کہ ایک صورت میں ان کو چھوڑا جاسکتا ہے۔وہ صورت یہ ہے کہ کفر سے تائب ہو کر مسلمان ہوجائیں معلوم ہوا کہ مشرکین عرب یا تو اسلام قبول کریں گے یا ان کو قتل کیا جائیگا۔

فانه لا يقبل منهم الاالاسلام اوالسيف وقال صاحب الدر:لان المعجزة فی حقه اظهرفلم یعذر.

مشرکین عرب کے ساتھ عقد ذمہ کرنا صحیح نہیں ہے،ان کے علاوہ تمام غیر مسلموں سے عقد ذمہ درست ہے،اہلِ کتاب خواہ عرب ہوں یا عجم،مجوس،وثنی،بت پرست،صائبین،ہندو،سکھ،قادیانی سب کا یہی حکم ہے۔

(۲)معاہدہ کرنے والا مرتد نہ ہو،مشرکین عرب کی طرح مرتد یا اسلام کی طرف لوٹے گا یا اسے قتل کیا جائے گا،اس کے ساتھ عقدالذمہ کرنا جائز نہیں ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

تقاتلو نهم اويسلمون (الفتح ۴۸:۱۶)

یعنی ان سے قتال کرو یا وہ مسلمان ہوجائیں۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ آیت قبیلہ بنو حنیفہ کے مرتدین کے بارے نازل ہوئی ہے۔

(۳)معاہدہ مؤبد ہونا ضروری ہے یعنی ہمیشہ کیلئے ہو،اگر تھوڑے سے وقت کیلئے معاہدہ ہو تو عقد ذمہ درست نہ ہوگا۔

صاحب بدائعؒ نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ معصوم الدم ہونے میں عقد ذمہ

عقد اسلام کی طرح ہے اور عقد اسلام موَبد ہوتا ہے عارضی نہیں ہوتا، اسلئے عقد الذمہ بھی موبد ہوگا عارضی نہ ہوگا۔

(۴) عہد کرنے والا عاقل ہو۔

(۵) عہد کرنے والا بالغ ہو۔

(۶) عہد کرنے والا مذکر ہو لہٰذا مجنون، بچے اور عورت سے بالتبع عقد ذمہ تو درست ہے لیکن ان سے جزیہ وصول نہیں کیا جائے گا اور صاحبؒ بدائع نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم میں اہل قتال پر جزیہ واجب کیا ہے۔

قاتلوا الذین لایؤمنون باللہ و لا بالیوم الآخر.

قتال باب مفاعلہ کا مصدر ہے جو شرکت کا تقاضا کرتا ہے یعنی دونوں طرف سے لڑائی ہو، جس سے معلوم ہوا کہ جو کافر اہل قتال نہیں یعنی لڑ نہیں سکتے ان پر جزیہ نہیں ہے لہٰذا مجنون، بچے اور عورت پر کسی قسم کا جزیہ نہیں ہے۔

(۷) معاہد صحت مند اور تندرست ہو، سال کے اکثر حصے میں صحت مند ہونا ضروری ہے لہٰذا اگر ذمی پورے سال بیمار رہا یا سال کے اکثر حصے میں بیمار رہا تو اس پر جزیہ نہیں ہے کیونکہ یہ بھی اہلِ قتال سے نہیں ہے۔

(۸) سلیم البدن والاعضاء ہو یعنی اس کا بدن اور اعضاء بھی سلامت ہوں، اور کمائی کرنے پر قادر ہو لہٰذا پاؤں سے معذور، نابینے اور شیخ کبیر پر جزیہ واجب نہیں ہے، یہی ظاہر الروایہ ہے، اسی پر فتوی ہے کیونکہ یہ لوگ اہل قتال نہیں ہیں اگرچہ ان کے پاس بڑا سرمایہ ہو اور جائیداد کے مالک ہوں، اہل الذمہ کے پیشوا،

مذہبی راہنما، عابد اور زاہد بھی اگر کمائی پر قدرت نہ رکھتے ہوں اور نہ جہاد میں مسلمانوں کے خلاف شریک ہوتے ہیں تو ان پر بھی جزیہ واجب نہیں ہے، ہاں اگر کمائی کی قدرت رکھتے ہوں اور جہاد میں مسلمانوں کے خلاف لڑتے ہوں تو ان پر جزیہ لاگو ہوگا، اسی طرح اگر کوئی ذمی کمانے کی طاقت رکھتا ہے لیکن سستی سے کماتا نہیں ہے تو اس پر جزیہ مقرر کیا جائے گا، جیسے کسی کے پاس خراجی زمین ہے اور وہ قابل کاشت بھی ہے لیکن مالک اسے کاشت نہیں کرتا تو بھی اس سے خراج لیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جزیہ مقرر کرنے کیلئے ذمی کا بالفعل کمانا ضروری نہیں ہے، کمانے کی قدرت موجود ہونا ضروری ہے۔

(۹) ذمی آزاد ہو، غلام نہ ہو لہٰذا غلام سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ کیونکہ اس کی ملکیت میں مال نہیں ہوتا، مکاتب، مدبر، باندی، اور ام ولد کا بھی یہی حکم ہے۔

ان نو شرائط میں سے پہلی تین شرائط رکن عقد ذمہ کی ہیں یعنی اگر یہ شرائط موجود نہ ہوں تو عقد ذمہ درست ہی نہ ہوگا اور آخری چھ شرائطِ وجوب ہیں یعنی اگر یہ شرائط موجود نہ ہوں تو ایسے اہل ذمہ سے شرعاً جزیہ نہیں لیا جائیگا، امیر وقت پر لازم ہے کہ ایسے افراد کو اہلِ ذمہ کو ملنے والے تمام حقوق دے اور ان سے کسی قسم کا معاوضہ اور جزیہ وصول نہ کرے۔

ماخذہ: بدائع الصنائع (۱۱۰/۷، ۱۱۱)

اسبابِ سقوط

اہلِ ذمہ پر جزیہ مقرر کرنے کے بعد بعض اسباب ایسے بھی آجاتے ہیں کہ

جن کی وجہ سے طے شدہ جزیہ شرعاً ساقط اور معاف ہوجاتا ہے،ایسے اسباب کل چار ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱)اسلام یعنی ذمی مسلمان ہوجائے تو مسلمان ہوتے ہی اس سے جزیہ ساقط ہوجائے گا حتی کہ جزیہ مقرر ہونے کے بعد سال گزر گیااور اس نے ادانہیں کیا تھااب مسلمان ہوگیا تو بھی جزیہ ساقط ہوجائے گا۔ ہاں اگر اس نے ادا کردیا تھا پھر مسلمان ہو اتواس کا جزیہ واپس نہیں کیاجائے گا۔کیونکہ اس نے وجوب کے بعد ادائیگی کی ہے اور اگر دوسالوں کی ادائیگی کردی تھی اور ایک سال کے بعد مسلمان ہوا ہے تودوسرے سال کا جزیہ اسے واپس کرنا ضروری ہے۔کیونکہ اس نے دوسرے سال کی ادائیگی وجوب سے پہلے کی ہے ۔ردالمحتار(۲۰۰/۴)

☆اسلام لانے کے بعد جزیہ ساقط ہوجاتا ہے،اس کی وجوہات درج ذیل ہیں۔

(۱)فی مجمع البحرین فی زوائد المعجمین (۱۸/۲)باب الجزیۃ،دارالکتب العلمیۃ بیروت،عن ابن عمرؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال:من اسلم فلا جزیۃ علیہ.

یعنی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو مسلمان ہوجائے تو اس پر کوئی جزیہ نہیں ہے۔

وکذا فی نصب الرایۃ (۴۵۳/۳) وکنز العمال (۹۴/۱)رقم الحدیث ۴۳۱

وفی سنن ابی داؤد(۸۲/۲) کتاب الخراج،عن ابن عباس رضی

الله تعالیٰ عنه:لیس علی المسلمین جزیة.

وفی جامع الترمذی(۱/۲۵۵) باب ماجاء لیس علی المسلمین جزیة،عن بن عباسؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم:لا یصلح قبلتان فی ارض واحدة ولیس علی المسلمین جزیة.

(۲)حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم فرمایا تھا کہ اسلام لانے کے بعد جزیہ ساقط ہوجاتا ہے۔

فی البدائع (۷/۱۱۲) وعن سیدنا عمرالفاروق رضی الله تعالیٰ عنه انه رفع الجزیة بالا سلام فقال والله ان فی الاسلام لمعا ذاان فعل.

(۳)اہل ذمہ کے ساتھ عقد کرنے اوران سے جزیہ لینے میں یہ حکمت ہے کہ وہ مسلمانوں کے درمیان رہیں گے،اسلام کی خوبیاں اوراسلامی قانون کی بہاریں دیکھیں گے،اس طرح ہوسکتا ہے کہ وہ مسلمان ہوجائیں یعنی جزیہ کی مشرعیت کی حکمت یہ ہے کہ یہ اہل ذمہ کے مسلمان ہونے کاذریعہ اور وسیلہ ہے،جب وہ مسلمان ہوگیا تومقصود حاصل ہوچکا،اس لئے اس سے جزیہ ساقط کر لینا چاہئے۔

(۴)موت یعنی ذمی جب مرجائے تواس سے جزیہ ساقط ہوجائے گا،اگرچہ سال پورا ہونے کے بعد مرا ہواوراس کی وجہ ابھی گزرچکی کہ جزیہ مقرر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ مسلمان ہوجائیں،جب وہ فوت ہوگیا تواب یہ مقصد حاصل نہیں ہوگا۔

(۳) سال کاگزرجانا یعنی جزیہ طے ہوجانے کے بعد ایک سال گزرگیااور

دوسرا سال شروع ہو چکا ہے لیکن نہ ذمی نے خود جزیہ ادا کیا اور نہ خلیفہ نے اس سے مطالبہ کیا ہے تو ایسی صورت میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں گزشتہ سال کا جزیہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اس کو یوں بھی تعبیر کیا جاتا ہے کہ دونوں سالوں کے جزیہ میں تداخل ہو جاتا ہے یعنی صرف ایک سال کا جزیہ ادا کر دے تو کافی ہے۔ گزشتہ سال کے جزیہ کے ساقط ہونے کی وجہ بھی یہی ہے کہ جزیہ کا مقصد یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو جائے اور ظاہر ہے کہ گزشتہ سال اس مقصد کے بغیر گزر چکا ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ دوسرے سال کا شروع ہونا کافی نہیں بلکہ جب دوسرا سال ختم ہوگا تو تداخل ہوگا اور صرف ایک جزیہ واجب ہوگا، لیکن صحیح یہی ہے کہ دوسرا سال شروع ہوتے ہی تداخل ہو جائے گا۔

(۴) وجوب کی گزشتہ چھ شرائط میں سے کوئی شرط فوت ہو جائے اور سال کے اکثر حصے میں فوت رہے تو اس سے بھی جزیہ ساقط ہو جائے گا، مثلاً جزیہ طے ہوتے وقت اس میں تمام شرائط وجوب موجود تھیں لیکن چار پانچ ماہ کے بعد وہ نابینا یا معذور یا شیخ کبیر ہوگیا کہ کمائی پر قدرت نہ رہی اور سال کے آخر تک یہی حالت رہی تو اس سے جزیہ ساقط ہو جائے گا۔

عقد ذمہ کا لزوم اور نقض

عقدِ ذمہ کی شرعی حیثیت یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کے حق میں ہر صورت لازم اور واجب ہے، مسلمانوں کے لئے اس کا توڑنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے اور اہل ذمہ کے حق میں لازم نہیں ہے، انکی طرف سے یہ عقد ٹوٹ سکتا ہے اور اسکے ٹوٹنے کے تین اسباب ہیں۔

(۱) ذمی مسلمان ہوجائے تو اس کا عقد ذمہ ٹوٹ جائے گا۔ کما ذکرنا

(۲) وہ خود بخود دارالحرب چلا جائے اور عقد توڑ دے۔

(۳) اہل ذمہ مسلمانوں کے علاقے پر حملہ آور ہوجائیں اور مسلمانوں سے لڑنا شروع کردیں، اس سے وہ اہل حرب بن جائیں گے اور عقد خود بخود ٹوٹ جائے گا۔

☆ اگر کوئی ذمی جزیہ دینے سے انکاری ہوجائے تو بھی اسلامی تعلیم یہ ہے کہ اس کا عقد نہیں ٹوٹتا، اس کا خیال رکھا جائے، ہوسکتا ہے کہ اس کے پاس کچھ میسر نہ ہو اسلئے جزیہ سے انکاری ہوا ہو۔

☆ اگر ذمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کر ڈالی، آپ کو برا بھلا کہا تو اس سے بھی عقد نہیں ٹوٹتا۔ **لان هذا زيادة كفر على كفر والعقد يبقى مع اصل الكفر فيبقى مع الزيادة .**

☆ اگر ذمی نے مسلمان کو قتل کر ڈالا یا مسلمان عورت سے بدکاری کا مرتکب ہوگیا تو بھی اس کا عقد نہیں ٹوٹتا کیونکہ یہ معاصی اور کبیرہ گناہ ہیں جن کی قباحت وشناعت کفر سے کم ہے، عقد ذمہ کفر کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے تو گناہ کبیرہ کے ساتھ بھی جمع ہوسکتا ہے۔ بدائع الصنائع (۱۱۳/۷)

اہلِ ذمہ کے حقوق

عقد ذمہ کی وجہ سے اسلام نے ذمیوں کو جو حقوق دئے ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) امیر وقت کے ذمہ لازم ہے کہ جب تک عقد ذمہ باقی ہے وہ انہیں

دارالاسلام میں ٹھہرنے کی مکمل اجازت دے، جزیرہ عرب اور حرم مکی کے علاوہ ہر دارالاسلام میں اہل ذمہ ٹھہر سکتے ہیں۔ حرم مکی اور جزیرہ عرب میں ٹھہرنے کے بارے کچھ اختلاف ہے۔ اس بارے احناف کا مذہب یہ ہے کہ اہل ذمہ حرم مکی کو مستقل وطن اومستقر تو نہیں بنا سکتے، البتہ عارضی طور پر وہ وہاں آ جاسکتے ہیں۔

(۲) اہل ذمہ کی جان اور مال محفوظ ہوگا۔ امیر وقت عام مسلمان شہریوں کی طرح اہل ذمہ کی جان و مال کی حفاظت بھی کرے گا، کسی مسلمان کیلئے ذمی کا قتل کرنا اور اس کا مال لینا جائز نہیں، حرام ہے۔

سنن ابوداؤد میں حضرت ابو بکرہ (نفیع بن حارث) رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

☆من قتل رجلامن اهل الذمة لم يجد رائحة الجنة وان ريحها يوجد من مسيرة سبعين عاما.

یعنی جس نے اہل ذمہ میں سے کسی آدمی کو قتل کیا تو وہ جنت کی خوشبو نہیں پاسکے گا حالانکہ جنت کی خوشبو ستر سال کی مسافت سے سونگھی جاسکتی ہے۔

☆جامع الترمذی اورسنن ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

الا من قتل نفسا معاهدة له ذمة الله و رسوله فقد اخفر بذمة الله فلا يرح رائحة الجنة وان ريحها ليوجدمن مسيرة سبعين خريفا.

یعنی جس نے ایسے معاہدہ کرنے والے کو قتل کیا جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذمہ حاصل تھا تو اس نے اللہ تعالیٰ کے ذمہ اور عہد کو

توڑا لہذا وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا، حالانکہ جنت کی خوشبو ستر سال کی مسافت سے پائی جاسکتی ہے۔

(۳) ان کی عبادت گاہوں کو نہیں چھیڑا جائے گا، ان کی شراب اور خنزیر کو کچھ نہیں کہا جائے گا، البتہ انہیں اس بات کا پابند کیا جائے گا کہ شراب اور خنزیر کا اظہار نہ کریں، اگر وہ سرعام اس کا اظہار کریں تو ان کی شراب انڈیل دی جائے گی، اور خنزیر کے اظہار و نمائش پر تادیبی کاروائی ہوگی، ہاں اگر کسی مسلمان نے بلا اظہار کے ان کی شراب گرادی تو مسلمان اس کا ضمان ادا کرے گا۔

اہل ذمہ کی ذمہ داریاں

عقد ذمہ کرنے کے بعد اہل ذمہ پر مندرجہ ذیل ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

(۱) ان پر لازم ہے کہ طے شدہ جزیہ ہر سال بر وقت ادا کریں گے۔

(۲) اگر وہ مال تجارت لیکر دوسرے شہر جائیں گے تو عام مسلمانوں سے زکوۃ لینے کی طرح ان سے بھی تجارتی ٹیکس وصول کیا جائے گا، اسی طرح بوقت ضرورت ان سے دوسرے ٹیکسز بھی وصول کیئے جائیں گے۔

(۳) اگر ان کے ساتھ مسلمانوں کی ضیافت کا معاہدہ ہوا ہو تو اگر مسلمان ان کے علاقے میں جائیں تو تین دن تک مسلمانوں کی ضیافت کریں گے۔

(۴) پرانی عبادت گاہوں کی تعمیر کی اجازت ہوگی لیکن دارالاسلام میں نئی عبادت گاہ بنانے کی اجازت نہ ہوگی۔

(۵) عمدہ اور نفیس قسم کی سواریوں پر سوار ہونے اور مسلمانوں پر فخر کرنے

کی اجازت نہ ہوگی۔

(۶) وہ ہر ایسا کام نہیں کرسکیں گے جس سے مسلمانوں کو نقصان ہو مثلا دھوکہ، غیر مسلموں کے جاسوس کو پناہ دینا، اہل حرب کی معیت میں مسلمانوں سے لڑنا وغیرہ۔

(۷) مسلمانوں کی تعظیم وتوقیر کریں گے، انہیں برا بھلا کہنے، ایذا پہنچانے گالی گلوچ کرنے اور ان سے خدمت لینے کی اجازت نہ ہوگی۔

(۸) اپنے ناقوس اور دیگر مذہبی شعار کو مخفی رکھیں گے، اس کے اظہار اور نمائش کی اجازت نہ ہوگی۔

(۹) کسی نبی کی توہین، اللہ تعالیٰ، قرآن کریم، اور شعائر اسلام کی توہین نہیں کرسکیں گے۔

(۱۰) سود، معاملات، اور سزاؤں کے سلسلے میں ان پر وہی احکام لاگو ہوں گے جو مسلمانوں پر لاگو ہوتے ہیں مثلاً زنا، فحاشی وغیرہ ان کیلئے بھی ناجائز ہوں گے، اگر وہ اس کا ارتکاب کریں تو سزا ملے گی، صحیح بخاری ومسلم میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ ایک یہودی مرد وعورت نے زنا کا ارتکاب کیا تو آپ علیہ السلام نے ان کو رجم کردیا۔

اسی طرح ان کو سودی معاملات کرنے کی بھی اجازت نہ ہوگی، ہاں شراب وخنزیر چونکہ ان کے ہاں حلال ہیں اس لئے انہیں شراب پینے اور خنزیر کا گوشت کھانے کی اجازت ہوگی۔ اور اس بارے کوئی اختلاف پیدا ہوتو خود فیصلہ کریں گے، ہماری عدالت میں مقدمہ لانا ضروری نہیں ہے تاہم اگر وہ ہماری عدالت میں

خمر وخنزیر کا مقدمہ لاتے ہیں تو مسلمان قاضی ہماری شریعت کے مطابق فیصلہ کرے گا

الفقه الاسلامی وادلته (۵/۵۸۸۸الی ۵۸۹۰)

ان کے علاوہ بھی کچھ ذمہ داریاں اور پابندیاں ہیں لیکن یہ سب واجبات کے درجہ میں نہیں ہیں، کچھ میں سمجھوتہ کے مطابق ترمیم وتخفیف اور رخصت بھی ہوسکتی ہے۔

چند متفرق مسائل

☆ذمی پر لازم ہوگا کہ جزیہ خود لاکر حوالے کرے، اگر وہ کسی نائب کے ہاتھ جزیہ بھیجتا ہے تو قبول نہیں کیا جائے گا۔

قال الله تعالیٰ: حتی یعطوا الجزیة عن یدو هم صاغرون

☆ادائیگی کا طریقہ یہ ہوگا کہ ذمی کھڑا ہوکر ادا کرے گا اور وصول کرنے والا بیٹھا ہوگا، دینے والے کا ہاتھ نیچے اور وصول کرنے والا کا ہاتھ اوپر ہوگا، وصولی کی بعض دوسری باتیں بھی کتب فقہ میں منقول ہیں مثلاً وصول کرنے والا اسے کہے اعط یاعدو الله، یا کہے اعط یا ذمی وغیرہ لیکن یہ روایات ضعیف ہیں، صحیح یہ ہے کہ ذمی کو کوئی بھی ایسا کلمہ کہنا جائز نہیں ہے جس سے اسے تکلیف ہو، اگر وصول کرنے والے نے اسے تکلیف دی تو سخت گناہ گار ہوگا اور اسے قابلِ سزا جرم تصور کیا جائے گا۔

☆اگر جزیہ بطور مصالحت کے مقرر ہو یعنی جزیہ صلحیہ ہو تو اس صورت میں عورت، بچے، غلام اور معذور افراد پر بھی جزیہ مقرر کیا جاسکتا ہے۔

فی احکام القرآن للجصاص(۳/ ۹۷) فی بعض اخبار معاذ ان

النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امرہ ان یاخذ من کل حالم اوحالمۃ دینارا ولا خلاف ان المراۃ لا تؤخذ منہا الجزیۃ الا ان یقع الصلح علیہ.....عن عروۃ بن الزبیرؓ قال کتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الی اہل الیمن...وعلی کل حالم او انثی عبد او امۃ دینارا و قیمتہ من المعافر.

جزیہ کا مصرف

جزیہ مسلمانوں اور اسلامی مملکت پر بلا تملیک خرچ کیا جاتا ہے، جیسے فوج اور مجاہدین، طلبہ، علماء کرام، مفتیان عظام، قضاۃ، عمال، پٹواری، پولیس، سرحدوں اور سڑکوں کی حفاظت کرنے والا عملہ، مساجد ومدارس کی تعمیر، پل، سرائے، سڑک وغیرہ کے اخراجات میں جزیہ کی رقم لگائی جاسکتی ہے۔

فی الدر(۲۱۷/۴)ومصرف الجزیۃ والخراج ....مصالحنا کسد ثغورو بناء قنطرۃ وجسروکفایۃ العلماء والمتعلمین،تجنیس وبہ یدخل طلبۃالعلم فتح والقضاۃ والعمال ککتبۃ قضاۃ وشہود قسمۃ ورقباء سواحل ورزق المقاتلۃ وذراریہم.

جزیہ اور عدل وانصاف کے تقاضے

مذکورہ تفصیل سے واضح ہوگیا کہ جزیہ (Pool Taxc)ایک انتہائی منصفانہ وعادلانہ اسلامی ٹیکس ہے، پہلے تو اس کی مقدار کتنی کم ہے یعنی غنی پر ماہانہ چار درہم، متوسط الحال پر اس کا آدھا، دودرہم اور مسکین پر اس سے آدھا ایک درہم۔

آسانی کیلئے یوں سمجھنا چاہئے کہ اس زمانہ میں ایک درہم ایسا تھا جیسے اس وقت ایک روپیہ۔

☆ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ جزیہ سال کے شروع میں ادا کریں بلکہ سال کے آخر میں بھی ادا کرسکتے ہیں۔

☆اگرسال کے آخر میں بھی ادا نہ کیا اور سال گزرگیاتو جزیہ معاف ہوجاتا ہے۔

☆ پھر جزیہ ہر شخص پر واجب نہیں بلکہ ضروری ہے کہ وہ کمانے والا، مذکر، آزاد شخص ہو، عورت، بچے، معذور اور غلام پر جزیہ نہیں ہے،اسی طرح اگر وہ کمانے پر قادر نہ ہوتواس پر بھی جزیہ نہیں ہے،اگرچہ وہ بڑا مالدار اور سرمایہ دار ہو، خلیفہ وقت بغیر کسی معاوضہ کے ان حضرات کے مال جان اور آبرو کی حفاظت کرے گااوران کووہ سہولیات اور حقوق(Rights)دے گا جو دارالاسلام میں مسلمانوں اور مکلف ذمیوں کو دیئے جاتے ہیں۔

☆ اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اسلامی حکومت گویا کہ مفت میں یہ تمام سہولیات اہل ذمہ کودیتی ہے، یہ معاضہ نہ ہونے کے برابر ہے، پہلے چند احادیث نقل کی جاچکی ہیں جن میں ذمیوں کے ساتھ خیانت کرنے، قتل کرنے،ایذاء پہنچانے اورحق سے زیادہ وصول کرنے پر سخت وعید کا ذکر کیا ہے۔

☆جزیہ کا جو مصرف ہے اس سے ذمی لوگ بھی عام مسلمانوں کی طرح نفع حاصل کرتے ہیں گویا کہ ان کا جزیہ انہی پر خرچ ہوتا ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ان کودیا جاتا ہے۔

ذمیوں سے بقدرِ زکوۃ جزیہ اور ٹیکس لینا

اس زمانے میں اہل ذمہ سے جزیہ لینے کا تصور ہی ختم ہو چکا ہے، اگر بالفرض جزیہ کے نام سے ان سے کچھ لیا جائے تو دشمنان اسلام آسمان سر پر اٹھا لیں گے، ہمیں اگر چہ اس کی پرواہ نہیں ہے انہوں نے پہلے کونسی کسر چھوڑی ہے تاہم عملی طور پر اہل ذمہ سے جزیہ نہیں لیا جارہا اور مسلمانوں سے زکوۃ لی جاتی ہے، کیا یہ درست ہوگا کہ اہل ذمہ سے زکوۃ تو نہیں لی جاسکتی لہٰذا ان سے زکوۃ کے بقدر ٹیکس اور جزیہ وصول کیا جائے؟ مسلمان تو زکوۃ کو فریضہ مذہبی اور عبادت سمجھ کر ادا کرے گا اور اہلِ مہ زکوۃ کی مقدار ٹیکس اور جزیہ کے طور پر ادا کریں گے۔

قرآن وسنت اور فقہاء کرامؒ کے ہاں اس کی تصریح تو نہیں ملتی لیکن اس .مانے میں انتظاماً اور مصلحۃً اہل ذمہ سے زکوۃ کے بقدر ٹیکس اور جزیہ وصول کیا جائے یہ جائز معلوم ہوتا ہے بشرطیکہ:

(۱) یہ ٹیکس ان سے انتظامی اور سیاسی مصلحت کے طور پر لیا جائے، بطورِ اسلامی عبادت کے نہیں۔

(۲) امیرِ وقت مجلس شوریٰ کی رائے اور اتفاق سے نفاذ کا حکم دے۔

(۳) اسے ٹیکس یا سوشل سیکورٹی ایکٹ (Social Seaurity act) وغیرہ کا نام دے دیا جائے تاکہ اس میں اور زکوۃ میں تمیز کی جاسکے اور مسلمان اور غیر مسلمان کا ضمیر اسے قبول بھی کر سکے۔

(۴) زکوۃ کے مصارف الگ مقرر ہوں اور اس انتظامی ٹیکس کے مصارف الگ ہوں۔

دلائل جواز

اس کے جواز کے چند دلائل یہ ہیں:

(۱) شریعت مقدسہ میں جو اہل ذمہ اور غیر مسلموں پر زکوۃ واجب نہیں اور اس پر تمام مذاہب کا اتفاق ہے، اس عدم وجوب سے مرا د"وجوب دینی" ہے، اور وجوب دینی کے دو اثر مرتب ہوتے ہیں۔

(۱) دنیا میں ان سے اس کا مطالبہ ہو سکے۔

(۲) اگر وہ دنیا میں ادا نہ کریں تو آخرت میں ان سے پوچھ گچھ اور حساب ہو۔ ظاہر ہے کہ غیر مسلم اس معنی میں زکوۃ کے مکلف نہیں ہیں، اس کے برعکس اگر حکومت وقت مصلحۃً اور انتظاماً ان پر زکوۃ کے بقدر ٹیکس لگائے تو اس کا تعلق وجوب دینی سے نہیں بلکہ دنیاوی اور ملکی وجوب اور عارضی قانون سے ہے، یہ ایک سیاسی معاملہ ہوگا اور شرعاً اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

(۲) یہ بات تقریباً تواتر تک پہنچتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور میں بنو تغلب سے معروف شرعی جزیہ کی بجائے دوگنی زکوۃ لینے کا فیصلہ فرمایا تھا اور ساتھ یہ بھی فرمایا تھا کہ ہم یہ جزیہ کے طور پر وصول کرتے ہیں تم اسے جو مرضی نام دو اور یہ فیصلہ اہل شوریٰ کی رائے اور صحابہ کرامؓ کے مشورہ اور موجودگی میں ہوا تھا، جس سے معلوم ہوا کہ انتظاماً اہل ذمہ سے زکوۃ کی بقدر یا اس سے دگنا ٹیکس اور جزیہ لینا جائز ہے۔

کتاب الاموال لابی عبید (ص ۵۴۱) میں زرعہ بن نعمانؒ کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نصاری بنو تغلب سے جزیہ لینا چاہتے تھے، لیکن

زرعہ بن نعمان نے آپ سے کہا کہ بنوتغلب عرب قوم ہے اور جزیہ کو پسند نہیں کرتی، یہ لوگ انتقامی جذبات رکھتے ہیں لہٰذا انہیں اس بات کا موقعہ نہ دیں کہ وہ آپ کے دشمن بن کر رہیں،اس بنا پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کیساتھ اس بات پر صلح کرلی کہ وہ دوگنی زکوۃ ادا کریں گے۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے عبادہ بن نعمانؒ سے روایت کیا ہے کہ بنوتغلب نے کہا کہ ہم عرب ہیں،اہل عجم جو کچھ ادا کرتے ہیں وہ ہم ادانہیں کریں گے البتہ ہم سے زکوۃ لیں جو مسلمانوں سے لی جاتی ہے،حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نہیں یہ عبادت ہے اور مسلمانوں پر فرض ہے،آپ سے نہیں لے سکتے،انہوں نے کہا کہ زکوۃ کے نام سے جو جتنا بڑھالیں ہم دیں گے لیکن جزیہ کے نام سے نہیں دیتے پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے اس بات پر صلح کرلی کہ وہ دوگنی زکوۃ ادا کریں گے۔

بعض روایات میں اس کی تصریح ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ حقیقت میں جزیہ اور ٹیکس ہی ہے تم اس کا جو چاہو نام رکھ لو۔

کتاب الخراج یحیٰ بن آدم (ص ٦٥) میں روایت ہے کہ نصاری بنوتغلب کو جزیہ اور ٹیکس کے نام سے نفرت تھی اور انہوں نے خود پیشکش کی تھی کہ ہم سے جزیہ کی بجائے دوگنی زکوۃ وصول کرلی جائے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے قبول کرلیا۔

ڈاکٹرعبدالکریم زیدان نے اپنی کتاب **احکام الذمیین والمستامنین فی دارالاسلام** (ص ١٤٩) میں فقہاء شافعیہ اور حنابلہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

جب کسی ایسی غیر مسلم قوم سے واسطہ پڑجائے جو طاقتور ہو اور جزیہ دینے سے انکاری ہو اور نصاری بنو تغلب کی طرح مصالحت کرنا چاہے اور اس میں مسلمانوں کا فائدہ ہو اور صلح نہ کرنے میں ضرر ہو تو حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے عمل کو سامنے رکھ کر ان سے مصالحت کرنا جائز ہے، بشرطیکہ ان سے زکوۃ او رصدقہ کے نام سے جو کچھ لیا جائے وہ جزیہ کے بقدر یااس سے زیادہ ہو۔

ظاہر ہے کہ زکوۃ کی مقدار عام حالات میں جزیہ کی مقدار سے زائد ہوتی ہے،زکوہ عورت کے مال سے بھی لی جاتی ہے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ نے بھی بنو تغلب سے یہی فیصلہ فرمایا تھااور جزیہ کی مقدار بہت تھوڑی ہوتی ہے جو صرف لڑنے کی طاقت رکھنے والے مردوں سے لیا جاتا ہے۔

(۳)مسلمانوں سے اسلئے زکوۃ وصول کی جاتی ہے کہ انہوں نے کلمہ پڑھ کر اس کا التزام کیا ہےاور زکوۃ کی ادائیگی کی پابندی قبول کی ہے اور غیر مسلموں اوراہلِ ذمہ سے زکوۃ اس لئے نہیں لی جاتی کہ انہوں نے اس کا التزام کیا ہے اور نہ پابندی قبول کی ہے،اس تعلیل کا تقاضہ یہ ہے کہ اگراہل ذمہ بخوشی اس کی پابندی قبول کرلیں تو ان سے زکوۃ کے بقدر ٹیکس لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہئے۔

فی احکام القرآن للجصاص(۹۴/۳) باب حکم نصاری بنی تغلب وقدوردت اخبار متواترة عن ائمة السلف فی تضعیف الصدقة فی اموالهم علی مایؤخذمن من المسلمین وهوقول اهل العراق وابی حنیفة واصحابه والثوری وهو قول الشافعی ....وروی یحی بن آدم عن عمارة بن النعمان انه قال لعمر بن الخطاب یا امیر المؤمنین ان بنی تغلب

قدعلمت شوكتهم وانهم بازاء العدوفان ظاهرواعليك العدد اشتدت مؤنتهم فان رأ يت ان تعطيهم شيئا فافعل فصالحهم على ان لا يغمسوا اولادهم فى النصرانية وضاعف عليهم الصدقة قال:وكان عمارة يقول: قد فعلوا فلا عهدلهم وهذا خبر مستفيض عند اهل الكوفة قدوردت به الرواية والنقل الشائع عملا.وكذافى السنن الكبرى للبيهقى(٢١٦/٩)

وفى السنن الكبرى للبيهقى(٢١٦/٩)قال الشافعى عقيب هذا الحديث:وهكذاحفظ اهل المغازى وساقوه احسن من هذا السياق فقالوا رامهم على الجزية فقالوا نحن عرب لانؤدى مايؤدى العجم ولكن خذ منا كمايا خذ بعضكم من بعض يعنون الصدقة فقال عمر رضى الله تعالىٰ عنه لا هذا فرض على المسلمين فقالوا فزد ماشئت بهذاالاسم لا باسم الجزية ففعل فتراضى هو وهم على ان ضعف عليهم الصدقة .

حصہ دوم

ٹیکس اور زکوۃ

ہم جس دور سے گزر رہے ہیں یہ دور صحیح معنوں میں آزمائش اور فتنوں کا دور ہے،اس دور میں ایسے فتنے بھی وجود میں آئے ہیں جن میں بدیہات کا بھی انکار کیا گیا،بدقسمتی سے ان فتنوں میں سے ایک فتنہ ان جدید خود ساختہ مجتہدین کا بھی ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ زکوۃ ایک ٹیکس ہے، جس طرح حکومتیں عارضی ٹیکس لگاتی ہیں اور زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ان میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے زکوۃ بھی شریعت مقدسہ کا مقرر کردہ ایک ٹیکس ہے،اس نظریہ پر وہ یہ نتیجہ مرتب کرتے ہیں کہ اموال زکوۃ،نصاب زکوۃ اور شروح زکوۃ طے اور متعین نہیں بلکہ ان میں تغیر و تبدل ممکن ہے نیز حکومت کو ٹیکس ادا کرنے سے زکوۃ ادا ہوجاتی ہے۔

یہاں ہم تین امور پر الگ الگ بحث کریں گے (۱) زکوۃ اور ٹیکس میں فرق (۲) زکوۃ کے نصاب،مقدار اور شروح میں تبدیلی ممکن نہیں (۳) سرکاری محصول اور ٹیکس ادا کرنے سے زکوۃ ادا نہیں ہوتی ۔

زکوۃ اور ٹیکس میں فرق

زکوۃ اور ٹیکس میں اتنا اور ایسا ہی فرق ہے جیسے آسمان اور زمین میں ہے،تا ہم یہ فرق بعض لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہا یا آرہا ہے لیکن تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہیں۔زکوۃ اور ٹیکس کے درمیان اہم فرق مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) بنیادی فرق

زمانہ جاہلیت میں ٹیکس کا عام رواج تھا، اسلام نے آکر ظالمانہ ٹیکس کو بالکل ختم کر دیا اور عادلانہ ٹیکس غیر مسلموں پر مقرر کر دیا جبکہ مسلمانوں کے حق میں عادلانہ ٹیکس بھی منسوخ کر کے اس کی جگہ زکوۃ مقرر فرمادی، اس طرح کی احادیث ہم پہلے نقل کر چکے ہیں، چنانچہ عہد نبوی اور خلفاء راشدین کے دور میں مسلمانوں سے صرف زکوۃ ہی وصول کی جاتی تھی۔ البتہ غیر مسلموں سے بعض عادلانہ ٹیکس جیسے خراج اور جزیہ وصول کئے جاتے تھے، عرب کا ہمسایہ ملک ایران تھا جہاں ایک متمدن حکومت قائم تھی، ایران میں زمینداروں سے جو مالیہ وصول کیا جاتا اسے خراگ کہتے تھے، خراج کا لفظ اسی کا معرب ہے اور خراگ کے علاوہ دوسرے ٹیکسوں کو "گزیت" کہا جاتا تھا، جزیہ کا لفظ اسی کا معرب ہے، جزیہ، خراج اور دیگر اسلامی ٹیکسوں کا ذکر ہم مستقل عنوان کے تحت کر چکے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے مسلمانوں کے حق میں ہر قسم کے ٹیکس کو منسوخ کر دیا ظالمانہ کو بھی اور عادلانہ کو بھی، اور غیر مسلموں پر صرف عادلانہ چند ٹیکس لاگو کئے ہیں، گویا کہ زکوۃ مسلمانوں کے حق میں ہر قسم کے ٹیکس کا متبادل ہے، اس عظیم تفاوت کی موجودگی میں کیسے کہا جا سکتا ہے کہ زکوۃ ٹیکس ہے اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

(۲) ماخذ کے اعتبار سے فرق

فقر وغنا کے اعتبار سے شرعاً لوگوں کے چار طبقات ہیں۔

(۱) اعلیٰ قسم کا غنی، جس پر زکوۃ، قربانی، اور صدقۃ الفطر واجب ہے، اور وہ زکوۃ کسی صورت میں نہیں لے سکتا۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو حاجات اصلیہ سے زائد دوسو درہم نقد یا کسی نصاب زکوۃ کا مالک ہو۔

(۲) متوسط غنی، جس پر زکوۃ تو واجب نہیں ہے لیکن قربانی اور صدقۃ الفطر واجب ہے نیز اس کیلئے زکوۃ لینا کسی صورت میں جائز نہیں ہے، اس سے مراد وہ شخص ہے جو ضرورت سے زائد اتنے مال کا مالک ہو جو نصاب زکوۃ تک پہنچ جائے لیکن مال غیر نامی ہو جیسے ٹیلی ویژن، وی سی آر، میزیں، کرسیاں، فروش ومکانات، نوکر چاکر، گاڑیاں، زمین، مال مویشی وغیرہ جو اپنی ضرورت سے زائد ہوں تو نامی نہ ہونے کی وجہ سے اس پر زکوۃ نہیں ہے البتہ قربانی، اور صدقۃ الفطر اس پر واجب ہے نیز وہ زکوۃ کا مستحق بھی نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا طبقہ ہے جس کا شرعاً زکوۃ سے کوئی تعلق نہیں ہے نہ دینے کا نہ لینے کا۔

(۳) ادنیٰ غنی جو کہ حقیقت میں فقیر ہی ہے، اس پر زکوۃ صدقہ الفطر اور قربانی بھی واجب نہیں ہے، اسی طرح اس کیلئے سوال کر کے مانگنا بھی جائز نہیں ہے، اس سے مراد وہ مسکین آدمی ہے جس کے پاس مال واسباب تو موجود نہیں لیکن ایک دن کی خوراک موجود ہے اور پہننے کا کپڑا بھی موجود ہے۔

(۴) مفلوک الحال فقیر، یہ زکوۃ کا مستحق بھی ہے اور زکوۃ مانگ بھی سکتا ہے، اس سے مراد وہ نادار شخص ہے جس کے پاس ایک دن کا کھانا بھی نہیں یا کھانا تو موجود ہے لیکن پہننے کیلئے کپڑا کوئی نہیں ہے۔

مسئلہ کی توضیح کیلئے چار طبقات بنا دیئے ہیں لیکن حقیقت میں تیسرا اور چوتھا

طبقہ ایک ہی ہے کیونکہ دونوں زکوۃ کے مستحق ہیں، محض ایک جزوی مسئلے کا فرق ہے کہ تیسرے طبقے کیلئے زکوۃ مانگنا جائز نہیں اور چوتھے کیلئے جائز ہے۔

شرعی اصول یہ ہے کہ دوسرے طبقے کا زکوۃ سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے، زکوۃ پہلے طبقہ سے لیکر تیسرے طبقے کو دی جاتی ہے، گویا کہ زکوۃ اغنیاء اور مالداروں کی جیب سے نکلتی ہے اور غرباء ومساکین پر صرف ہوتی ہے، اس حقیقت کے پیش نظر ٹیکس زکوۃ کی بالکل نقیض ہے کیونکہ ٹیکس غرباء سے لیکر اغنیاء پر خرچ کیا جاتا ہے۔

اس کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ مثلاً پاکستان کی مجموعہ آمدنی کا تقریبا ۷۵٪، ۸۰٪، اور ۸۵٪ حصہ صرف ٹیکسوں کی صورت میں وصول کیا جاتا ہے اور باقی ۲۵٪ ۲۰٪ یا ۱۵٪ حصہ دوسرے ذرائع آمدنی سے وصول کیا جاتا ہے، پھر ٹیکس کی دو اقسام ہیں۔

(۱) بلاواسطہ ٹیکس، براہِ راست ٹیکس (Direct Tax) جیسے انکم ٹیکس، پراپرٹی ٹیکس، دولت ٹیکس وغیرہ، یہ ٹیکس امراء اور اغنیاء پر لگایا جاتا ہے۔

(۲) بالواسطہ ٹیکس:(Indirect Tax) یہ وہ ٹیکس ہے جو ادا تو اغنیاء، صنعت کار اور تاجر کرتے ہیں لیکن اسے مصنوعات کی لاگت میں شامل کر کے ان کا بوجھ صارفین پر ڈال دیا جاتا ہے، جیسے سیلز ٹیکس، ایکسائز ڈیوٹی وغیرہ جو عمومی اشیاء صرف، چینی، چائے دالوں، سریا، سیمنٹ، کپڑوں وغیرہ پر لگایا جاتا ہے اور یہ بھی طے ہے کہ صارفین کا بیشتر طبقہ غریب ہی ہے۔حالیہ ایک سروے کے مطابق ۷۵٪ آبادی غریب ہے، پھر ان میں سے آدھی کے قریب آبادی غربت کی سطح سے بھی نیچے

زندگی گزار رہی ہے، ورلڈ بینک کے مطابق شدید غربت (EXTREME POVERTY) کی تعریف یہ ہے کہ کسی شخص کی یومیہ آمدنی ایک ڈالر سے بھی کم ہو، جب کہ معتدل غریب کی تعریف یہ ہے کہ کسی شخص کی یومیہ آمدنی دو ڈالر سے کم ہو، ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق پاکستان کی ۳۲،۶ فیصد آبادی خطِ افلاس و فقر یعنی (POVERTY LINE) سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔

پھر جب ٹیکس کی ان اقسام میں موازنہ کیا جائے تو بلا واسطہ ٹیکس، جو اغنیا پر لگتا ہے وہ ٹیکسوں کی مجموعی آمدنی کا بمشکل دسواں حصہ بنتا ہے اور بالواسطہ ٹیکس ٹیکسوں کی مجموعی آمدنی کا ۹۰٪ کے قریب ہے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ٹیکس مجموعی اعتبار سے غریبوں سے لیا جاتا ہے، اور خرچ تو ہوتا ہی اغنیاء پر ہے۔

(۳) نام اور عنوان کا فرق

زکوۃ اور ٹیکس کے مابین فرق ان کے ناموں سے نمایاں ہے کہ زکوۃ کے معنی پاکی، نشو ونما اور برکت کے ہیں، شریعت اسلامیہ نے مال کے اس حصہ کو جو زکوۃ دہندہ فقراء کو دیتا ہے، زکوۃ کہا ہے، اور اس سے دینے والے کے نفس میں یہ تاثر پیدا کیا ہے کہ اس کا یہ عمل سراسر خیر و برکت کا حامل، اس کے مال کو نشو ونما دینے والا اور اس کو پاک کردینے والا ہے۔

جبکہ ٹیکس کا لفظ محض جبر والزام کا مفہوم ادا کرتا ہے، یعنی یہ ایک تاوان ہے، جو زبردستی اور بالجبر مالدار شخص پر لادیا گایا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ لوگ ٹیکس کو ایک بے حد ناگوار بوجھ اور اپنے مال پر پڑجانے والا ڈنڈ (تاوان) سمجھتے ہیں۔

زکوۃ کا لفظ اپنی پاکیزگی، برکت اور نشو ونما کے مفہوم کے ساتھ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ صاحب مال جس مال کو اللہ کا حق ادا کئے بغیر جمع کرتا ہے وہ نجس اور ناپاک رہتا ہے، اور زکوۃ ہی وہ سبب ہے جو اس مال کو پاک کرتا ہے، اور صاحب مال کو بخل

اورحرص سے صاف کرتا ہے۔

زکوۃ کا مذکورہ لفظ بتاتا ہے کہ جومال بظاہرزکوۃ اداکرنے کی وجہ سے کم ہوتا نظرآتا ہے درحقیقت وہ نشوونما پارہا ہے،اوراس میں اضافہ ہورہا ہے۔

چنانچہ اللہ کاارشاد ہے:یمحق اللہ الربواویربی الصدقات(البقرۃ:۲۷۶)

اللہ سودکومٹاتا ہے اورخیرات وصدقات کوبڑھاتا ہے۔

اورفرمایا:وماانفقتم من شیء فھویخلفہ(السباء:۳۹)

اورتم جوبھی خرچ کرتے ہواللہ تعالی اس کاعوض دیتے ہیں۔

اورنبی ﷺ نے ارشادفرمایا:

صدقہ دینے سے مال کم نہیں ہوتا۔

زکوۃ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکی،نماء اوربرکت صرف مال ہی میں نہیں ہوتی بلکہ خودزکوۃ دہندہ بھی پاکیزگی اورتزکیہ حاصل کرتا ہے،اورزکوۃ وصول کرنے والے کانفس بھی حسداورنفرت سے پاک ہوجاتا ہے،کیونکہ اسے مال زکوۃ سے اپنی معیشت کواستوارکرنے کاموقعہ مل جاتا ہے،اوراس کی اوراس کے بچوں کی کفالت ہوجاتی ہے،جبکہ زکوۃ دہندہ کوبخل وحرص سے نجات مل جاتی ہے اوراس کی جان،مال اوراولادمیں برکت ہوتی ہے۔اللہ کاارشاد ہے۔

خذمن اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم بھا(التوبۃ:۱۰۳)

ان کے مال میں سے زکوۃ لے لیں ان کوپاک کریں اوراس سے ان کی تربیت کریں۔

(۴)ماہیت وکیفیت کافرق

ٹیکس محض تمدنی پابندی ہے جبکہ زکوۃ عبادت،ذریعہ ثواب،شکرالہی اورفریضہ دینی ہے،اس لئے زکوۃ کی ادائیگی میں نیت شرط ہے،کیونکہ عبادت نیت کے بغیرمتحقق نہیں ہوسکتی،چنانچہ حدیث میں ہے:انماالاعمال بالنیات یعنی اعمال کامدارنیتوں پر ہے۔

اوراللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وماامروا الالیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین(البینۃ:۵)

ان کو یہی حکم ہوا کہ اللہ کی عبادت کریں، اس کے واسطے بندگی خالص کرتے ہوئے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بیس سے زائد مقامات پر زکوۃ کو نماز کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اوراحادیث میں لاتعداد مقامات پر زکوۃ کو نماز کے ساتھ بیان کی گیا ہے، کتب فقہ میں بھی زکوۃ کو عبادات کے ذیل میں بیان کیا جاتا ہے، کیونکہ زکوۃ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک عظیم رکن اور بڑی عبادت ہے۔

چونکہ زکوۃ ایک عبادت ہے، اس لئے صرف مسلمانوں ہی پر فرض ہے، اور شریعت اسلامیہ نے یہ گوارہ نہ کیا کہ اس کو غیر مسلموں پر لازم کیا جائے کیونکہ زکوۃ عبادت اور دینی شعار ہے، جبکہ ٹیکس میں مذہب کی کوئی قید نہیں ہوتی، بلکہ صرف قدرت ادائیگی مدنظر ہوتی ہے۔

(۵) نصاب اور مقدار کی تحدید کا فرق

زکوۃ ایک مقررہ حق ہے جسے شارع نے مقرر کردیا ہے، اور ہر مال کے نصاب کا تعین کردیا ہے اوراس مقررہ نصاب سے کم مقدار کو زکوۃ سے مستثنی قرار دیا ہے اور زکوۃ کی مقداریں یعنی خمس (۱/۵) عشر (۱/۱۰) نصف عشر (۱/۲۰) اورربع عشر (۱/۴۰) متعین کردی ہیں، یہ سب امور طے شدہ ہیں اور کسی کو ان میں ردوبدل اور کمی بیشی کا اختیار نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ علماء کرام نے ان لوگوں کو برسرغلط قرار دیا ہے جو عصر جدید کے اقتصادی اوراجتماعی حالات کے پیش نظر زکوۃ کی مقادیر میں اضافہ کے قائل ہیں، جبکہ ٹیکس بلحاظ ظرف، مقدار اوروقت کے حکمران کی صوابدید پر موقوف ہے، بلکہ ٹیکس کا وجود یا عدم وجود باعتبار ضرورت صاحب اختیار افراد کے ہاتھ میں ہے۔

(٦) ثبات ودوام کا فرق

زکوۃ دائمی اور ثابت شدہ فریضہ ہے اور جب تک دنیا میں مسلمان موجود ہیں، اس

میں کوئی تغیر نہیں ہوسکتا اور کوئی شخص اس میں ردوبدل نہیں کرسکتا کیونکہ اسلام میں زکوۃ نماز کی طرح ہے جبکہ ٹیکس میں دوام اور بقاء کی یہ صفت موجود نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیت، صفت اور مقدار ہمہ وقت تغیر پذیر ہے اور حکومت وقت اس میں ردوبدل کرسکتی اور حسب ضرورت بعض ٹیکسوں کو بالکل ختم کرسکتی ہے اور دیگر نئے ٹیکس عائد کرسکتی ہے۔

(۷) مصارف کا فرق

زکوۃ کے مصارف بھی مخصوص ہیں جنہیں اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں بیان کردیا ہے: انما الصدقات للفقراء الخ اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی سنت میں ان کی توضیح وتشریح فرمادی ہے، جبکہ ٹیکس کو حکومت ریاست کے عام اخراجات میں اپنی صوابدید کے مطابق صرف کرتی ہے، یعنی زکوۃ کا بجٹ حکومت کے بجٹ کے علاوہ ہے جو اللہ سبحانہ کے مقرر کردہ خاص مصارف میں صرف کی جاتی ہے۔

(۸) حکومت سے تعلق کا فرق

ٹیکس کی ادائیگی کا تعلق مالدار اور حکومتِ وقت سے ہے کہ حکومت ہی اس پر ٹیکس لگاتی ہے، وہی اس کی شرح متعین کرتی ہے اور وہی وصول کرتی ہے اور اگر حکومت چاہے تو اس مقدار کو کم کردے یا کسی خاص سبب سے اس کا کچھ حصہ معاف کردے یا سرے سے کوئی ٹیکس یا تمام ٹیکس منسوخ کردے اور اگر حکومت ٹیکس میں چھوٹ دیدے یا ٹیکس دہندہ سے اس کی ادائیگی کا مطالبہ نہ کرے تو اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی جبکہ زکوۃ ہر لحاظ سے خدا اور بندہ کے درمیان ایک تعلق ہے کہ خدا ہی نے مال دیا ہے اور اسی نے زکوۃ کا حکم دیا ہے اور اسی نے اس کی مقداریں اور نصاب متعین کئے ہیں، اس لئے اگر اسلامی ریاست موجود نہ ہو یا موجود ہو لیکن مسلمانوں سے زکوۃ وصول کرکے مستحقین میں تقسیم نہ کرے تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ازخود اپنی زکوۃ مستحقین کو پہنچائیں، جیسے اگر کوئی مسلمان ایسی جگہ ہو جہاں مسجد نہ ہو اور نہ امام ہو تو وہ خود اپنی نماز ادا کرے گا اور نماز ہرگز ترک نہیں کرے گا۔ اس لئے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زکوۃ بخوشی

اداکرے اوراللہ سے اس کی قبولیت کا خواستگار ہو،اس سے فرار حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے جیسا کہ ٹیکس دہندگان ٹیکس سے بچنے کے طریقے ایجاد کرتے ہیں،مسلمان کے لئے ادائے زکوۃ ایک فریضہ الٰہی ہے جسے وہ حصول ثواب اوررضائے حق کے لئے اداکرتے ہیں۔

(۹)اہداف ومقاصد کا فرق

زکوۃ کے روحانی اوراخلاقی فوائداس قدر کثیراوررفیع ہیں کہ نظام ٹیکس کی وہاں تک رسائی ہی نہیں ہوسکتی،ان میں سے سب سے عظیم مقصداورسب سے رفیع ہدف وہی ہے جسے قرآن کریم نے مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیاہے۔**خذمن اموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بهاوصل عليهم ان صلوتك سكن لهم**(التوبة: ۱۰۳)

ان کے اموال میں سے زکوۃ لیں،ان کوپاک کریں اوراس سے ان کی تربیت ہواوران کودعا دیجئے بلاشبہ آپ کی دعاان کے لئے سکون اورآسودگی کاذریعہ ہے۔

نبی کریم ﷺ ہرزکوۃ دہندہ کودعاء دیتے کہ اس کے مال اوراس کے نفس میں برکت ہواورمستحب یہ ہے کہ ہروصول کنندہ زکوۃ یہی دعادے بلکہ بعض فقہاء کرام نے اس کوواجب کہاہے،کیونکہ یہ آیت امرپرمشتمل ہے اورامروجوب پردلالت کرتاہے۔

ٹیکس اس قسم کے روحانی اوراخلاقی اہداف سے یکسرخالی ہے،یہاں تک کہ ایک عرصہ تک یہی تصوررہاکہ ٹیکس کامال سرکارکےخزانے میں جمع کرنے علاوہ اس کااورکوئی مقصدنہیں ہے لیکن اجتماعی،سیاسی اوراقتصادی تغیرات سے یہ تصورابھراکہ ٹیکس کے بہرحال کچھ اقتصادی اوراجتماعی مقاصدبھی ہیں مثلاًیہ کہ افرادمعاشرہ کوخرچ کرنے یاپس اندازکرنے یاآسائشات پرکم خرچ کرنے پرآمادہ کیاجائے،بہرحال ٹیکس کے یہ مادی فوائدہیں اورہنوزماہرین مالیات ٹیکس کے ان مادی مقاصدسے بلندتراخلاقی اورروحانی فوائدواہداف دریافت نہیں کرسکے۔

(۱۰) زکوۃ اور ٹیکس کے اساسی تصور کے لحاظ سے فرق

ٹیکس کا کوئی اساسی تصور نہیں بلکہ یہ متضاد قانونی اور نظریاتی بنیادوں پر قائم ہے جبکہ زکوۃ کی واضح اسس اور بنیادیں ہیں۔

اس فرق کی قدرے تفصیل لکھی جاتی ہے۔

ٹیکس کے لزوم کی قانونی اساس

ٹیکس کے لزوم کا کوئی اساسی تصور موجود نہیں ہے، اس کی بنیاد اگر ہے تو وہ متضاد نظریاتی بنیاد ہے چنانچہ اس کے لزوم کی قانونی اساس کی تعبیر میں مفکرین اور ماہرین مالیات واقتصادیات کا شدید اختلاف ہے، اس بارے دو قول پائے جاتے ہیں (۱) تعاقدی تصور (۲) اقتدار ریاست کا تصور۔

تعاقدی تصور اور اس کی تفصیل

اٹھارویں صدی عیسوی کے فلاسفر، جن میں جان کاک روسو سر فہرست ہے، اس بات کے قائل رہے ہیں کہ ٹیکس کے لزوم کی قانونی اساس فرد اور ریاست کا باہمی تعاقد اور معاملہ ہے، وہ اس طرح کہ مالدار ریاست کو ٹیکس دیتا ہے اور اس کے بدلے مرافق عامہ (PUBLIC FACILITIES) حاصل کرتا ہے، اس طرح ریاست اور اس کے شہریوں کے درمیان اجتماعی عقد منعقد ہوتا ہے، اس رائے کو تعاقدی تصور کہا جاتا ہے پھر اس عقد اجتماعی (تعاقد) کی کیفیت اور حیثیت کیا ہے؟ اس میں بھی اختلاف ہے، کئی آراء موجود ہیں۔

(۱) بعض کا کہنا ہے کہ یہ معاملہ بیع یعنی خرید وفروخت کا معاملہ ہے اور اس میں ٹیکس فرد(INDIVEDULA) کی فوری قیمت ہے جسے وہ ادا کرکے اس کے بدلے معاشرے کی حمایت حاصل کرتا ہے۔یہ رائے میرابوکی طرف منسوب ہے۔

(۲) بعض کا کہنا ہے کہ یہ معاملہ اجرت پر کام کرانے کا معاملہ ہے وہ اس طرح کہ ریاست رعایااور شہریوں کی خدمات انجام دیتی ہے اور شہری اس کے بدلے ٹیکس ادا کرتے ہیں، یہ رائے آدم سمتھ (ADAM SMITH) کی ہے۔

(۳) بعض کا کہنا ہے کہ یہ معاملہ بیمہ اور تامین(INSURANCE) کا معاملہ ہے کہ صاحب مال باقی ماندہ مال پر اتنی قسط ٹیکس کی صورت میں ادا کرتا ہے، یہ رائے مونٹیکو اور ہوبز کی ہے۔

نقد وتبصرہ

ناقدین نے ٹیکس کیلئے بنیادی اساس تعاقد قرار دینے کوسختی سے رد کیا ہے اور تعاقد کی مذکورہ حیثیتوں پر بھی کلام کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ٹیکس میں اور ٹیکس دہندہ کو حاصل ہونے والے فوائد میں کوئی تناسب نہیں ہوتا کیونکہ یہ عملاً تقریباً ناممکن ہے کہ ہر شہری کو امن عامہ،انصاف، تعلیم اور دفاع وطن کے جو فوائد حاصل ہورہے ہیں ان کی ہر ہر شہری کے لحاظ سے مقدار کا تناسب ہوسکے یعنی جو شہری جس قدر ٹیکس ادا کررہا ہے اسی قدر اسے فوائد بھی حاصل ہورہے ہوں،ایسا ممکن نہیں اور بالفرض اگر یہ ممکن بھی ہوتو بھی یہ ایک ظالمانہ تصور ہے کیونکہ فقراء غرباء اور مساکین مالدار طبقوں کی بنسبت ریاستی امداد وتعاون کے زیادہ محتاج ہوتے ہیں اور اس تعاقد یعنی تبادلہ اور اجارہ کے تصور کے تحت انہیں زیادہ ٹیکس ادا کرنا چاہئے لہٰذا

اس تعاقد کی حیثیت بیع واجارہ کی نہ ہوئی اوراسے تامین بھی نہیں کہہ سکتے،اس کوتامین قراردینے کے تصور میں دوخرابیاں لازم آتی ہیں۔

(۱)اگراسے عقد تامین(Insurance) قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ریاست کے فرائض صرف امن(Security)فراہم کرنے تک محدود ہیں حالانکہ یہ غلط ہے۔

(۲)اگر یہ معاملہ عقد تامین ہے تواس کا مطلب ہوگا کہ ریاست ٹیکس دہندہ کوخساروں کا عوض بھی دے جیسا کہ عقد تامین کا مفہوم ہے حالانکہ ریاست ایسا نہیں کرتی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ٹیکس کا تعاقدی تصور درست نہیں ہے،یہی وجہ ہے کہ بعد میں اس کے مقابلہ میں دوسرا تصوراقتدارِ ریاست پیش کیا گیا۔

اقتدار ریاست کا تصور اور اس کی تفصیل

بعض حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ ٹیکس کے لزوم کی قانونی اساس اقتدارِ ریاست ہے،جس کا مطلب یہ ہے کہ دراصل ریاست اجتماعی ضروریات پوری کرتی ہے اورحکومت کے پیش نظر خاص افراد کی مصالح نہیں ہوتیں بلکہ عام مصالح مفادات اور قومی یکجہتی ہوتی ہے،اورظاہر ہے کہ ان خدمات کی انجام دہی کیلئے اخراجات کی ضرورت ہے،اس لئے ریاست اپنے اقتدار کی مدد سے شہریوں پر لازم کرتی ہے کہ وہ ان اخراجات میں ریاست کی مدد کریں اور اس بوجھ کو اٹھائیں،اس کے بعد خود ریاست ذمہ داری کے اس بوجھ کوشہریوں کی مالی حالت کے اعتبار سے ان پر تقسیم کردیتی ہے،جس سے اجتماعی یکجہتی کا وہ تقاضا بھی پورا ہوجاتا ہے جس کی

اساس پر جدید سیاسی جمعیتیں قائم ہیں۔

فرضیت زکوۃ کی اساس

ٹیکس کے برعکس زکوۃ اور دیگر تمام شرعی مالی حقوق کی فرضیت کی اساس موجود ہے، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فرضیت زکوۃ کی اساس یہ چند امور ہیں۔

(۱) تکلیف کا تصور عام (۲) استخلاف کا تصور (۳) افراد و معاشرے کے درمیان کفالت باہمی کا تصور (۴) اخوت باہمی کا تصور۔

ان تصورات کی مختصر وضاحت یہ ہے کہ:

(۱) تکلیف کے تصور کا مطلب یہ ہے مسلمان اللہ کا بندہ اور مخلوق ہے، اللہ تعالیٰ خالق مالک اور منعم اور مولی ہے، اور مولی اپنے بندوں پر جو چاہے مالی و جسمانی حقوق و فرائض عائد کرسکتا ہے، تا کہ بندے اپنے مولی کا حق ادا کریں، اس کی نعمتوں کا شکر کریں اور ان حقوق کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے کہ کون اچھے اعمال کرتا ہے۔

(۲) تصور استخلاف کا مطلب یہ ہے کہ سارے اموال اللہ کی ملکیت ہیں بندہ ان میں محض نائب اور خلیفہ ہوتا ہے، چونکہ مال کے حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہیں اور مسلمان نائب ہے، اسلئے ظاہر ہے کہ مال میں تصرف اللہ تعالی کی اجازت اور اس کی مرضی کے مطابق ہونا چاہئے، اس مرضی میں زکوۃ کی ادائیگی بھی ہے۔

(۳) افراد اور معاشرے کے درمیان کفالتِ باہمی کا مطلب یہ ہے کہ انسان جو کچھ کماتا ہے کسی نہ کسی طرح اس میں معاشرے اور دوسرے افراد کا تعاون شامل ہوتا ہے، اس لئے زکوۃ کا حکم دیا گیا تا کہ اس مال سے معاشرے کے مستحق

افراد بھی مستفید ہوں۔

(۴) اخوت باہمی کے تصور کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اور سارے مسلمان جسم واحد کی طرح ہیں، اگر ایک مسلمان کو تکلیف ہو تو سب کو اس تکلیف میں شریک ہونا چاہئے، اگر ایک تنگدست ہے تو تکلیف سب کو ہونی چاہئے اس تصور کے پیش نظر زکوۃ فرض کی گئی، تا کہ غرباء و مساکین کا دکھ اغنیاء بھی برداشت کریں۔

تصورات مذکورہ کی مختصر وضاحت کر دی گئی ہے، اس سے بنیادی مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے، ان کی مکمل تفصیل شیخ یوسف قرضاوی نے فقہ الزکوۃ میں کی ہے جس کا یہاں نقل کرنا فائدہ سے خالی نہیں، اس لئے بعینہ نقل کی جاتی ہے۔

(ا) تکلیف کا تصورِ عام

پہلا تصور انسان کے مکلف ہونے کا عام تصور ہے یعنی خالق منعم کا یہ حق ہے کہ وہ اپنے بندوں پر جو چاہے مالی اور جسمانی حقوق فرائض عائد کر دے تا کہ بندے اپنے مولی کا حق ادا کریں، اس کی نعمت پر شکر ادا کریں اور اللہ تعالیٰ ان کا امتحان لے کہ کون ان میں اچھے عمل کرتا ہے اور کون اللہ کے ہادی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے، انسان اس دنیا میں ایک ذمہ دار اور جواب دہ بنا کر بھیجا گیا ہے اور اس کی تخلیق یونہی عبث نہیں ہے۔

افحسبتم انما خلقنکم عبثا وانکم الینا لاترجعون ٥

(المؤمنون:١١٥)

کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے۔

ایحسب الانسان ان یترک سدی(القیامة: ۳۶)

کیا انسان کا یہی خیال ہے کہ وہ بے قید چھوٹا رہے گا؟

بلا شبہ انسان یونہی بیکار نہیں بھیجا گیا بلکہ اس کی تخلیق کا ایک مقصد ہے جس کی توضیح کیلئے انبیاء اور رسول آئے، جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی بیان کئے اور اللہ تعالیٰ کے فرائض وواجبات واضح کئے تاکہ نیکوکاروں کو ان کے اعمال حسنہ کا صلہ ملے اور بروں کو برے اعمال کی سزا دی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمان پر نماز فرض کی تاکہ وہ دن میں پانچ مرتبہ ہوائے نفس اور دواعی غفلت اور جذباتِ تساہل پر قابو پا کر نماز ادا کرے، سال بھر میں ایک مرتبہ مسلمان کو ایک ماہ کے روزوں کا مکلف قرار دیا تاکہ بندہ اپنے مولیٰ کی رضا کے حصول کیلئے کھانا پینا اور لذتیں ترک کردے اور پوری عمر میں ایک مرتبہ حج کا مکلف قرار دیا تاکہ بندہ رضائے الٰہی کے لئے اپنا گھر اور وطن چھوڑ کر وادیٔ غیر ذی زرع پہنچے، بیت اللہ کا طواف کرے اور شعائر حج ادا کرے۔

جس طرح اللہ سبحانہ نے خالص بدنی عبادت نماز، روزہ، فرض کیں، بدنی اور مالی عبادت حج فرض کی، اسی طرح خالص مالی عبادت زکوۃ فرض کی تاکہ بندہ رضائے رب کی خاطر زندگی کا سرمایہ اور فتنہء دنیا صرف کرے تاکہ معلوم ہو کہ کون اللہ کی عبادت کرتا ہے اور اس کی راہ میں مال خرچ کرتا ہے اور کون مال دنیا ہی کی پرستش کرکے ہلاکت میں پڑ جاتا ہے۔

ومن یوق شح نفسه فاولئک هم المفلحون (الحشر: ۹)

اور جو اپنے جی کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ مراد اور فلاح پانے والے ہیں۔

تصور استخلاف

حقیقت یہ ہے کہ مال اللہ کی ملکیت ہے اور انسان کو بطور نیابت اس میں فرائض متعلقہ کی انجام دہی سپرد کی گئی ہے۔

ولله مافی السموت وما فی الارض (النجم : ۳۱)

اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اصل میں اللہ ہی کا ہے۔

له مافی السموت وما فی الارض وما بینهما وما تحت الثری.(طه:۵)

جو کچھ آسمان وزمین میں اور ان دونوں کے بیچ میں اور گیلی زمین کے نیچے ہے وہ اللہ ہی کا ہے۔

غرض دنیا کی ہر شے خالصتاً اللہ سبحانہ کی ملک میں ہے اور کوئی بھی اس کے ایک ذرے میں بھی اس کا شریک نہیں ہے۔

قل ادعواالذین زعمتم من دون الله لایملکون مثقال ذرة فی السمٰوٰت ولا فی الارض وما لهم فیهما من شرک وماله منهم من ظهیر. (سباء : ۲۲)

آپ کہہ دیں ان کو پکارو جن کا تم دعویٰ کرتے ہو اللہ کے سوا، وہ نہیں مالک ایک ذرہ بھر کے آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہ ان کی ان دونوں میں شراکت

ہے اور نہ ان میں کوئی اس کا مددگار ہے۔

اللہ خالق کل شئی وھو علی کل شئی وکیل.(الزمر ۶۲)

اللہ ہر چیز کا بنانے والا ہے اور وہ ہر چیز کا ذمہ لیتا ہے۔

وخلق کل شیئی فقدرہ تقدیرا(الفرقان :۲)

اور اللہ نے ہر چیز بنائی پھر اس کو ماپ کر ٹھیک کیا۔

ان الذین تدعون من دون اللہ لن یخلقوا ذبابا ولواجتمعوا لہ.(الحج:۷۳)

جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا وہ ہرگز ایک مکھی نہ بنا سکیں گے اگرچہ سارے جمع ہوں۔

تمام اموال اللہ کی ملک ہیں، وہی دینے والا ہے اور وہی منعم ہے اور وہی اکیلا ہر شے کا خالق ہے اوجو پیداوار انسان حاصل کرتا ہے وہ اللہ کی مخلوقات ہی سے حاصل کرسکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ماہرین اقتصادیات ومالیات کہتے ہیں کہ انسان کی پیداوار(Production)دراصل منفعت کی تخلیق ہے، مادہ کی تخلیق نہیں ہے یعنی انسان مادہ میں حسب منشا ردوبدل کر کے اپنی ضروریات پوری کرتا ہے ۔مگر اس تغیر سے ان اشیاء کی ماہیت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی بلکہ ہوتایہ ہے کہ انسان بعض اشیاء کو اصل جگہ سے دوسری جگہ منتقل کردیتا ہے اورایسے مقام پر لے جاتا ہے، جہاں ان کی احتیاج زیادہ ہوتی ہے یاان کا ذخیرہ کرلیتا ہے تاکہ مستقبل میں کام آسکیں یاان کوآمیزش سے پکاکر، پیس کر، نقش کر کے کوئی نئی شئے وجود میں لے آتا ہے، بہر حال

یہ جملہ صورتیں تغیر وتبدل کی ہیں تخلیق مادہ کی نہیں ہیں، ماہرین معاشیات بھی اسی حقیقت پر متفق ہیں کہ انسان کا کام محض تغیر وتبدل کے ذریعے موجود اشیاء کو اپنی ضرورت کے مطابق بنانا ہے جبکہ موجد اصل اللہ ہے۔

ربنا الذی اعطی کل شئی خلقه ثم هدی(طٰهٰ: ۵۰)

ہمارا وہ رب ہے جس نے ہر چیز کو اس کی صورت دی پھر راہ دکھائی۔

الله الذی خلق السموت والارض وانزل من السماء ماء فاخرج به من الثمرات رزقا لکم وسخر لکم الفلک لتجری فی البحر بامره وسخر لکم الانهار وسخرلکم الشمس والقمردآئبين وسخرلکم اليل والنهاروآتاکم من کل ماسألتموه وان تعدوا نعمة الله لاتحصوها(ابراهيم : ۳۲،۳۴)

اللہ وہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین اور اتارا آسمان سے پانی پھر اس سے تمہاری روزی اور میوے نکالے اور کشتی تمہارے لئے مسخر کی تا کہ چلے دریا میں، اس کے حکم سے اور تمہارے لئے ندیاں اور سورج اور چاند مسخر کئے، ایک دستور پر اور کام میں لگائے تمہارے لئے رات اور دن اور دیا تم کو ہر چیز میں سے جو تم نے مانگی اور اگر تم اللہ کے احسان گنواؤ تو نہ پورے کرسکو۔

بلکہ تغیر وتبدل کے طریقے بھی انسان کو اللہ ہی نے بتائے ہیں، اسی نے انسان کو یہ قدرت عطا کی ہے اور اسی نے انسان کو علم عطا کیا ہے، انسان جب زمین میں کاشت کرتا اور اس میں بیج ڈالتا ہے تو ذرا غور فرمایئے کہ فصل کی تیاری تک انسان کا عمل کس قدر ہے اور حق سبحانہ کی قدرت کا اظہار کتنا ہے کہ اللہ نے زمین کو

زراعت کے قابل بنایا، ہوائیں چلائیں، پانی برسایا، گرمی اور روشنی فراہم کی، مٹی میں چھپے ہوئے بیج کو مٹی ہی سے غذا فراہم کی اور ننھے سے بیج کو حکم دیا کہ وہ ہرا بھرا پھل دار درخت بن جائے، انسان کے تمام اعمال عقل، تدبیر اور قدرت کے محتاج ہیں اور یہ صلاحیتیں اللہ نے اسے عطا کی ہیں۔

افرئیتم ما تحرثونoأأنتم تزرعونه ام نحن الزارعونo لونشاء لجعلناه حطاما فظلتم تفكهون o انا لمغرمونoبل نحن محرومون o أفرئيتم الماء الذى تشربونo االتم انزلتموه من المزن ام نحن المنزلونo ولونشاء جعلناه اجاجا فلو لا تشكرون o(الواقعة٦٣ . ٧٠)

بھلا دیکھو تو ! جو بوتے ہو کیا تم اس کو کرتے ہو کھیتی یا ہم ہیں کھیتی کرنے والے؟ اگر ہم چاہیں کر ڈالیں اس کو روندن پھر تم سارے دن رہو باتیں بناتے ہم قرضدار رہ گئے بلکہ ہم بے نصیب ہوئے بھلا دیکھو تو! پانی جو تم پیتے ہو کیا تم نے اتارا اس کو بادل سے یا ہم ہیں اتارنے والے؟ اگر ہم چاہیں اس کو کردیں کھارا پھر کیوں نہیں حق مانتے؟

فلينظر الانسان الى طعامهoاناصببنا الماء صبالم شققنا الارض شقا oفانبتنا فيها حبا وعنبا وقضبا o(عبس: ٢١،٢٨)

اب نگاہ کرے آدمی اپنے کھانے کو کہ ہم نے ڈالا پانی اوپر سے پھر چیرا زمین کو پھاڑ کر پھر اگایا اس میں اناج اور انگور اور ترکاری۔

وآية لهم الارض الميتة احييناها واخرجنا منهاحبا فمنه ياكلونo وجعلنا فيها جنات من نخيل واعناب وفجرنا فيها من العيون oلياكلو ا

من ثمرہ وماعملتہ ایدیھم افلا یشکرون ٥(یٰس: ۳۳،۳۵)

اور ایک نشانی ہے ان کے لئے زمین مردہ اس کو ہم نے زندہ کیا اور نکالا اس میں سے اناج، سو اس میں سے کھاتے ہیں اور بنائے ہم نے اس میں باغ کھجور کے اور انگور کے اور بنائے اس میں بعضے چشمے کہ کھاویں اس کے میووں سے اور وہ بنایا نہیں ان کے ہاتھوں نے پھر کیوں شکر نہیں کرتے۔

بندے اپنے رب کا کیوں شکر ادا نہیں کرتے حالانکہ جو پھل اور جو رزق وہ کھا رہے ہیں وہ مردہ زمین سے اللہ نے پیدا کئے ہیں اور ارضی پیداوار ہی نہیں بلکہ ہر پیداوار اللہ کے حکم سے ہوتی ہے اور ہر شے میں جو مادہ استعمال ہوتا ہے وہ اللہ ہی کی تخلیق ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے فرمایا کہ لوہے جیسی سخت شئے جو بے حد مفید ہے ہم نے نازل کی ہے۔

وانزلنا الحدید فیہ بأس شدید ومنافع للناس (الحدید: ۲۵)

اور ہم نے لوہا اتارا ہے، اس میں سخت لڑائی ہے اور لوگوں کے بڑے منافع ہیں۔

انزلنا کا لفظ بتلا رہا ہے کہ لوہے کا زمین پر اتارا جانا حکمت رب اور تدبیر الٰہی ہے جس میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ ہر جلنے والا مادہ اور حرکت دینے والی قوت اللہ کی پیدا کردہ ہے خواہ کوئلہ ہو، پٹرول ہو یا بجلی ہو،انسان کا کام صرف یہ ہے کہ اس نے دریافت کرلیا ہے کہ یہ ایک قوت ہے جو اس کے لئے مفید ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ راہنمائی بھی اللہ تعالیٰ ہی نے فرمائی ہے کہ اے انسان، تیرے لئے زمین کے پرتوں میں فلاں شئے مخفی ہے تو اسے اس طرح

دریافت کر اور اس طرح اپنے کام میں لا۔

وعلمنا ہ صنعة لبوس لکم لتحصنکم من باسکم فھل انتم شاکرون ٥(الانبیاء: ٨٠)

اور ہم نے اس کو تمہارا پہناوا بنانا سکھایا تاکہ وہ تم کو تمہاری لڑائی سے بچائے، سو کچھ تم شکر کرتے ہو۔

مختصر یہ کہ مال سارا کا سارا اللہ ہی کا ہے اور انسان جس قدر عمل اور جدو جہد کرتا ہے وہ اسی وقت بار آور ہوتی ہے جب اس میں اللہ کی مشیت اور اس کی امداد شامل ہوتی ہے۔

وما بکم من نعمة فمن اللہ (النحل :٥٣)

اور جو تمہارے پاس کوئی نعمت ہے، سو وہ اللہ کی طرف سے ہے۔

جب ہر شے اللہ کی ملک ہے اور اس ملکیت میں انسان اللہ کا نائب ہے تو اسے اللہ کے بندوں پر اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے پر اس مال کا کچھ حصہ خرچ کرنا چاہئے تاکہ واہب نعمت کا شکر ادا ہو، اسی لیے فرمایا۔

انفقو امما رزقناکم . (البقرة : ٢٥٤)

جو ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرو۔

ومما رزقناھم ینفقون. (البقرة: ٤)

اور وہ ہمارے دئے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں۔

واٰتو ھم من مال اللہ الذی آتاکم. (النور: ٣٣)

اور ان کو اللہ کے اس مال سے دو جو تم کو دیا ہے۔

ولا یحسبن الذین یبخلون بما اتاهم الله من فضله هو خیرا لهم بل هو شرلهم سیطوقون مابخلوابه یوم القیمة. (آلِ عمران: ۱۸۰)

اور نہ سمجھیں جو لوگ بخل کرتے ہیں ایک چیز پر کہ اللہ نے ان کو دی ہے اپنے فضل سے، کہ بہتر ہے ان کے حق میں بلکہ یہ برا ہے ان کے واسطے، آگے قیامت کے دن، ان کے گلے طوق پڑے گا جس پر بخل کیا تھا۔

وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیه. (الحدید: ۷)

اور جو کچھ تمہارے ہاتھ میں دیا اپنا نائب کر کے اس سے خرچ کرو۔

مالکِ حقیقی ہر مال کا اللہ ہے اور انسان کو اللہ نے بطورِ نیابت اس میں تصرف کا اختیار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ تصرف اجازت دینے والے کی مرضی کے مطابق ہونا چاہئے جیسے کسی کو اپنا نائب اور وکیل بنادے تو وکیل اور نائب اپنے مؤکل کی مرضی کے مطابق اس کے مال میں تصرف کرے گا اور اس کی اجازت سے کرے گا اور اپنی مرضی سے کوئی تصرف نہیں کرسکتا۔

امام رازیؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

فقراء عیالِ خداہیں اوراغنیاء اللہ کی جانب سے مال کے رکھوالے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ مالک کا حکم ہے کہ اس کے خزانے کے رکھوالے اس مال کو محتاجوں میں تقسیم کریں۔ التفسیر الکبیر (۱۰۳/۱۶)

ابن العربیؒ فرماتے ہیں:

اللہ سبحانہ نے اپنی حکمت بالغہ سے اپنی نعمت کے طور پر اپنے بندوں کو مال عطا فرمایا اور اس کے شکر کا یہ طریقہ مقرر فرمایا کہ صاحب مال، مال میں سے کچھ

حصہ اللہ سبحانہ کی نیابت کے طور پر ان لوگوں کو دے جن کے پاس مال نہیں ہے کیونکہ اللہ سبحانہ نے تمام انسانوں سے رزق کا وعدہ فرمایا ہے۔ احکام القرآن (۹۴۵)

اگر غنی بخل اختیار کرے اور اللہ کے دئے ہوئے مال میں سے اللہ کے بندوں کو نہ دے تو اللہ کی ناراضگی کا باعث ہوگا۔

مال کے اللہ کی ملکیت ہونے کا تصور مسلمانوں میں خوب اچھی طرح راسخ رہا ہے اور اس تصور کو تو اتر کا درجہ حاصل ہے یہاں تک مانگنے والے فقراء بھی اللہ کا مال کہہ کر مانگتے ہیں۔ ایک حدیث ہے:

روزِ قیامت اغنیاء پر فقراء کی جانب سے بربادی ہوگی وہ کہیں گے کہ اے خدا انہوں نے ہمیں ان حقوق سے محروم رکھا ہے جو تو نے ان پر فرض کئے تھے، اللہ سبحانہ فرمائے گا کہ میری عزت و جلال کی قسم میں تمہیں اپنے سے قریب کرتا ہوں اور انہیں دور کرتا ہوں۔ رواہ الطبرانی عن انس ؓ بسند ضعیف

قال اللہ تعالیٰ: وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیه

(سورة الحدید:۷)

قال الامام القرطبی فی احکام القرآن له (۲۲۳۸/۱۷) دلیل علی ان اصل الملک لله سبحانه وان العبد لیس له فیه الا التصرف الذی یرضی الله ....الی ان قال وهذا یدل علی انها لیست باموالکم فی الحقیقة وما انتم فیها الا بمنزلة النواب والوکلاء فاغتنموا الفرصة فیها قبل ان تزال عنکم الی من بعدکم .

افراد اور معاشرے کے درمیان کفالت باہمی

قدیم فلاسفہ اجتماعیات کہتے ہیں کہ انسان مدنی الطبع ہے اور جدید ماہرین اجتماعیات نے کہا ہے کہ انسان حیوان اجتماع ہے یعنی انسان بغیر اجتماع کے حقیقی زندگی نہیں گزار سکتا بلکہ ہر فرد معاشرے کا مقروض ہوتا ہے، یہاں تک کہ انسان پیدائش کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا جب تک اسے معاشرہ کی اعانت اور تعاون حاصل نہ ہو، معاشرے سے انسان کو بے حساب فوائد، فضائل اور معارف حاصل ہوتے ہیں، انسان گفتگو معاشرے سے سیکھتا ہے، عادات رسم ورواج سماج سے حاصل کرتا ہے اور تہذیب و ثقافت، تمدن وحضارت اور قواعد مذہب اور اصول ہائے معاملات معاشرے سے سیکھتا ہے۔

اگر معاشرہ نہ ہوتا تو فرد گونگا اور بہرہ جانور ہوتا اور اسے دنیا کے امور کی کوئی واقفیت نہ ہوتی، وہ اس بچہ کی طرح ہوتا جسے اچھے برے کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا، یہ معاشرہ ہے جو ہر فرد کے وجود کو سنوارتا اور اسے زندگی کی کیفیات سے ہم آہنگ کرتا ہے اور اسے عقائد و روایات اور لغت و ثقافت کی میراث سے روشناس کراتا ہے۔ فرد کو جہاں معاشرے سے معنوی فوائد اور تہذیبی منافع حاصل ہوتے ہیں وہاں اسے امدادی اور اقتصادی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں بلکہ فرد جو بھی مکاسب حاصل کرتا ہے اس میں معاشرے کے دیگر افراد اس کے شریک ہوتے ہیں اور پورے معاشرے کے تعاون سے فرد کی معاشی جدوجہد بارآور ہوتی ہے۔

ایک کسان جب اپنے کھیت سے غلہ حاصل کرتا ہے تو پورے معاشرے کا تعاون حاصل ہوتا ہے، معاشرے نے اس کے کھیت کے لئے نہریں نکالیں، پانی کے

راستے بنائے، پانی کی بہم رسانی کا بندوبست کیا، اس کے لئے آلات زراعت ایجاد کئے اور اس کے لئے لباس وغذا اور رہائش فراہم کی اور اسے امن کا وہ ماحول دیا جس میں وہ اپنی توجہات اپنی کشاورزی پر مرکوز کر سکے۔

تاجر کا مال جمع کرنا اور تجارت کرنا سراسر معاشرے پر موقوف ہے اور بغیر اس ساجی تعاون کے وہ تجارت نہیں کر سکتا، غرض کسی بھی پیشہ سے منسلک فرد ہو اور کسی بھی ذریعہ سے روزی کمانے والا انسان ہو اس کو ساجی تعاون لامحالہ درکار ہے اور جس قدر مالکِ مال کا مال زیادہ ہوگا، ساجی تعاون میں اسی مقدار سے اضافہ ہوتا چلا جائے گا، اور اسی مقدار سے فرد کی جدوجہد اور اس کی کوششوں کا دائرہ محدود ہوتا جائے گا، ایک بہت وسیع و عریض فارم ہو، ایک بڑا کارخانہ ہو اور ایک بہت بڑا ادارہ ہو، اس میں بہت سے افراد شریک ہوتے ہیں اور سیکڑوں اور ہزاروں افراد اس میں اپنی جسمانی محنتیں، اپنی فکری صلاحیتیں اور اپنی ذہنی قوتیں کھپاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو مال فرد کو ملتا ہے اور جسے وہ اپنی تجوریوں میں جمع کرتا ہے وہ دراصل جماعت کا مال ہے کہ اجتماعی جدوجہد ہی نے اس مال کو وجود بخشا ہے، اسی لئے قرآن کریم نے جماعت مسلمین کو مخاطب کر کے فرمایا ہے۔

ولا تؤتوا السفهاء اموالكم التى جعل الله لكم قياما. (النساء : ۵)

اور بے عقلوں کو اپنے وہ مال مت دو جو اللہ نے تمہاری گزران کا ذریعہ بنائے ہیں۔

اس آیت سے فقہاء نے سفہاء پر اور مبذرین اور مال کے تلف کرنے والوں پر حجر (پابندی) لگانے کا حکم مستنبط کیا ہے حالانکہ بظاہر مال کے مالک وہی

ہیں لیکن چونکہ درحقیقت مال جماعت کا ہے،اگر مال کا مالک اس مال کو نشوونما دیتا ہے اوراس کی حفاظت کرتا ہے تواس کے فوائد معاشرے کو پہنچیں گے،اور اگر مال تلف کرتا ہے اور ضائع کرتا ہے تو اس کے نقصانات بھی معاشرے کو پہنچیں گے۔ چنانچہ آیت میں ان کے مال نہیں بلکہ "تمہارے مال" کہا،اوراسی طرح لھم قیاماً نہیں، بلکہ لکم قیاماً فرمایا ہے کہ مال سے قیام فردو مالک کا نہیں بلکہ پوری جماعت کا قیام ہے۔اسی طرح فرمایا:

یاایھاالذین آمنوا لاتاکلوآ اموالکم بینکم بالباطل الاان تکون تجارۃ عن تراض منکم ولا تقتلوا انفسکم ان اللہ کان بکم رحیما (النساء: ۲۹)

اے ایمان والو! ایک دوسرے کے اموال آپس میں ناحق طریقہ سے مت کھاؤ،مگر یہ کہ آپس کی خوشی سے سودا ہوا ہواورآپس میں خون نہ کرو، اللہ کوتم پر رحم ہے۔

اس آیت میں مؤمنوں کو اس بات سے ممانعت کی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے کا مال کھائیں،جس طرح انہیں اس بات سے ممانعت کی گئی کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کریں اور دونوں مقامات پر اموالکم ،اورانفسکم ، کی تعبیر اختیار کی گئی تاکہ معلوم ہو کہ مال سب کا ہے اوراسی طرح ایک کی جان سب کی جانوں کے مساوی ہے۔

یعنی امت مسلمہ جان اور مال دونوں میں متکافل اورمتضامن ہے اوراس امت کے افراد حقوق ومصالح اور جان ومال میں ایک دوسرے کی کفالت کرتے اور

معاون بنتے ہیں،جس نے کسی کا مال کھایااس نے گویا پورے معاشرے کا مال کھایااور جس نے کسی نفس پر تعدی کی اس نے گویا پوری جماعت کے نفوس پر تعدی کی۔

من قتل نفسا بغیر نفس اوفساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا ومن احیاھا فکانما احیاالناس جمیعا(المائدہ: ۳۲)

جوکوئی ایک جان بغیرجان کے یا زمین میں بغیرفساد برپا کرنے کے مار ڈالے،تو گویااسنے سب لوگوں کومارڈالااور جس نے ایک جان کوزندہ کیاتو گویاسب لوگوں کوزندہ کیا۔

قرآن کریم کا اعجاز دیکھئے کس قدر مختصر الفاظ میں کتنی بڑی حقیقت آشکارا کردی ہے اور کتنے بڑے اصول کومختصر سی تعبیر کے ساتھ بیان فرمایا ہے،جس طرح سورۃ نساء میں فرمایا ہے کہ"تم سب اپنے مال کو باطل طریقوں سے نہ کھاؤ" کہ ایک فرد کامال پورے معاشرے کامال ہے اور پورا مسلم معاشرہ باہم پیوست،متضامن اور مبنی براخوت معاشرہ ہے۔

سیدرشیدرضامصری فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں مال کی اضافت پورے معاشرے کی جانب کرکے"مالکم" کہا گیا ہے اور یہ وہ اصول ہے جس کی جانب رسائی حاصل کرنے کی اشتراکیوں نے سعی کی ہے مگر انہیں مبنی بر انصاف راہ نہ مل سکی،اگروہ اسلام کو اختیار کرتے تو انہیں معلوم ہوجاتا کہ اسلام نے فرد کی ملکیت اوراس کے مال کواپنی تحویل میں رکھنے کے حق کا احترام بھی کیاہے اور ہر فرد کے مال کوامت کا مال بھی قرار دیاہے اور وہ اس طرح کہ اسلام نے مال کثیر رکھنے والے

افراد پر مصالح عامہ کے حامل بہت سے حقوق عائد کئے ہیں اور مال قلیل رکھنے والوں پر بھی کچھ حقوق عائد کئے ہیں تا کہ امت اور تمام انسانیت اضطراری حالات سے نکل سکے اوران حقوق کے علاوہ اسلام نے ہر مالدار شخص کو بر واحسان، صدقات اور خیرات پر آمادہ کیا ہے۔ تفسیر المنار (۵/۳۹)

بہر حال فرد کے مال میں اجتماعی حق لازم ہے مگر اس حق سے اس کی ملکیت ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کا کچھ حصہ مصالح عامہ کیلئے لیا جاتا ہے اور اگر ضرورت ہوتو مقرر حقوق سے بھی زیادہ لے لیا جاتا ہے، معاشرے کی نائب ریاست یہ حق لے کر معاشرے کے مستحق افراد پر صرف کرتی ہے، معاشرے کی حفاظت کرتی ہے اور اس سے بغاوت اور عدوان کو دور کرتی ہے۔

اگر کسی مسلم معاشرے میں مستحق افراد (فقراء) نہ ہوں تب بھی مسلمانوں پر فرض ہے کہ زکوۃ دیں تا کہ ان کی یہ زکوۃ ذخیرہ ہوتی جائے اور فی سبیل اللہ کی مد میں صرف ہوتی رہے کیونکہ جب تک مسلمان موجود ہیں یہ مصرف لامحالہ باقی رہے گا۔

اخوت باہمی

اخوت کے معنی بڑے گہرے اور وسیع ہیں اور کفالت باہم کے مفہوم سے زیادہ وسعت رکھتے ہیں، کہ اخوت میں یہ ضروری نہیں ہے کہ منفعتوں کا تبادلہ ہو اور کچھ لیکر دیا جائے بلکہ جذبۂ اخوت خالص انسانی اور روحانی جذبہ ہے جو انسان کے اندر سے ابھرتا ہے اور انسان اپنے بھائی کے لئے وہ پسند کرتا ہے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے بلکہ اپنے بھائی کو اپنے اوپر ترجیح دیتا ہے۔

اسلام میں اخوت کی دو بنیادیں ہیں،ایک اشتراک انسانیت اور دوسری اشتراک عقیدہ۔ انسانوں کی زبانوں اوران کے رنگ ونسل کے اختلاف کے باوجود تمام انسان ایک ہیں اور ایک باپ کی اولاد ہیں،اسی لئے قرآن نے کہا یابنی آدم قرآن کریم میں یہ الفاظ پانچ مرتبہ آئے ہیں،چار بارسورۃ الاعراف میں اورایک بارسورۃ یسین میں،اور اسی طرح فرمایا یاایھا الناس اور ارشادفرمایا۔

یاایھاالناس اتقواربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا زوجھا وبث منھما رجالا کثیرا ونساء واتقوا اللہ الذی تسآء لون بہ والارحام ان اللہ علیکم رقیبا ٥(النساء : ١)

اے لوگواپنے اس رب سے ڈروجس نے تم کوایک نفس سے پیدا کیااوراس سے اس کاجوڑا پیدا کیااوران دونوں سے بہت سے مرداورعورتیں پیدا کیں اوراس اللہ سے ڈروجس کاتم آپس میں واسطہ دیتے ہو،اللہ تم پر مطلع ہے۔

یا ایھا الناس کے بعد ارحام کا لفظ بڑی معنویت کا حامل ہے یعنی یہاں پر یہ یاد دلانا مقصود ہے کہ بنی نوع انسان تمام ایک ہی آدم کی اولاد ہیں اور ان سب کے درمیان انسانیت کی عمومی قرابت موجود ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس اخوت کی تائیدو توثیق کرتے ہوئے فرمایا کہ سب اللہ کے بندے اور بھائی بھائی ہوجاؤ۔(احمدوابوداؤد)

یہی نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانی اخوت کے تصور کو عقیدہ ایمانی کے طور پر بیان فرمایا کہ:

اے اللہ اے ہر شئی کے رب ومالک میں گواہی دیتا ہوں کہ تمام بندے

بھائی بھائی ہیں۔(احمد و ابوداؤد)

اس عالمگیر انسانی اخوت کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ کوئی انسان دوسرے انسانوں کو محروم کر کے خیر ونعمت کو صرف اپنے قبضہ میں نہ رکھے بلکہ ہر نعمت الٰہی میں اللہ کے بندوں کو شریک کرے۔

عالمگیر انسانیت سے زیادہ مضبوط اورزیادہ تاثیر کی حامل اخوت عقیدہ اسلامی کی اخوت ہے جونسب اور خون کے رشتوں سے زیادہ مضبوط تعلق ہے اوراس سے روح کا تعلق قائم ہوتاہے،اسی لئے فرمایا۔

''مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں،،(الحجرات:۱۰)

اس اسلامی اخوت اور رشتہ ایمان کا بھی تقاضا یہی ہے کہ مسلمان باہم اجتماعی معاشی معاونت کریں اور عملی طور پر آپس میں تعاون کریں اور تمام مؤمنین ایک ہی دارالاسلام میں رہیں کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں پورادارالاسلام ان کا وطن ہے اوراس دارالاسلام کے باشندے اس کا معاشرہ ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کی اس اخوت کو بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے کہ مؤمن آپس میں بنیادکی طرح ہیں جس کا ہر پتھر دوسرے کی مضبوطی کاباعث ہے۔(بخاری ومسلم)

باہمی محبت اور مودت میں مؤمنون کی مثال جسد واحد کی طرح ہے کہ اگر جسم کے کسی حصے میں کوئی تکلیف ہوتو جسم کے تمام اعضاء درداور تکلیف محسوس کرتے ہیں(بخاری ومسلم)

۔ مسلمان،مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرتا ہے،اور نہ اس پر ظلم ہونے

دیتا ہے (بخاری)

وہ شخص مؤمن نہیں ہے جس کا پیٹ بھرا ہوا ہو اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو اور اسے معلوم ہو کہ وہ بھوکا ہے، (الطبرانی)

مسلم معاشرہ ایک بنیان مرصوص ہے، ایک خاندان ہے بلکہ ایک جسم کی طرح ہے، جس کے ایک حصہ کی تکلیف سے پورا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے، اس مسلم معاشرہ میں اگر کوئی کام کی قدرت نہ رکھے یا اپنی ضرورت کے بقدر نہ کما سکے یا وہ آفات زمانہ کا شکار ہو جائے یا کسی بھی طرح محتاج ہو اور ضرورت مند ہو جائے تو پورے معاشرے پر اس کی اعانت اور مدد فرض ہے اور اس کو سہارا دے کر اس قابل بنانا لازم ہے کہ وہ معاشرے میں سر اٹھا کر چلے اور اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ مل کر باعزت طریقے پر رہے۔

مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ فرضیت زکوۃ کی نظری اساس ٹیکس کے تصور سے بہت بے حد جامع اور زیادہ دائمی ہے، اگرچہ باہمی کفالت کے تصور میں زکوۃ اور ٹیکس میں اشتراک موجود ہے لیکن بعد میں بیان کردہ ہر سہ تصورات میں زکوۃ منفرد اور ٹیکس سے ممتاز ہے۔

فقه الزكوة للدكتور يوسف القرضاوي (۱۲۱/۲)

چند مزید فرق

زکوۃ اور ٹیکس کے درمیان مذکورہ دس فرق بنیادی اور بڑے فرق ہیں، ان کے علاوہ بھی بہت سے فرق پائے جاتے ہیں، شہیدِ اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ نے "اسلام کا قانون زکوۃ وعشر" (ص ۶۰-۶۳) میں مختصر

الفاظ میں ٹیکس اور زکوۃ کے درمیان سولہ فرق بیان فرمائے ہیں، یہاں انہیں بالفاظہ نقل کیا جارہا ہے۔

۱۔۔۔زکوۃ خدا تعالیٰ کا نازل کردہ فریضہ ہے جو بندوں پر فریضہ عبادت کی حیثیت سے فرض کیا گیا ہے۔

۲۔۔۔زکوۃ ابتدائے نزول سے لے کر آج تک اعلیٰ ترین عبادت کا تصور اپنے اندر رکھتی ہے۔

۳۔۔۔فرضیت زکوۃ کا ہدف اصلی خدا تعالیٰ کی رضا طلبی اور آخرت کی سر خروئی ہے۔

۴۔۔۔زکوۃ صرف اہل ایمان پر فرض کی گئی ہے۔

۵۔۔۔زکوۃ میں مال کی پاکیزگی کا تصور ہمہ وقت سامنے رکھا گیا ہے۔یعنی زکوۃ صرف مالِ حلال پر فرض ہے،کسبِ حرام سے زکوۃ ادا کرنے کے کوئی معنی نہیں۔

۶۔۔۔زکوۃ میں یہ ضمانت دی گئی ہے کہ زکوۃ ادا کرنے والے کے مال میں برکت ہوگی،حق تعالیٰ اس کی حفاظت فرمائیں گے اور اس کا مال پاک ہوجائیگا، جیسا کہ قرآن وحدیث کے نصوص اس پر شاہد ہیں۔

۷۔۔۔زکوۃ ادا نہ کرنے پر حق تعالیٰ کی ناراضگی،آخرت کی ذلت اور رسوائی اور جہنم کے عذاب کی خبر دی گئی ہے۔

۸۔۔۔زکوۃ صرف اس مال پر لی جاتی ہے جس میں نمو کی صلاحیت ہو،یعنی نقدی،مالِ تجارت اور مویشی جو نسل کشی کے لئے ہوں،اس لئے زرعی،صنعتی اور حرفت کے آلات جو تجارت کے لئے نہ ہوں بلکہ استعمال کے لئے ہوں ان پر زکوۃ نہیں لی

جاتی۔

۹۔۔۔زکوٰۃ اس شرط کے ساتھ عائد ہوتی ہے کہ اس پر سال گزر جائے، گویا سال میں دو دفعہ زکوٰۃ نہیں۔

۱۰۔۔۔زکوٰۃ صرف اسی مال پر فرض ہے ہوتی ہے جو قرض اور حاجات اصلیہ سے زائد ہو، فرض کیجئے کہ ایک شخص کے پاس ہزار روپیہ ہے اور سال بھر کے اخراجات کے بعد بھی اس کے پاس اتنی مالیت بچ رہتی ہے لیکن وہ پانچ صد روپیہ کا مقروض ہے تو اس پر پانچ صد روپے کی زکوٰۃ فرض ہوگی۔

۱۱۔۔۔زکوٰۃ جن اموال پر فرض کی گئی ہے ان کی فہرست محدود ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک دفعہ گدھے اور خچر کی زکوٰۃ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صاف فرمادیا کہ ان کے بارے میں مجھ پر کچھ نازل نہیں کیا گیا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اموال زکوٰۃ کی معین فہرست خدا تعالیٰ کی نازل فرمودہ ہے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اجتہاد کا بھی دخل نہیں، کسی دوسرے کی تو بات ہی کیا ہے۔

۱۲۔۔۔زکوٰۃ خاص مالیت اور خاص نصاب پر فرض ہوتی ہے جو کسی کے اجتہاد کا نتیجہ نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی جانب سے نازل فرمودہ ہیں جیسا کہ احادیث صحیحہ میں اس کی تصریح فرمائی گئی ہے۔

۱۳۔۔۔زکوٰۃ اپنی معین مقدار رکھتی ہے، جو حسب تصریح احادیث منزل من اللہ ہے اور چودہ صدیوں تک اس کا محفوظ رہنا اس کی بجائے خود ایسی دلیل ہے جس کے جھٹلانے والے پر دماغی توازن کھو بیٹھنے کا شبہ ہوتا ہے۔

۱۴۔۔۔زکوۃ چونکہ اپنے نصاب،اپنے تشخص اوردائرہ نفاذ کے لحاظ سے منزل من اللہ ہے،اس لئے کسی حاکم،امام،خلیفہ بلکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اس کے کل یا بعض کے معاف اور ساقط کردینے کا اختیار نہیں دیا گیا۔

۱۵۔۔۔زکوۃ کا مصرف مسلمان حاجت مند ہوسکتا ہے،اس لئے نہ وہ غیر مسلم پر خرچ کی جاسکتی ہے،نہ کسی غیر حاجت مند مسلمان کا اس میں کوئی حق ہے۔

۱۶۔۔۔زکوۃ دینے والا زکوۃ سے نہ خود منتفع ہوسکتا ہے نہ اس کے خاص متعلقین جن کے ساتھ اس کے منافع مشترک ہیں، بلکہ زکوۃ دے کر اگر فقیر سے شکریہ کی توقع رکھے تو اجر باطل ہوجاتا ہے۔

ٹیکس

۱۔۔۔ٹیکس انسانی ذہن کی ایجاد ہے جو اسلام سے پہلے بھی اور بعد از اسلام بھی غیر مسلم سلاطین اور حکام کی جانب سے نافذ کیا جاتا رہا۔

۲۔۔۔اور ٹیکس میں عبادت کا ادنی تصور بھی کسی ملک اور کسی قوم نے کسی زمانہ میں کبھی پیش نہیں کیا۔

۳۔۔۔اور ٹیکس میں رضائے خداوندی اور فلاحِ آخرت کے سوال کا دور دور تک بھی کہیں پتہ نہیں ملتا، اس کا وجود دنیا اور صرف دنیا میں گم ہوکر رہ جاتا ہے۔

۴۔۔۔اور ٹیکس میں کسی مذہب وملت کی تمیز نہ کبھی کی گئی، نہ اب کی جاتی ہے۔

۵۔۔۔اور ٹیکس میں یہ تصور سرے سے مفقود ہے،اسے حلال وحرام کی بحث سے کوئی سروکار نہیں،وہ ہر خبیث اور طیب پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔

۶۔۔۔اور ٹیکس برکت، حفاظت، اور مال کی صفائی کی ضمانت کا بوجھ اٹھانے سے قطعاً عاری ہے، برکت اور حفاظتِ خداوندی اس کی لغت سے خارج ہیں۔

۷۔۔۔اور ٹیکس ان لوگوں کی طرف سے بھی جو خدا اور آخرت کے قائل ہی نہیں اسی طرح عائد کیا جاتا ہے جس طرح قائلین کی جانب سے، جس سے واضح ہوجاتا ہے کہ ٹیکس میں خدا خوفی اور فکرِ آخرت کا کوئی جذبہ کارفرما نہیں۔

۸۔۔۔اور ٹیکس اس تفتیش میں مبتلا نہیں ہوتا، اس لئے بھاری قسم کے ٹیکس صرف آلاتِ استعمال پر لگائے جاتے ہیں۔

۹۔۔۔اور ٹیکس اس شرط سے آزاد ہے، بہت سے ٹیکس ایک ہی چیز پر سال میں کئی کئی دفعہ بھی وصول کئے جاسکتے ہیں۔

۱۰۔۔۔اور ٹیکس کو اس امر کی کوئی پرواہ نہیں کہ یہ مال اس کی ضروریات اصلیہ سے زائد بھی ہے یا نہیں؟ اور اس شخص کے ذمہ کچھ قرض تو نہیں؟ وہ اس تمام بحث میں پڑے بغیر کل آمدنی (منافع) پر نافذ ہوجائے گا۔

۱۱۔۔۔ٹیکس اپنے دائرۂ اختیار کی حد بندی کا قائل نہیں، وہ صرف اموال پر نہیں بلکہ ذوات پر بھی عائد ہوسکتا ہے اور شادی ٹیکس، چولہا ٹیکس، پیدائش ٹیکس تک پھیل جاتا ہے اور اگر کسی شہر میں داخلے کا اتفاق ہوجائے یا کسی دریا کے مصنوعی پل کو عبور کرنے کی نوبت آجائے ''آدمی ٹیکس'' سے ''مرغی ٹیکس'' تک اس کی حدود وسیع ہوجاتی ہیں، الغرض وہ اپنی طویل وعریض فہرست میں ہمہ وقت مزید در مزید اضافہ کا خواستگار رہتا ہے۔

۱۲۔۔۔ٹیکس اس پابندی کا بھی قائل نہیں، وہ نصاب کی تعیین میں خدا کا

محتاج نہیں بلکہ جتنی مالیت پر اس کا جی چاہے وہ نافذ ہوسکتا ہے،آپ اپنے عزیز کے لئے ایک سیر کی شہر میں لے جائیں تو اس پر بھی ٹیکس حق طلبی کا دعوی کرسکتا ہے۔

۱۳۔۔۔ٹیکس اس قید سے آزاد ہے وہ ہر سال چھ مہینے بعد نئے اضافوں کی شکل میں اضعافاً مضاعفۃً بڑھتا رہتا ہے۔

۱۴۔۔۔ٹیکس ارباب اقتدار کے دائرۂ اختیار کی چیز ہے،اس لئے وہ اسے کلاً یا جزءاً ساقط کردینے میں بااختیار ہیں کیونکہ وہ کسی مرحلہ میں بھی وحی الٰہی کا پابند نہیں (اور ماتحت افسران کا رشوت وغیرہ لے کر کم اندراج کرنا تو ایک عام بات ہے۔

۱۵۔۔۔ٹیکس امیر،غریب،مسلم،غیر مسلم سب کے مفاد پر خرچ کیا جاتا ہے۔

۱۶۔۔۔ٹیکس کے منافع میں ٹیکس دینے والا بھی بدستور شریک رہتا ہے بلکہ صحیح لفظوں میں ہر شخص کی طرف سے ٹیکس کی ادائیگی صرف ان اجتماعی فوائد کے حصول کے لئے ہوتی ہے،جو اس کی طرف عائد ہوتے ہیں،یا ارباب اقتدار کی جانب سے ان کا یقین دلایا جاتا ہے۔

ٹیکس اور زکوۃ کے درمیان موافقت کے چند پہلو

ٹیکس اور زکوۃ کے درمیان کچھ امور میں اشتراک اور موافقت بھی پائی جاتی ہے،جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

(۱)زکوۃ بھی ایک مالی فریضہ ہے اور ٹیکس بھی ایک مالی فریضہ ہے۔

(۲)جبر و لزوم کا عنصر دونوں میں موجود ہے یعنی اموال ظاہرہ کی زکوۃ مسلمانوں پر جبراً فرض ہے،چنانچہ اگر کوئی مسلمان اموال ظاہرہ کی زکوۃ اپنے جذبہ

ایمانی سے ادا نہ کرے تو خلیفہ وقت اس سے جبراً زکوۃ وصول کرے گا، نہ دینے والے اور انکار کرنے والے سے بذریعہ طاقت لے گا اور اگروہ طاقتور گروہ ہو تو ان سے جنگ بھی کرسکتا ہے۔

(۳) ٹیکس مقامی اداروں، حکومتی محکموں اور بااختیار بینکوں کو ادا کیا جاتا ہے اسی طرح اموال ظاہرہ کی زکوۃ بھی قرآن کریم کی رو سے عاملین علیہا کے توسط سے حکومت ہی کو دی جاتی ہے۔

(۴) ٹیکس دہندہ (Tax Giver) اپنے ٹیکس کے عوض براہِ راست کسی قسم کا فائدہ حاصل نہیں کرتا، اسی طرح زکوۃ دہندہ بھی جس کو زکوۃ دیتا ہے اس سے کسی قسم کا فائدہ اور خدمت نہیں لے سکتا ہے بلکہ صرف اللہ کی رضا کیلئے زکوۃ دیتا ہے اوراس کا ثواب آخرت میں ملتا ہے۔

(۵) ٹیکس کے موجودہ نظام میں کچھ اجتماعی، اقتصادی اورسیاسی اہداف بیان کئے جاتے ہیں، اسی طرح زکوۃ کے بھی اعلیٰ ترین اور وسیع ترین مقاصد واہداف ہیں جواجتماعی، اقتصادی اورسیاسی پہلوؤں کو بھی مشتمل ہیں اوران کے علاوہ انسانی زندگی کے دیگر پہلوؤں کو بھی محیط ہیں اور بڑی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

افسوس ناک نتیجہ

زکوۃ اور ٹیکس کے درمیان مذکورہ چند امور میں جزوی موافقت اور اشتراک سے بعض لوگوں نے یہ افسوس ناک نتیجہ اخذ کرلیا ہے کہ زکوۃ بھی عام دنیاوی ٹیکسوں کی طرح ایک ٹیکس ہے لیکن یہ نتیجہ جس قدر افسوس ناک اور خطرناک ہے اس قدر

باعث تعجب اور جہل مرکب پر مبنی ہے کیونکہ کوئی بھی دو چیزیں لے لی جائیں ان میں بعض اعتبار سے کچھ نہ کچھ موافقت ہوتی ہی ہے حتی کہ نقیضین میں بھی جزوی موافقت پائی جاتی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ کبھی اخذ نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے یا وہ دونوں ایک ہیں، اگر جزوی موافقت کا اعتبار کیا جائے تو زکوۃ اور نماز میں بھی موافقت موجود ہے، چنانچہ دونوں عبادت ہیں، دونوں اہم اسلامی ارکان ہیں لہذا دونوں کوایک فرض کہہ دینا چاہیے، انسان اور حیوان میں بھی موافقت موجود ہے کہ دونوں اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، دونوں جاندار ہیں، دونوں حساس متحرک بالارادہ ہیں۔

ہم پہلے زکوۃ اور ٹیکس کے درمیان کئی وجوہ فرق بیان کر چکے ہیں جو بالکل کلی اور دائمی فرق ہیں جبکہ ان کے مقابلے میں مذکورہ موافقت بھی جزوی اور انتہائی کم امور میں ہے۔

زکوۃ کو ٹیکس کہنے کی حیثیت قرآن کی روشنی میں

قرآن مجید کی کسی آیت، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی ارشاد، اسلامی تاریخ کی چودہ صدیوں میں کسی صحابیؓ، کسی تابعی، کسی امام، کسی مجتہد، کسی فقیہ، اور کسی معتبر عالم کے فتوی میں یہ کہیں نہیں ملتا کہ زکوۃ بھی عام ٹیکسوں کی طرح ٹیکس ہے بلکہ اس کے برعکس قرآن وسنت سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ زکوۃ کو ٹیکس کہنا جاہلوں، منافقوں کافروں اور بددین لوگوں کا خیال ہے، نیز یہ بہت بڑی جسارت اور سخت گناہ ہے، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے ایسے لوگوں کے خلاف باقاعدہ جہاد کیا ہے، قرآن وسنت میں اس بارے جو کچھ وارد ہوا ہے اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

منافقانہ عمل

زکوۃ کو ٹیکس سمجھنا قرآن کریم کی رو سے منافقانہ عمل ہے، عہدِ نبوی میں ایک منافق نے زکوۃ کو ایک ٹیکس کہہ کر زکوۃ کی ادائیگی سے پہلو تہی کی تھی۔

قال اللہ تعالیٰ: ومنهم من عاهدالله لئن اتانا من فضله لنصدقن ولنكونن من الصلحين ٥فلما اتهم من فضله بخلوبه وتولوا وهم معرضون ٥فاعقبهم نفاقا فى قلوبهم الى يوم يلقونه بما اخلفوا الله ماوعدوه وبما كانوا يكذبون٥الم يعلموا ان الله يعلم سرهم ونجوهم وان الله علام الغيوب٥(سورة التوبہ: ۷۵۔۷۸)

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بحوالہ ابن جریر وابن ابی حاتمؒ حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے اس آیت کا سبب نزول ایک منافق کا زکوۃ کو ٹیکس کہہ کر زکوۃ ادا نہ کرنا لکھا ہے، اس کی مکمل تفصیل تفسیر ابن کثیر (۴۱۶/۲) میں دیکھی جاسکتی ہے، البتہ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ایک منافق ثعلبہ بن حاطب انصاری نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ دعا کروائی کہ میرا مال زیادہ ہوجائے، اس نے شدید اصرار کیا اور کہا کہ اگر آپ نے میرے لئے دعا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے مجھے مال دیا تو میں اس میں سے ہر حق ادا کروں گا۔ آپ نے دعا فرمائی تو اس نے ایک بکری خریدی، اس میں اضافہ ہوتا گیا حتیٰ کہ مدینہ شہر میں جگہ تنگ پڑگئی، وہ کسی گاؤں چلا گیا اور اسی رفتار سے نمازوں میں سستی کرتا گیا، صرف ظہر اور عصر کی نماز باجماعت میں شریک ہوتا تھا، باقی میں نہیں، پھر صرف جمعہ میں آتا، باقی کو چھوڑ دیا، بکریوں میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا، حتیٰ کہ اس نے جمعہ بھی چھوڑ

دیا، جب یہ آیت:

خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها .

نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرے اموال والوں کی طرح ثعلبہ کے پاس بھی دو آدمی زکوۃ وصول کرنے کیلئے بھیجے، انہوں نے اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط دیا جب اس کے سامنے پڑھا گیا تو اس نے کہا۔

ماهذه الا جزية،ماهذه الا اخت الجزية .

یعنی زکوۃ تو جزیہ ہے، زکوۃ جزیہ کی ہی نظیر ہے چونکہ یہ ٹیکس ہے لہٰذا میں غور کروں گا، آئندہ آجائیں، جب وہ حضرات پھر اس کے پاس گئے تو اس نے یہی بات دھرائی کہ یہ ایک ٹیکس ہے اور ٹال مٹول سے کام لیا، اس پر مذکورہ آیات نازل ہوئیں، جب اسے معلوم ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آکر زکوۃ دینا چاہی لیکن آپ نے قبول نہ فرمائی، آپ علیہ السلام کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں بھی وہ زکوۃ لاتا رہا لیکن انہوں نے قبول نہ کی، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں بھی لایا لیکن آپ نے قبول نہ کی حتی کہ آپ کے دورِ خلافت میں ثعلبہ فوت ہوا۔

اس کا منشا سخت ترین کفر ونفاق اور جہالت ہے

قرآن کریم میں زکوۃ سمیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کئے جانے والے تمام صدقات کو ٹیکس، جزیہ، تاوان اور جرمانہ قرار دینے کے عمل کو شدید ترین کفر ونفاق اور احکام الٰہیہ سے جہالت اور ناواقفی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

قال الله تعالیٰ:الاعراب اشد كفرا ونفاقا واجدر ان لا

یعلمواحدود ما انزل الله علی رسوله والله علیم حکیم ومن الاعراب من
یتخذ ماینفق مغرما ویتربص بکم الدوائر (سورة التوبه: ۹۷،۹۸)

ترجمہ:ان منافقین میں دیہاتی لوگ کفر ونفاق میں بہت سخت ہیں اور ان کو ایساہوناہی چاہئے کہ ان کو ان احکام کا علم نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمائے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں اور ان مذکورہ منافقین دیہاتیوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ جووہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں (جیسے زکوۃ وغیرہ) اس کو جرمانہ اور تاوان سمجھتے ہیں اور تم مسلمانوں کے بارے گردشوں اور مصائب کے منتظر رہتے ہیں۔

زکوۃ کوٹیکس کہنا عذاب الٰہی کا سبب ہے

فی مشکوۃ المصابیح(۴۷۰/۲) کتاب الفتن،باب اشراط الساعة، عن ابی هریرة رضی الله تعالیٰ عنه قال:قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم:اذا اتخذ الفئی دولا والا مانة مغنما والزکوة مغرما وتعلم لغیرالدین واطاع الرجل امرأته وعق امه وادنی صدیقه واقصی اباه وظهرت الا صوات فی المساجد،وسادالقبیلة فاسقهم وکان زعیم القوم ارذلهم واکرم الرجل مخافة شره،وظهرت القینات والمعازف وشرب الخمورولعن اخرهذه الا مة اولها فلیرتقبوا عند ذلک ریحا حمراء وزلزلة،وخسفا ومسخا وقذفا،وآیات تتابع کنظام قطع سلکه فتتابع رواه الترمذی .

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب مال فئی کو دولت، امانت کو غنیمت اور زکوۃ کو ٹیکس قرار دیا جانے لگے، علم غیر دین کیلئے سیکھا جائے، آدمی اپنی بیوی کی فرمانبرداری اور ماں کی نافرمانی کرنے لگے، دوست کو قریب اور باپ کو دور کرنے لگے، مسجدوں میں آوازیں بلند ہونے لگیں، بدکار آدمی اپنے قبیلے کا سردار ہو جائے اور قوم کا نواب سب سے رذیل بن جائے، آدمی کی عزت اس کے شر سے بچنے کیلئے کی جائے، گانے والی عورت اور گانے بجانے کا سامان اور آلات پھیل جائیں، شرابیں پی جانے لگیں اور اس امت کا آخری طبقہ پہلے طبقہ (سلفِ صالحین) پر لعن طعن کرنے لگے تو اس وقت ان عذابوں کا انتظار کرو سرخ آندھی، زلزلہ، زمین میں دھنس جانا، شکل بگڑ جانا، آسمان سے پتھر برسنا اور ان کے علاوہ دوسرے مختلف عذاب اور فتنے جو اس طرح پے در پے واقع ہوں گے جیسے کسی تسبیح (ہار) کا دھاگہ ٹوٹ جانے سے اس کے دانے پے در پے گرنے لگتے ہیں۔

شہیدِ اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ "اسلام کا قانون زکوۃ وعشر" (ص ۵۰) میں یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

آج سے کوئی چودہ پندرہ سال پہلے کی بات ہے کہ حضرت استاذ دام ظلہم کی خدمت میں مشکوۃ شریف پڑھتے وقت پہلی دفعہ حدیث مندرجہ بالا نظر کے سامنے آئی تو میرا واہی ذہن فوراً یہ سوچنے لگا کہ یا اللہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان پتھر کی لکیر ہے، اپنا ایمان ہے کہ جو کچھ فرمایا ہو کر رہے گا۔ لیکن یہ آخر کیسے ہو جائے گا کہ مسلمان کہلانے والے زکوۃ کو ٹیکس قرار دیں؟ تاہم دل کو یوں تسلی مل

گئی کہ یہاں زکوۃ کو ٹیکس قرار دینے سے مراد ضروری نہیں کہ واقعۃً اسے ٹیکس ہی کہا جائے بلکہ یہ مطلب بھی مراد لیا جاسکتا ہے کہ لوگ زکوۃ سے ٹیکس کا سا معاملہ کرنے لگیں اور اس کی ادائیگی میں گرانی محسوس کرنے لگیں، مگر زمانہ کی بوقلمونی ملاحظہ کیجئے کہ چند سال کی معمولی مدت نے انسانی مزاج میں کتنا تغیر، کتنا فساد اور کتنا فتور برپا کردیا کہ چند ہی سال پہلے جس امر کو میری سادہ مزاجی کسی صاحبِ ایمان کی طرف منسوب کرنے پر آمادہ نہ ہوتی تھی آج بعض نام نہاد مسلمان پوری توانائی سے باربار اسی کی رٹ لگا رہے ہیں کہ زکوۃ ٹیکس ہے، ٹیکس ہے، نعوذ باللہ من النفاق والشقاق سب سے پہلے آسمانِ مغرب کا یہ الہام، ادارہ تحقیقات اسلامی کے ڈائریکٹر جناب فضل الرحمٰن صاحب بالقابہ کے قلب پر میک گل یونیورسٹی میں القاء ہوا اور انہوں نے رسائل اور اخبارات میں اس الہامی علم کی اشاعت فرمائی۔

زکوۃ کو ٹیکس کہنے والوں سے جہاد

زکوۃ کو ٹیکس کہنا اتنا خطرناک نظریہ ہے کہ اس سے ایک اسلامی فریضہ معطل ہوجاتا ہے اور دین حنیف میں تحریف آتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے بعد عہد صدیقی میں مانعین زکوۃ کا جو فتنہ اٹھا اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے ان کے خلاف باقاعدہ جہاد کیا اور کئی شہادتیں ہوئیں اس کے پیچھے بھی یہی نظریہ کارفرما تھا، وہ لوگ یہ نہیں کہتے تھے کہ اسلام میں زکوۃ کا سرے سے وجود ہی نہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زکوۃ وصول ہی نہیں کی بلکہ ان کا خیال یہ تھا کہ زکوۃ میں اگرچہ کسی درجہ میں عبادتی پہلو بھی پایا جاتا ہے لیکن وہ درصل ایک ٹیکس ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قومی ضروریات پوری کرنے کیلئے

نافذ فرمایا تھا۔

خاتمۃ المحدثین حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فیض الباری (۱/۱۰۹) میں فرماتے ہیں:

ان کا خیال یہ تھا کہ زکوۃ دراصل ایک مالی ٹیکس ہے جس طرح بادشاہ اپنی رعایا سے مختلف قسم کے مالی ٹیکس وصول کیا کرتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اس کی وصولی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دائرہ اختیار میں تھی اور اب جبکہ ہم نے اپنے میں سے والی چن لئے ہیں تو زکوۃ ہم سے ساقط ہوگئی اور دیگر مالیاتی ٹیکسوں کی طرح زکوۃ کا معاملہ بھی والی اور حاکم وقت کی رائے پر ہے۔

لیکن حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اورآپ کے تمام رفقاء نے زکوۃ کے بارے میں اس نظریہ کے پیش کرنے والوں کو مرتد اور خارج از اسلام قرار دیا اور ان کے خلاف لشکر کشی کی اوران سے وہی معاملہ کیا جو مرتدین کی جماعت سے کیا جاتا ہے۔چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر ”باب من ابی قبول الفرائض ومانسبوا الی الردۃ. (جو لوگ فرائض کے قبول کرنے سے انکار کریں ان کا اور ان کے ارتداد کا بیان) کا عنوان قائم فرما کر زکوۃ میں ٹیکس کی تاویل کا پیوند لگانے والوں کے ارتداد کی تصریح فرمائی ہے۔ (صحیح البخاری(۲/۱۰۲۳)

دوسری بحث: شرح زکوۃ میں تبدیلی

جو حضرات زکوۃ کو ٹیکس قرار دیتے ہیں وہ اس نظریہ پر ایک یہ نتیجہ مرتب کرتے ہیں کہ:

(ا) اموال زکوۃ کی تعیین ابدی نہیں ہے،قرآن وسنت کی رو سے جن

اموال پر زکوۃ واجب ہے ان کے علاوہ اشیاء پر بھی زکوۃ مقرر کی جاسکتی ہے۔

(۲) زکوۃ کی شروح، دسواں حصہ (۱/۱۰) بیسواں حصہ (۱/۲۰) اور چالیسواں حصہ (۱/۴۰) بھی ابدی نہیں ہیں بلکہ حکومت وقت ان شروحات میں کمی بیشی کر سکتی ہے۔

(۳) نصاب زکوۃ مثلاً بیس دینار = ساڑھے سات تولے سونا اور دوسو درہم = ساڑھے باون تولہ چاندی بھی ابدی نہیں ہے، ان میں بھی تبدیلی ممکن ہے۔

(۴) زکوۃ کے مصارف بھی طے اور معین نہیں ہیں۔

یہ حضرات کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اموال زکوۃ کی تعین، زکوۃ کی شروح اور نصاب زکوۃ کی مقدار اپنے زمانہ کے اعتبار سے بیان فرمائی تھیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان امور کا تعین بحیثیت ایک حکمران کے کیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں سرکاری اخراجات قومی وملکی ضروریات محدود تھیں، زکوۃ کی مذکورہ مقدار سے کفایت ہوجاتی تھی، لیکن اس وقت حکومتوں کی ذمہ داریاں، مصارف، اخراجات اور ضروریات بہت زیادہ ہیں، اس لئے عام ٹیکس کی طرح زمانہ کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اموال زکوۃ اور شروح زکوۃ میں اضافہ کرنا ضروری ہے۔

مناقشہ وتبصرہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کام سرانجام دیئے ہیں وہ دو قسم کے ہیں (۱) الہامی (۲) تدبیری وانتظامی، الہامی امور احکام شریعت کہلاتے ہیں اور ہمیشہ کیلئے ہوتے ہیں ان میں خود نبی کو بھی تبدیلی کی اجازت نہیں ہوتی، جیسے پانچ نمازیں

نمازوں کی رکعات،وغیرہ،اور تدبیری وانتظامی امور کا درجہ احکام شریعت کانہیں ہوتا وہ عارضی دنیاوی کام ہوتے ہیں جن میں تبدیلی ہوسکتی ہے،زمان ومکان کے تقاضوں کے مختلف سانچوں میں ڈھالے جاسکتے ہیں،الہامی اورتدبیری امور میں بنیادی فرق یہ ہے کہ الہامی امور محض من جانب اللہ ہوتے ہیں،ان کے نزول وتقرر میں کسی کی رائے اور مشورہ کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔جبکہ تدبیری امور میں مشورہ کی ضرورت ہوتی ہے،یہ محض من جانب اللہ نہیں ہوتے،چنانچہ قرآن مجید میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تدبیری امور کے بارے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مشورہ کاحکم دیا گیا ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: فاعف عنهم واستغفرلهم وشاورهم فی الامر (الِ عمران:۱۵۹)

وقال اللہ تعالیٰ:وامرهم شوری بينهم ومما رزقنهم ينفقون ٥(الشوری:۳۸)

احادیث سے بھی ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تدبیری امور میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مشورہ فرمایا جیسا کہ جنگوں کے طریق کاراور قیدیوں کے بارے مشورہ لینا احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔

جوحضرات یہ کہتے ہیں کہ شرح زکوۃ وغیرہ میں تبدیلی ہوسکتی ہے وہ دراصل اس بات کے قائل ہیں کہ اموال زکوۃ کی تعیین،شرح اور نصاب وغیرہ الہامی امور نہیں بلکہ تدبیری امور ہیں لیکن انکی یہ بات بالکل غلط ہے،ان امور کو تدبیری ثابت کرنے کیلئے ضروری ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کاان کے بارے صحابہ

کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مشورہ کرنا ثابت کیا جائے اور یہ بات قرآن وسنت،ضعیف حدیث،علیل اثر سے کیا،کسی تاریخی روایت سے بھی نہیں ثابت کی جاسکتی ہے،ان امور کے بارے مشورہ ثابت نہ ہونا بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ امور الہامی اور منزل من اللہ ہیں، مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ ہماری حیثیت مدعی کی نہیں مدعی علیہ کی ہے،تبدیلی کے قائل حضرات مدعی ہیں،لیکن اس کے باوجود قرآن وسنت سے ثابت ہے کہ یہ امور الہامی ہیں تدبیری نہیں ہیں۔

قال اللہ تعالیٰ:والذین فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم(سورۃ المعارج: ۲۴،۲۵)

ان آیات میں زکوٰۃ کیلئے ''حق معلوم'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے،لفظ حق کا مفہوم خود اس بات کا متقضی ہے کہ زکوٰۃ اور اس کے متعلقات دائمی اور ابدی امور ہیں پھر اس کی صفت معلوم لائی گئی ہے،معلوم علم مادہ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس حق زکوٰۃ کا پورا علم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو من جانب اللہ دیا گیا تھا،اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زکوٰۃ اور اس کے متعلقات کی جو تشریح فرمائی وہ اپنی مرضی کی بنیاد پر نہیں فرمائی،بلکہ زکوٰۃ کی تقدیرات اوران کی تشریح دوسرے فرائض شرعیہ کی بنسبت زیادہ محتاط انداز میں فرمائی،جزئیات اور فروع کی تفصیل بھی بیان فرمائی اور زکوٰۃ کے احکامات لکھ کر گورنروں کے پاس تنفیذ کیلئے بھیجے،مصارف زکوٰۃ کے بارے قرآن کریم میں ہے۔

انماالصدقات للفقراء والمسٰکین والعملین علیھا والمؤلفۃ قلوبھم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل فریضۃ من اللہ

والله علیم حکیم ٥(سورة التوبه: ٦٠)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مصارف زکوۃ کو گن گن کر بیان فرمایا ہے اورآخر میں فرمایا"فریضۃ من اللہ" اس بانگ دہل اعلان کے باوجود مصارف میں تبدیل کیسے کی جاسکتی ہے؟

☆اموالِ زکوۃ کے بارے میں تفصیل کردی گئی ہے کہ فلاں فلاں اموال میں زکوۃ ہے،اب جن اموال کاذکر نہیں فرمایاہے ان میں زکوۃ واجب نہ ہوگی، نیز احادیث میں تصریح بھی آتی ہے کہ فلاں چیز میں زکوۃ واجب نہیں ہے۔

(۱) سونا، چاندی، نقدی ، کرنسی وغیرہ کی زکوۃ کے بارے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم ٥ یوم یحمی علیھا فی نار جھنم فتکوی بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم ھذا ماکنزتم لانفسکم فذوقوا ماکنتم تکنزون

(التوبۃ: ۳۴،۳۵)

(۲)زرعی پیداوار،اناج،دانوں،غلات،پھلوں اورسبزیوں کی زکوۃ کے بارے ارشادہے:کلوا من ثمرہ اذااثمروآتوا حقہ یوم حصادہ(الانعام: ۱۴۲)

نیزارشادہے:ومما اخرجنالکم من الارض (البقرۃ ۲۶۷)

(۳) کنوز، رکاز، معادن، دفینوں اور ہرقسم کے خزائن کے بارے ارشادہے:

ومما اخرجنالکم من الارض (البقرۃ ۲۶۷)

(۴)ہرقسم کے مال تجارت وصنعت، مال مویشی وغیرہ کی زکوۃ کے بارے

ارشاد فرمایا ہے: یاایھاالذین آمنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم (البقرۃ: ۲۶۷)

فرضیت زکوۃ، شرح، تقدیر، اموال ومصارف زکوۃ کے غیر متبدل اور ابدی ہونے پر مذکورہ نصوص قرآنیہ کے علاوہ احادیث صحیحہ کثیرہ بھی موجود ہیں، نیز ان امور کے الہامی، ابدی اور غیر متبدل ہونے پر اب تک پوری امت کا اجماع اور اتفاق رہا ہے، اس زمانے کے نام نہاد مجتہدین کے علاوہ ازمنہ سابقہ میں کسی نے بھی ایسا انکشاف نہیں کیا۔

تیسری بحث: کیا ٹیکس ادا کرنے سے زکوۃ بھی ادا ہوجاتی ہے؟

جو حضرات زکوۃ اور ٹیکس میں فرق نہیں کرتے وہ اس نظریہ پر یہ مسئلہ بھی متفرع کرتے ہیں کہ حکومت کو ٹیکس ادا کردے تو کافی ہے، اس سے زکوۃ بھی ادا ہوگئی، الگ سے زکوۃ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن یہ نتیجہ بالکل باطل ہے، کیونکہ یہ نتیجہ اس مفروضے پر متفرع ہے کہ ٹیکس اور زکوۃ میں کوئی فرق نہیں ہے اور ہم اس مفروضے کا بالکل غلط اور خلاف حقیقت ہونا پہلے ثابت کرچکے ہیں، اس لئے اس مسئلے پر مزید گفتگو کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اس باطل نظریہ سے قطع نظر فقہاء کرامؒ نے ایک اور عارض کے پیش آنے کی وجہ سے اس مسئلہ پر کلام کیا ہے، وہ عارض یہ ہے کہ قرونِ اولیٰ اور اس کے بعد اسلامی حکومتیں مسلمانوں سے زکوۃ ہی وصول کرتی تھیں، ٹیکس نہیں لگایا جاتا تھا لیکن اس زمانے میں مسلم ممالک تو ہیں لیکن

حکومتیں اسلامی نہیں ہیں، نام نہاد مسلم حکمرانوں نے تہذیب مغرب کی گود میں پرورش پائی ہے اور نظام بھی مغرب کا نافذ ہے جسکے تحت زکوۃ کی بجائے مسلمانوں سے ٹیکس وصول کیا جاتا ہے، اب اگر مسلمان ٹیکس کے علاوہ الگ سے زکوۃ بھی ادا کرے تو اس پر دگنا بار پڑتا ہے، نیز ازمنہ سابقہ میں بھی بعض حکومتیں مسلمانوں سے ظالمانہ ٹیکس وصول کرتی تھیں۔

سوال یہ ابھرتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان حکومت کو ظالمانہ ٹیکس ادا کرتے وقت زکوۃ کی نیت کرلے تو کیا اس سے زکوۃ ادا ہو جائے گی؟ ایک مسئلہ یہ بھی زیر غور رہا ہے کہ ظالم و جابر حکمرانوں کے پاس اپنا مال ومتاع نہیں ہوتا، انکے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ رعایا سے چھینا ہوا ہوتا ہے، اگر بالفرض اپنا مال موجود بھی ہو تو ان پر لوگوں کے اتنے زیادہ مالی حقوق واجب ہوتے ہیں کہ اگر ان کے مال سے ان حقوق کی ادائیگی کی جائے تو ان کے پاس کچھ بھی نہ بچے، اس اعتبار سے یہ حکمران غریب اور مستحق زکوۃ ہوتے ہیں، اگر انہیں ٹیکس دیتے ہوئے زکوۃ کی نیت کرلی جائے تو زکوۃ ادا ہو جائے گی؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جوابات کتب فقہ میں جابجا ملتے ہیں، اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ اس کی مختصر وضاحت کردی جائے۔

کیا ٹیکس زکوۃ سے مستغنی کر سکتے ہیں؟

اس بارے بعد حضرات کا کچھ اختلاف بھی ہے جس کی وضاحت آگے آیا چاہتی ہے لیکن صحیح اور حق یہ ہے کہ ٹیکس کی ادائیگی سے زکوۃ کسی صورت میں ادا نہیں ہوتی، اس پر تقریباً اتفاق واجماع ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ شریعت کی رو سے زکوۃ میں تین اہم بنیادی امور کا پایا جانا ضروری ہے۔

(۱)وہ متعین مقداریں جو شریعت کی طرف سے متعین اور مقرر کردہ ہیں یعنی عشر، نصف عشر اور چالیسواں حصہ۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے حکم کی ادائیگی کی نیت ہو اور اس حکم کو فرض عبادت سمجھ کر دینے کا ارادہ ہو۔

(۳) زکوۃ کو قرآن کریم کے بیان کردہ آٹھ مصارف میں تقسیم کیا جائے۔

اگر ٹیکسوں سے مذکورہ تین امور انجام پاتے ہیں پھر تو زکوۃ ادا ہوجائے گی، ورنہ نہیں، سب جانتے ہیں کہ ٹیکسوں سے یہ امور انجام نہیں پاتے، ٹیکسوں کی مقدار مختلف ہوتی ہے، کوئی شخص بھی انہیں اللہ تعالیٰ کا حکم اور فرض عبادت سمجھ کر ادا نہیں کرتا اور حکومت بھی ٹیکسوں کو مصارف زکوۃ میں خرچ نہیں کرتی، اس لئے ٹیکسوں سے کسی صورت میں زکوۃ ادا نہ ہوگی، الگ سے زکوۃ ادا کرنا ضروری ہے، علماء امت وفقہاء ملت کا یہی فتوی ہے۔ چند فتاوی ملاحظہ ہوں۔

فتاوی دارالعلوم دیوبند (۱۴۶/۶) میں ہے۔

سوال: سرکار تجارت کے منافع پر اور مکانات کے کرایہ پر ٹیکس لیتی ہے، یہ زکوۃ میں محسوب ہوسکتا ہے یا نہیں ؟

الجواب: ٹیکس میں جو کچھ روپیہ دیا جاتا ہے وہ زکوۃ میں محسوب نہیں ہوسکتا ، زکوۃ علیحدہ ادا کرنی چاہئے۔

کفایت المفتی (۳۱۶/۴) میں ہے۔

سرکار کا محصول ادا کرنے سے عشر ساقط نہیں ہوتا

سوال: سلطنت برطانیہ کو زمین کا محصول دینے کے بعد عشر ساقط ہوجاتا ہے

یانہیں؟

جواب: سرکاری محصول ادا کرنے سے عشر ساقط نہیں ہوتا۔

سرکاری مالیہ دینے سے عشر ساقط نہیں ہوتا

نیز (۳۱۸/۴) میں ایک سوال کے جواب میں ہے:

سرکاری مالیہ دینے سے عشر ساقط نہیں ہوتا۔

امدالفتاوی (۶۰/۲) میں ہے۔

سوال: زمین عشری کی مالگواری سرکاری ادا کرنے سے جیسے کہ جناب مولوی قاری عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پتیؒ اور حضرت مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق تھی عشر ادا ہوجاتا ہے یانہ، معاملہ احتیاط تو ظاہر ہے کہ مستحقین کو علیحدہ دے مگر قول مضبوط آپ کے نزدیک کونسا ہے؟

الجواب: ہم کو تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ادا نہیں ہوتا جیسے انکم ٹیکس سے زکوۃ ادا نہیں ہوتی، باقی ان حضرات کے ارشاد کا مبنیٰ معلوم نہیں۔

مال گزاری لینے کے باوجود عشر واجب ہے؟

عزیز الفتاوی (ص۳۵۴) میں ہے:

سوال: وہ زمین کہ جس میں نہر وغیرہ سے پانی دیاجائے اس پر بیسواں حصہ اور آسمانی پر دسواں حصہ زکوۃ کا ہے تو سرکاری محصول دے دیاجائے تو پھر شرعی طریقہ دسواں اور بیسواں عمل میں لایاجاوے گا یانہیں؟

الجواب: اگر زمین عشری ہے تو سرکاری محصول دینے سے عشر ساقط نہیں ہوتا

بنا بینہ وبین اللہ، فقراء کو دسواں یا بیسواں حصہ دینا چاہئے۔

نیز اس سے آگے بھی چند فتاوی میں یہی حکم مرقوم ہے۔

وکذا فی خیر الفتاوی (۳/ ۷۱ ۴)

انگریزی حکومت کو مال گزاری دینے سے عشر ادا نہ ہوگا

امداد الاحکام (۲/ ۳۷) میں ہے:

انگریزوں کو مال گزاری دینے سے عشر ادا نہ ہوگا، اگر زمین عشری ہے تو عشر کا ادا کرنا لازم ہے، زمین کی پیداوار میں زکوۃ نہیں ہے بلکہ عشر ہی واجب ہے۔

ارض مملوکہ مسلمین میں جہاں راجاؤں کو ٹیکس دیا جاتا ہے عشر واجب ہے

فتاوی دار العلوم دیوبند (۱۲/ ۲۷۷) میں ہے۔

سوال: جو اراضی مملوکہ مسلمین ہیں اور راجاؤں کو باقی دینی پڑتی ہے اس میں عشر واجب ہے یا نہیں؟

الجواب: عشر واجب ہے۔

سرکاری محصول سے عشر ساقط نہیں ہوتا

فتاوی دار العلوم دیوبند (۱۲/ ۲۸٦) میں ہے۔

سوال: سرکار زمین سے جو محصول لیتی ہے اس سے عشر ساقط ہوتا ہے یا نہ؟

الجواب: عشری زمین سے محصول لینا مسقط عشر نہیں ہے ھذا ھو الاحتیاط ،ہاں اگر زمین عشری نہ ہو بلکہ خراجی ہو تو محصول دینا کافی ہے یعنی عشر اس میں واجب نہیں ہے۔

سرکاری لگان دینے سے عشر ادا نہیں ہوتا

نیز فتاوی دار العلوم دیوبند (۲۹۰/۱۲) میں ہے۔

سوال: یہاں کے لوگ عشر نہیں دیتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم بادشاہ کو عشر دیتے ہیں بتائیے کہ کفار یا بادشاہ کو عشر دینے سے ادا ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب: عشر کے مصارف زکوۃ کے مثل ہیں، مسلمان محتاجوں کو دینا چاہئے، کافروں کو دینے سے عشر ادا نہ ہوگا۔

انکم ٹیکس ادا کرنے سے زکوۃ ادا نہ ہوگی

آپ کے مسائل (۳/ ۳۸۷) میں ہے۔

سوال: ایک شخص صاحب نصاب ہے اگر وہ شرع کے مطابق اپنی جائیداد رقم وغیرہ سے زکوۃ ادا کرتا ہے تو کیا وہ شرعاً ملکی نظام دولت کا وضع کردہ انکم ٹیکس ادا کرنے سے بری ہو جاتا ہے؟ اگر وہ صرف انکم ٹیکس ادا کرتا ہے اور زکوۃ نہیں دیتا ہے تو اس کیلئے کیا حکم ہے؟ نیز موجودہ نظام میں وہ کیا طریقہ اختیار کرے؟

جواب: انکم ٹیکس ملکی ضروریات کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے مقرر ہے جبکہ زکوۃ ایک مسلمان کیلئے فریضہ خداوندی اور عبادت ہے، انکم ٹیکس ادا کرنے سے زکوۃ ادا نہیں ہوتی، بلکہ زکوۃ کا الگ ادا کرنا فرض ہے۔

جس زمین کا ٹیکس دینا پڑتا ہو اس میں عشر

فتاوی دارالعلوم دیو بند مکمل مدلل (۱۸۹/۶) میں ہے۔

سوال: جس زمین کی ملکیت ہوگئی اور بیچنے کا اختیار ہے، راجاؤں کو خراج دیئے پڑجاتے ہیں اور اراضی آسمانی پانی سے سیراب ہوتی ہے، اس پر عشر ہے یا نہیں؟

جواب: عشر لازم ہے۔

فی رد المحتار (۳۲/۲) باب زکوة الغنم، اخذ البغاة والسلاطین الجائرة زکوة الاموال الظاهرة ....الخ

بینک جو زکوة کاٹتا ہے اس کا انکم ٹیکس سے کوئی تعلق نہیں۔

آپ کے مسائل (۳۷۵/۳) میں ہے۔

سوال: ایک شخص کے پاس گھر میں ۱۰ ہزار ہیں، بینک میں بھی دس ہزار ہیں بینک کی رقم سے حکومت زکوة کاٹتی ہے اور وہ شخص انکم ٹیکس بھی ادا کرتا ہے، تو کیا وہ رقم جو بینک میں جمع ہے اس پر زکوة دوبارہ دے گا، جبکہ انکم ٹیکس بھی حکومت کو دینا ہے یا صرف وہ رقم جو اس کے گھر میں موجود ہے صرف اس پر زکوة ادا کرنی ہوگی؟

جواب: بینک جو زکوة کاٹتا ہے بعض اہل علم (اب سب اہلِ علم) کے نزدیک زکوة ادا ہوجاتی ہے اور حکومت کو جو انکم ٹیکس دینا ہے اتنی مقدار کو چھوڑ کر باقی رقم کی زکوة ادا کردی جائے۔

انکم ٹیکس کی ادائیگی سے زکوۃ ادا نہیں ہوتی

فتاوی عثانی (۶۹/۲) کتاب الزکوۃ میں ہے۔

سوال: جولوگ انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں اور زکوۃ نہیں ادا کرتے، ضرور خدا کے مجرم ہیں، اوراگر زکوۃ ادا کریں اور ٹیکس سے جان چھڑانا چاہیں تو حکومت چھوڑتی نہیں ہے، دونوں ادا کرتے ہیں تو زبردست مالی خسارہ اٹھانا پڑتا ہے کیا کیا جائے؟

جواب: انکم ٹیکس کا زکوۃ سے کوئی تعلق نہیں، زکوۃ عبادت اور اللہ کا حق ہے اور انکم ٹیکس حکومت کا ایک ٹیکس ہے، لہٰذا ایک کی ادائیگی سے دوسرے کی ادائیگی نہیں ہوتی، انکم ٹیکس کیلئے حقیقی سرمایہ کو چھپانے میں جب جھوٹ بولنا پڑے یا جھوٹی شہادت دینا پڑے تو وہ جائز نہیں واللہ سبحانہ اعلم احقر محمد تقی عثانی

۱۳۷۸/۱۱/۴ھ

الجواب صحیح بندہ: محمد شفیع عفا اللہ عنہ

سرکاری ٹیکس کی ادائیگی سے زکوۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

نیز (۶۷/۲) کتاب الزکوۃ میں ہے۔

سوال: جو لوگ زکوۃ ادا کرتے ہیں کیا وہ ٹیکس بھی ادا کریں گے یا نہیں؟ دونوں صورتوں میں زبردست مالی خسارہ ہوتا ہے، زکوۃ نہ دینے کی صورت میں مجرم خدا ہوجاتے ہیں ٹیکس نہ دیں تو حکومت پیچھا نہیں چھوڑتی، کیا ٹیکس کی ادائیگی سے زکوۃ ادا ہوگی یا نہیں؟ اب ٹیکس سے بچنے کیلئے اگر کوئی رجسٹروں میں کمی بیشی کرے تو

کوئی صورت ہے؟

جواب: سرکاری ٹیکسوں کی ادائیگی سے زکوۃ ادانہیں ہوتی، حکومت کو صرف ایسے ٹیکس لگانے چاہئیں جو عوام پر بار نہ بنیں، اگر حق وانصاف سے زائد ٹیکس لگائے گئے ہیں تو ان سے اخفاء کے ذریعے نجات حاصل کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس میں جھوٹ وغیرہ کا گناہ مول نہ لیا جائے۔

اقوالِ صحابہ وتابعین

فی مصنف ابن ابی شیبة(۳/ ۵۸)کتاب الزکوة،باب من قال لاتحتسب بذلک من زکاتک مطبوعة مکتبة امدادیة ملتان میں کئی صحابہ وتابعین کے آثار نقل فرمائے ہیں کہ عاشر کو جو کچھ دیا جاتا ہے وہ زکوۃ میں محسوب نہ ہوگا۔

(۱)عن ایوب ابی قلابة قال: لاتحتسب بما اخذمنک العاشر.

ابو قلابہؒ فرماتے ہیں کہ تم سے جو کچھ عاشر وصول کرتا ہے اسے زکوۃ میں شمار مت کرو۔

(۲) عن جعفرؒ عن میمونؒ قال: لایحتسب به

حضرت میمونؒ فرماتے ہیں کہ اسے زکوۃ میں محسوب نہیں کیا جائے گا۔

(۳) عن لیثؒ عن مجاهدؒ وطاؤسؒ قالا: لاتحتسب ما اخذ منک العاشر.

حضرت مجاہدؒ اور طاؤسؒ فرماتے ہیں کہ تم سے عاشر جو لیتا ہے اسے زکوۃ میں محسوب نہ کرو۔

(۴)عن مجاهدؒ عن ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنه قال: لایحتسب به.

ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اسے زکوۃ میں شمار نہیں کیا جائیگا۔

(۵)عن السدیؒ عن ابی جعفرؒ قال: لایحتسب بمااخذ منک العاشر.

ابوجعفر فرماتے ہیں کہ عاشر تم سے جو ٹیکس لیتا ہے اسے زکوۃ شمار نہ کرو۔

البتہ مصنف میں ہی اس باب سے قبل ایک باب باندھا ہے" باب من قال یحتسب بما اخذالعاشر" اس باب میں کئی صحابہؓ وتابعینؒ سے نقل فرمایا ہے کہ عاشر جو کچھ لیتا ہے اسے زکوۃ میں محسوب کیاجائے گا،اس کے بارے میں وضاحت آگے آیاچاہتی ہے۔

قال فی الدرالمختار(۲/۲۸۸)،باب زکوۃ الغنم....،اخذالبغاۃ والسلاطین الجائرۃ زکوۃ الاموال الظاهرۃ کالسوائم والعشر والخراج لا اعادۃ علی اربابها ان صرف الماخوذ فی محله الاتی ذکره والا یصرف فیه فعلیهم فیمابینهم وبین الله اعادۃ غیرالخراج لا نهم مصارفه.

واختلف فی الاموال الباطنة ففی الولوالجیة وشرح الوهبانیة المفتی به عدم الاجزاء وفی المسبوط الاصح الصحة اذا نوی بالدفع لظلمة زماناالصدقة علیهم،لانهم بماعلیهم من التبعات فقراء حتی افتی امیربلخ بالصیام لکفارۃ عن یمینه ولوا خذها الساعی جبرا لم تقع زکوۃ لکونها بلا اختیار ولکن یجبر بالحبس لیؤدی بنفسه لان الاکراه ینافی

الاعتبار،وفی التجنس:المفتی به سقوطها فی الاموال الظاهرة لاالباطنة.

قال ابن عابدینؒ بعد بحث وتمحیص:قلت:وشمل ذلک مایأ خذه المکاس لا نه وان کا ن فی الاصل هو العاشرالذی ینصبه الامام لکن الیوم لا ینصب لاخذ الصدقات بل لسلب اموال الناس ظلما بدون حمایة فلا تسقط الزکوة باخذه کما صرح به فی البزازیة فاذا نوی التصدق علیه کان علی الخلاف المذکور.

علامہ ابن حجر ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الزواجر،، میں اس خیال کی سختی سے تردید فرمائی ہے کہ ٹیکس سے زکوۃ ادا ہوجاتی ہے،وہ فرماتے ہیں کہ یہ ایک باطل خیال ہے،شافعی مذہب میں اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے،ایسا نظریہ رکھنے والے تجار کو فاسق لکھا ہے۔

قال العلامةابن عابدینؒ فی رد المحتار(۳۱۰/۲)بعدنقل بعض کلام ابن حجر الهیثمیؒ:ثم قال:واعلم ان بعض فسقة التجاریظن ان مایؤخذ من المکس یحسب عنه اذا نوی الزکوة وهذا ظن باطل لامستند له فی مذهب الشافعی لان الامام لاینصب المکاسین لقبض الزکوة بل لاخذ عشورات مال وجد وه قل اوکثر وجبت فیه الزکوة ام لا وتمامه هناک.

قال ابن عابدین بعد نقل کلام الهیثمی هذا:قلت:علی انه الیوم صارالمکاس یقاطع الامام بشئی یدفعه الیه ویصیر یاخذ مایاخذه لنفسه ظلما وعد وانا ویأخذ ذلک ولو مرالتاجرعلیه اوعلی ماکس اخرفی العام

الواحد مرارا متعددا ولو كان لاتجب عليه الزكوة فعلم ايضا انه لايحسب من الزكوة عندنا لانه ليس هو العاشر الذى ينصبه الامام على الطريق لياخذ الصدقات من المارين وقد مرايضا انه لابد من شرط ان يأمن به التجار من اللصوص ويحميهم منهم وهذا يقعد على ابواب البلدة ويؤذى التجار اكثر من اللصوص وقطاع الطريق،وياخذ منهم قهرا ولذا قال فى البزازية:اذا نوى ان يكون المكس زكوة فالصحيح انه لايقع على الزكوة كذا قال الامام السرخسى اه واشار بالصحيح الى القول بانه اذا نوى عند الدفع التصدق على المكاس جاز لأنه فقير بما عليه من التبعات وقد مر الكلام عليه.

وفى البزاز ية على هامش الهند ية(۹۸/۴)السلطان الجائراذا اخذ صدقات الاموال الظاهرة بجور سقط فى الصحيح ولايامربالاداء ثانيافان صادراواخذالجبايات ونوى ان يكون عن الزكوة او نوى ان يكون المكس زكوة فالصحيح انه لا يقع عن الزكوة كذا قال الامام السرخسى رحمه الله.

و فى الفقه الاسلامى وادلته(۱۹۶۹/۳)هل تجزئ الضريبة المدفوعة للدولة عن الزكوة؟لاتجزى اصلاالضريبة عن الزكوة،لان الزكاة عبادة مفروضة على المسلم شكرا لله تعالى وتقربا اليه والضريبة التزام مالى محض خال عن كل معنى للعبادة والقربة،ولذاشرطت النية فى الزكوة ولم تشرط فى الضريبة ولان الزكوة حق مقدر شرعا،بخلاف

الضريبة فانها تخضع لتقدير السلطة ولان الزكوة حق ثابت دائم والضريبة موقتة بحسب الحاجة،ولان مصارف الزكوة هى الاصناف الثمانية:الفقراء والمساكين المسلمون الخ والضريبة تصرف لتغطية النفقات العامة للدولة،وللزكوة اهداف روحية وخلقية واجتماعية انسانية واما الضريبة فلا يقصد بها تحقيق شئى من تلك الا هداف.

فى الفتاوى الاسلامية من دارالافتاء المصرية(٢٨٣٢/٨)

المبادى ....

٣: الضرائب تقررها الدولة على افراد الشعب لاستخدامها فى خدمة افراد المجتمع وهى حق لو لى الامرالمسلم شرعاً.

٤:لاتداخل بين الزكوة والضرائب ولكل اساسه ودوره ومصارفه ولا يغنى احدهما عن الآخر.

٥: يجوز احتساب الضرائب من راس المال الذى تجب فيه الزكوة باعتبار ها دينا وجب فى ذمة صاحب المال للدولة لامن القدر الخارج زكوة....

سئل:بالطلب المقدم من السيد/م.ع.س.المقيد برقم ١٨ لسنة ١٩٨٠ الذى يلتمس فيه بيان الحكم الشرعى فيما يلى : ان السائل اث شقته التى يستأجرها ثم أجرها مفروشة وانه يدفع عنها ضرائب دفاع وامن وغيره مايقاول ١٩،٨٥ ٪من قيمة كل الا يجارللشقة المفروشة ٢٥٪من قيمة الايجارالاصلى يدفعه للمالك بالاضافة الى ضريبة الايراد

العام فهل يمكن اعتبار هذه الضريبة فی الزكاة؟

۲:انه عليک نصف بيت عبارة عن شقق ودكاكين وخراج، وكلها قوجرة اتجارا عاديا ويحصل ايجارها وتخصم المصاريف ويوزع الصافی بنسبة نصيب كل من فی البيت هوواخوانه وتحصل الحكومةضريبة عقارات ودفاع وامن الی جانب ضريبة الا يراد العام فهل تعتبر هذه الضريبة فی الزكوة؟....

اجاب عن السوالين.الاول والثانی،الزكوة،فريضة وركن من اركان الاسلام الخمسة،تجب فی مال المسلم متی بلغ النصاب المقرر شرعاًوقد تكرر الامر بها فی القرآن الكريم غير مرة وجات السنة الشريفة مبينة لمقدار ها فی انواع المال المختلفة وهی باب عظيم من ابواب التكافل الاجتماعی تطهراللاموال وتزكية للنفوس واعانة للمحتاجين قال الله تعالیٰ (خذ من اموالهم صدقة تطهر هم بها وتزكيهم بها)من الآية ۱۰۳ من سورة التوبة وقال جل شانه:وفی اموالهم حق معلوم للسائل والمحروم الآية۲۰من سورة الزاريات وتصرف الزكوة للاصناف المبينة فی قوله تعالی انما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم وفی الرقاب والغارمين وفی سبيل الله وابن السبيل فريضة من الله من الآية ۶۰ من سورة التوبة ولقد حارب الخليفة الاول ابوبكر الصديق رضی الله تعالیٰ عنه المرتدين حينما منعوا الزكوة وقال:والله لومنعونی عقال بعير كانوا يؤدونه لرسول الله

صلی الله علیه وآله وسلم لقاتلتهم علیه حتی یؤدونه ولولی الامرفی المسلمین جبایة الزکوة واخرجها فی مصارفها المحدودة فی هذه الآیة الکریمة اما الضرائب:فان الدولة تقررها علی افراد الشعب لا ستخدامها فیما تؤدیه من مهام اداریة ودفاعیة ولانشاء المستشفیات وغیرها من المنشآت العامة التی تقوم بها الدولة لخدمة افراد المجتمع وفرض الزکوة حق لولی الامرالمسلم تجیزه الاحکام الشرعیة الاسلامیة باعتبار انه المنوط به القیام علی مصالح الامة التی تستلزم نفقات لامورد لها الا تلک الضرائب ومن هذا یظهر انه لاتداخل بین الزکوة والضرائب وان لکل اساسه ودوره ومصارفه فلا تغنی الزکوة عن الضرائب والضرائب عن الزکوه لا سیمافی هذا العصر الذی کثرت فیه سهام الدولة واتسعت مرافقها،ومن ثم یجوز احتساب الضرائب من رأس المال الذی تجب فیه الزکوة باعتبارهادیناًوجب فی ذمة صاحب المال للدولة والزکوة لاتجب الا اذابلغ المال نصابا محددا وفی شرائط وجوبها برأة الذمة من دیون العباد وعلی هذا یجوز احتساب الضرائب من رأس المال الذی تجب فیه الزکاة لامن القدرالخارج زکاة.

بعض حضرات کا مؤقف اوراس کی وضاحت

گزشتہ تفصیل اور حوالہ جات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مروجہ ٹیکس کا زکوۃ سے کوئی تعلق نہیں ہے،اس سے نہ زکوۃ ادا ہوتی ہے اور نہ اس کی وجہ سے زکوۃ سے استغناء برتا جاسکتاہے،البتہ بعض حضرات کی طرف یہ نسبت کی جاتی ہے اور

مراجعت کتب سے مترشح بھی ہوتا ہے کہ ان کے ہاں ٹیکس کی ادائیگی میں زکوۃ کی نیت کی جاسکتی ہے اوراس سے زکوۃ ادا ہوجائے گی۔ یہاں وہ حوالے نقل کر کے ان حضرات کے مؤقف کی وضاحت کرنا ضروری ہے اور خلاصہ اس وضاحت کا یہ ہے کہ بعض حضرات کی طرف اس کی نسبت ہی درست نہیں ہے اور بعض کی طرف نسبت درست ہے لیکن انہوں نے جس ٹیکس کا ذکر کیا ہے اس کا مروجہ ٹیکس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مصنف ابن ابی شیبة(۵۷/۳) کتاب الزکوة،الباب الستون (۶۰)فی من قال یحتسب بما اخذ العاشر میں نو آثار صحابہؓ وتابعینؒ نقل فرمائے ہیں جن میں ان کا مؤقف نقل کیا ہے کہ عاشر جو ٹیکس لیتا ہے اسے زکوۃ میں شمار کیا جاسکتا ہے، بعض لوگ ان اقوال سے استدلال کرتے ہیں کہ ٹیکس سے زکوۃ ادا ہوجاتی ہے۔

(۱)عن عبدالعزیزبن صهیبؒ عن انسؓ والحسنؒ قالا:
ما اخذمنک علی الجسور والقناطیر فتلک زکوة قاضیة .

(۲) عن ابراهیمؒ قال:احتسب بما اخذ منک العاشرون من زکوة مالک.

(۳) عن الزبرقانؒ قال:سألت ابارزینؒ مایأخذ العاشرمن التجار قال:یحتسب به من زکاته .

(۴)عن ابی هاشمؒ عن ابراهیمؒ والحسنؒ قالا:ما اخذمنک العاشر فاحتسب به من الزکاه .

(۵) عن منصورؒ عن ابراھیمؒ قال:یحتسب به.

(۶)عن ھشامؒ عن الحسنؒ قال:اذا مر علی العاشر فأ خذ منه احتسب به من زکوته.

(۷)عن الشعبیؒ قال فی الرجل یمر بالعاشرفیأخذ منه قال: یحتسب مااخذ وامنه من زکوة ماله.

(۸) عن سالمؒ عن سعید بن جبیرؒ قال:یحتسب به.

(۹)عن اسماعیل بن عبدالملکؒ قال:سألته فقال:احتسب بما اخذ منک العاشر.

اس طرح کے آثارروایات دوسری کتب مثلاً کتاب الاموال لابی عبید وغیرہ میں بھی منقول ہیں،لیکن ان روایات کا مروجہ ٹیکس کے ساتھ دور کا تعلق بھی نہیں بنتا،ان روایات میں ''مااخذ منک'' وغیرہ الفاظ سے ٹیکس مراد نہیں ہے بلکہ اس سے خود زکوۃ کی ایک قسم مراد ہے،جس کی تفصیل یہ ہے کہ اموال زکوۃ کی دو اقسام ہیں(۱)اموال ظاہرہ(۲)اموال باطنہ،اموالِ ظاہرہ سے مراد جانور،مویشی اور مالِ تجارت ہے جو ایک شہر سے دوسرے شہر لے جایا جاتا تھا،اسلامی سلطنتوں میں شہروں کے درمیان زکوۃ وصول کرنے کی چونگیاں قائم ہوتی تھیں،اوروہاں اموال ظاہرہ سے زکوۃ وصول کرنے پر ایک شخص مامور ہوتا تھاجسے عاشر کہا جاتا تھا، کتب فقہ میں اس بارے مستقل باب قائم کیاجاتاہے جس میں عاشر اور اموال ظاہرہ اور اس کے زکوۃ کے مسائل لکھے جاتے ہیں،مذکورہ آثار کا مطلب یہ ہے کہ عاشر چونگی پر اموالِ ظاہرہ کی جو زکوۃ وصول کرتا ہے اس سے زکوۃ ادا ہوجاتی ہے،اس کے بعد نجی طور پر

الگ سے اموالِ ظاہرہ کی زکوۃ ادا کرنا ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا اس کا مروجہ ٹیکس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وجہ بھی اس کی بالکل ظاہر ہے کہ ٹیکس خواہ ظالمانہ ہو یا عادلانہ ،اس زمانہ میں مسلمانوں سے وصول ہی نہیں کیا کیا جاتا تھا۔ہاں البتہ عاشر جس طرح مسلمانوں سے اموالِ ظاہرہ کی زکوۃ وصول کرتا تھا اہلِ ذمہ اور غیر مسلموں سے اسلامی ٹیکس بھی وصول کرتا تھا لیکن ظاہر ہے کہ اس کا بھی مروجہ ٹیکس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے مقلد حضرت امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاں ٹیکس سے زکوۃ ادا ہوجاتی ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے،ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے مجموع الفتاوی(۹۳/۲۵)میں اس بات کی تصریح ہے کہ حکمران جومحصول زکوۃ کے نام کے علاوہ کسی اور نام سے لیں تو وہ زکوۃ شمار نہیں ہوگی۔

یہ رائے بعض فقہاء شافعیہ کی طرف بھی منسوب کی جاتی ہے،چنانچہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھاہے کہ فقہاء شافعیہ کی رائے یہ ہے کہ جو خراج ظلماً لیا جائے وہ عشر کے قائم مقام نہیں ہے اوراگر حکمران عشر کے بدلے یہ خراج وصول کریں تو صحیح قول یہ ہے کہ اس سے زکوۃ ساقط ہوجائے گی۔ اور اگر حکومت کا وصول کردہ خراج کم ہو اور بحساب شریعت زکوۃ زیادہ بنتی ہو تو باقی ماندہ زکوۃ ادا کر دیا کرے۔

اس قول سے استدلال اس طرح ہے کہ جس زمین پر زکوۃ واجب ہے اس پر عشر کے بدلے خراج لینا اسی طرح ہے جس طرح آج کل زکوۃ کی جگہ ٹیکس لیا

جاتا ہے اور وہ اس مال پر لیا جاتا ہے جس پر زکوۃ فرض ہے اور وہ ان مصارف پر خرچ کیا جاتا ہے (بقول مستدلین) جن میں زکوۃ خرچ کی جاتی ہے۔

لیکن اس سے بھی استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ اس زمانے میں کوئی بھی حکومت مروجہ ٹیکس کو زکوۃ کا بدل تصور نہیں کرتی، یہی وجہ ہے کہ مروجہ ٹیکس مسلمان اور غیر مسلم سب سے وصول کئے جاتے ہیں نیز مروجہ ٹیکسوں سے حاصل شدہ رقوم بھی مصارف زکوۃ میں نہیں لگائی جاتی ہیں۔ ماخذ: فقہ الزکوۃ (۱۰۷۱/۲)

ٹیکس اور زکوۃ کا محل

ٹیکس کن کن اشیاء پر لگایا جائے اور کن اشیاء پر نہیں؟ اور کن اشیاء پر ٹیکس لگانے میں محاسن ہیں اور کن میں خرابیاں؟ نیز کسی چیز پر ٹیکس لگانے میں کیا کیا باتیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے؟ اس کے مقابلے میں زکوۃ کن اشیاء پر واجب ہے اور اس میں قابلِ لحاظ امور کی کس حد تک رعایت کی گئی ہے؟ اس عنوان کے تحت محل وظرف کے اعتبار سے زکوۃ اور ٹیکس کے درمیان تقابل پیش کرنا مقصود ہے۔

ٹیکس کا محل

ماہرین مالیات کے ہاں محل کے اعتبار سے ٹیکس کی چار اقسام ہیں۔

(۱) مصارف پر ٹیکس (۲) رأس المال پر ٹیکس (۳) آمدنی پر ٹیکس (۴) اشخاص پر ٹیکس۔ فرض کریں زید کے پاس ایک لاکھ روپیہ یا اس قدر مالیت کا مال ہے تو ایک لاکھ رأس المال ہے اور اس رقم سے جو کچھ خرچ کرتا ہے وہ مصرف ہے اور اس پر کچھ کماتا ہے تو وہ آمدنی ہے اور خود زید شخص اور مالک ہے۔

مصارف پر ٹیکس

ماہرین مالیات واقتصادیات کا ایک طبقہ مصارف واخراجات پر بھی ٹیکس کا قائل ہے اور کچھ ممالک میں مصارف پر عملاً ٹیکس لگایا جاتا ہے اور ان ماہرین کا استدلال یہ ہے کہ مصارف پر ٹیکس لگانا مقصد ٹیکس کے مطابق ہے کیونکہ ٹیکس کا مقصد حکومتی خزانے کا بھرنا ہے، لہٰذا مصارف پر بھی ٹیکس لگا کر خزانے کو بھرا جا سکتا ہے۔

مصارف پر زکوۃ

شریعت کی رو سے مصارف، اخراجات، نفقات اور خرچہ پر زکوۃ واجب نہیں اور نہ اس پر کسی قسم کے ٹیکس کا کوئی تصور موجود ہے، مصارف پر ٹیکس اس لئے لگایا جاتا ہے کہ نظام ٹیکس کا مقصد یہ ہے کہ حکومتی خزانہ کو زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل ہو ، جبکہ زکوۃ کا مقصد یہ نہیں ہے اور نہ اسلام کی نظر میں یہ مقصد کسی اہمیت کا حامل ہے، زکوۃ کی حقیقت یہ ہے کہ اغنیاء سے مال لیکر فقراء پر تقسیم کیا جائے، اس حقیقت کی موجودگی میں مصارف پر زکوۃ اس لئے واجب نہیں کہ فقیر ومسکین بھی اخراجات کرتا ہے، اس کے بھی مصارف ہوتے ہیں، اس فقیر کے مصارف پر زکوۃ واجب کرنا زکوۃ کی روح اور حقیقت کے خلاف ہے، اور شرعا یہ ظلم وتعدی ہے۔

رأس المال (Capital) پر ٹیکس

رأس المال جیسے نقدی، مال مویشی، مال تجارت اور سونا، چاندی پر ٹیکس

مقرر کرنا چاہیے یا نہیں؟ اس بارے ماہرین مالیات کی دو رائے ہیں، بعض فرماتے ہیں کہ رأس المال پر ٹیکس مقرر کرنا چاہیے، چنانچہ اشتراکی میلان رکھنے والے ماہرین اقتصادیات زیادہ تر اسی کے قائل ہیں اور بعض کی رائے یہ ہے کہ رأس المال پر ٹیکس نہیں ہونا چاہیے، سرمایہ دارانہ نظریہ رکھنے والے ماہرین زیادہ تر اسی کے قائل ہیں ۔

دلائل جواز ومحاسن

جو حضرات رأس المال پر ٹیکس لگانے کے قائل ہیں، وہ اس کے مندرجہ ذیل دلائل اور محاسن بیان کرتے ہیں ۔

(۱) رأس المال کی ملکیت سے مالکوں کو متعدد اجتماعی اور اقتصادی فوائد حاصل ہوتے اور کسب مال کے مواقع میسر آتے ہیں، دولت کی موجودگی سے اطمینان حاصل ہوتا ہے اور مسلسل آمدنی کا ذریعہ بن جاتا ہے ۔

(۲) رأس المال پر ٹیکس لگانے میں یہ خوبی ہے کہ یہ ٹیکس تمام دولتوں کو شامل ہوجاتا ہے، بعض وہ دولتیں ہوتی ہیں جن کی آمدنی نہیں ہوتی جس کی وجہ سے آمدنی پر ٹیکس لگانا ممکن نہیں رہتا جیسے قیمتی تحائف، زیورات، ہیرے، جواہرات اور نقد اموال، ایسی دولت سے قومی سطح پر فائدہ حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ خود اس پر بھی ٹیکس لگا دیا جائے ۔

(۳) رأس المال بسا اوقات معطل اور بیکار پڑا رہتا ہے، مالک اسے نہ استعمال کرتا ہے اور نہ کام میں لاکر ملک وملت کو نفع دیتا ہے، اس پر ٹیکس لگ جائے تو مالک کو خطرہ پیدا ہوگا کہ بار بار ٹیکس لگانے سے مال ہی ختم نہ ہوجائے۔ اس لئے اس کے دل میں داعیہ پیدا ہوگا اور وہ اسے نفع بخش کاموں میں لگائے گا ۔

(۴) رأس المال پر ٹیکس لگانے سے حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ چونکہ سرکاری آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے، اس لئے حکومت آمدنی پر ٹیکسوں کی مقداروں اوراس کی بڑھتی ہوئی شروح ہیں تخفیف کردیتی ہے، اس طرح سے آمدنی کے ٹیکس کی شرح میں چھوٹ مل جاتی ہے۔

(۵) رأس المال پر ٹیکس لگانے کا بوجھ صرف مالکوں کو اٹھانا پڑتا ہے، اس ٹیکس کی زد ان غیر مالک (Not Haves) طبقوں پر نہیں پڑتی جو صرف اپنے عمل اورجسمانی محنت سے روزی حاصل کرتے ہیں اوران کے پاس رأس المال جمع نہیں ہوتا اور یہ بات قرین انصاف بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ اشتراکی نقطہ نظر سے رأس المال پر لگائے جانے والے ٹیکس کو ایک ''اصلاحی ٹیکس'' تصور کیا جاتا ہے۔

دلائل عدم جواز اور خرابیاں

سرمایہ دارانہ نظام کے حامی ماہرین اقتصادیات رأس المال پر ٹیکس لگانے کے مخالف ہیں، اوروہ اس پر مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتے ہیں۔

(۱) رأس المال اورسرمایہ پر ٹیکس عائد کرنے سے بچت کرنے اورسرمایہ کو پیداواری کاموں میں لگانے کی دلچسپی کم ہوجاتی ہے، بالخصوص غیر منقولی اشیاء جیسے مکانات، گھروں، دوکانوں، جائیدادوں اورکارخانوں پر ٹیکس عائد کرنے سے بہت نقصان ہوتا ہے، لوگوں کی ہمتیں پست ہوتی ہیں، سرمایہ بنانے کا داعیہ ختم ہوتا ہے اورلوگ اپنی آمدنیوں کو اثاثوں، جائیدادوں اوررأس المال میں تبدیل کرنے کی بجائے، انہیں خرچ کرنا شرع کردیتے ہیں۔

(۲) ہر رأس المال پر ٹیکس نہ ممکن ہے اور نہ کوئی اس کا قائل ہے، اس لئے

اس کیلئے قابل ٹیکس راس المال کی تحدیدی ضروری ہے اور اس کی تحدید ناممکن نہ ہو تودشوار ضرور ہے۔ اول تو راس المال اوراس کی حقیقت و طبیعت کے بارے نظریات کا اختلاف ہے، دوسرے اگر حقیقت پر اتفاق بھی ہوجائے تو ہر مالک کی تمام شخصی ملکیتوں کا حقیقی علم بہت دشوار ہے، سب کو معلوم ہے کہ اس سلسلے میں ٹیکس دہندگان دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں، ان کے بیانات وکوائف حتی کہ حلف نامے بھی درست نہیں ہوتے، اس لئے وہ عام اثاثوں کو کم ظاہر کرتے ہیں اور نقود کو چھپالیتے ہیں، اس لئے ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) آمدنی کے مقابلہ میں راس المال پر ٹیکس دیرپا نہیں ہوتا، آمدنی کا سلسلہ چلتا رہتا ہے لیکن راس المال ختم ہوسکتا ہے، اگر مالک ختم نہ کریں تو بھی ٹیکس کی وجہ سے اس میں کمی آتی رہے گی، اور اس کا نتیجہ سرمایہ کے ختم ہونے پر بھی ہوسکتا ہے، چنانچہ پڑے ہوئے راس المال سے ٹیکس کی صورت میں جتنا سرمایہ لیا جائے گا اس سے راس المال کم ہوگا اور ختم بھی ہوسکتا ہے، اس طرح کے مسلسل ٹیکس سے ایک طرف تو مالکوں کی انفرادی دلچسپی کم ہوگی، دوسری طرف ٹیکس کی آمدنی بھی کم ہوجائے گی۔

ملحوظ امور اور رعایت

مذکورہ خرابیوں کے پیش نظر بعض ماہرین نے درمیانی صورت نکالی ہے یعنی راس المال پر اس طرح ٹیکس لگایا جائے کہ مانعین نے جو خرابیاں بیان کی ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں اور مجوزین نے جو خوبیاں بیان کی ہیں وہ بھی حاصل ہو جائیں، اس سلسلے میں ان ماہرین نے راس المال پر ٹیکس لگانے کی کچھ شرائط عائد کی

ہیں، ان شرائط کی رعایت ضروری ہے وہ شرائط یہ ہیں۔

(۱) ٹیکس کی شرح عادلانہ منصفانہ ہو، فریقین کے حق میں مناسب ہو، اتنی زیادہ نہ ہو کہ اصل سرمایہ کا ایک بڑا حصہ اس میں لگ جائے اور بالکل کم بھی نہ ہو کہ ٹیکس کا بنیادی مقصد اس سے پورا نہ ہو سکے، حاصل اس کا یہ بنتا ہے کہ ٹیکس کی شرح اتنی ہو جو اس کی آمدنی سے پوری ہو سکے، اصل سرمایہ پر ٹیکس نہ پڑے۔

(۲) صرف راُس المال اور سرمایہ پر ٹیکس عائد نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ دوسرے ٹیکس بھی ہوں، بالخصوص آمدنی پر ٹیکس۔

(۳) ایک مخصوص حدو مقدار تک سرمایہ وآمدنی ٹیکس سے مستثنیٰ ہو، جب سرمایہ وآمدنی اس مقدار سے تجاوز کرے تو ٹیکس عائد کیا جائے۔

(۴) قرض اور رہن وغیرہ کو راُس المال و سرمایہ سے مستثنیٰ کر کے باقی ماندہ پر ٹیکس عائد کیا جائے۔

(۵) جو افراد خود کمائی پر قدرت نہ رکھتے ہوں ان کا راُس المال ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے تا کہ ان کا سرمایہ ختم نہ ہو جیسے بچوں، مجنوں، اور پاگلوں کا راُس المال۔

راُس المال پر زکوۃ

شرعاً راُس المال پر فی الجملہ زکوۃ عائد ہوتی ہے، اور شریعت نے اس پر زکوۃ اس انداز سے عائد کی ہے کہ ماہرین اقتصادیات نے اس پر ٹیکس عائد کرنے کی جو شرائط لکھی ہیں وہ بھی ملحوظ ہیں، اس اعتبار سے راُس المال پر ٹیکس عائد کرنے کے جو فوائد ومحاسن ہیں وہ زکوۃ واجب کرنے سے حاصل ہو جاتے ہیں اور جو خرابیاں

ہیں وہ ختم ہو جاتی ہیں۔

زکوۃ میں مذکورہ امور و شرائط کی رعایت

رأس المال پر وجوب زکوۃ میں جن امور و شرائط کی رعایت کی گئی ہے وہ امور مندرجہ ذیل ہیں۔

(ا) رأس المال بلکہ ہر قسم کے قابلِ زکوۃ اثاثوں میں زکوۃ کی شرح انتہائی مناسب ہے، رأس المال، سرمایہ، نقود، اور تجارتی سامان میں صرف چالیسواں حصہ ڈھائی فیصد زکوۃ واجب ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ایک انتہائی معتدل شرح ہے، اسی طرح مویشی اور جانوروں کی زکوۃ میں بھی ڈھائی فیصد کی رعایت موجود ہے جس کی وضاحت تنا سبی وتصاعدی ٹیکس کی بحث میں آرہی ہے، زکوۃ کی یہ شرح بذات خود بڑی مناسب تھی لیکن شریعت نے اس کے ساتھ مزید رعایتیں بھی دے دیں جن کی وجہ سے زکوۃ کی مذکورہ شرح کی ادائیگی اصل رأس المال سے نہ ہوگی بلکہ اس کی آمدنی سے ہوگی اور رأس المال بدستور باقی رہے گا۔ ان میں سے ایک رعایت یہ ہے کہ ہر رأس المال پر زکوۃ واجب نہیں بلکہ مال نامی (GROWING WEALTH) پر ہی واجب ہے، اس رعایت و شرط کا مقصد یہی ہے کہ اصل سرمایہ محفوظ اور باقی رہے، آمدنی اور اضافہ زکوۃ میں دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ رہائشی گھروں، استعمال کے کپڑوں، گھریلو سامان، سواری کے جانوروں اور گاڑیوں، ہتھیاروں، آلات صنعت وحرفت اور کتابوں پر زکوۃ واجب نہیں ہے کیونکہ یہ اموال نامی نہیں، اگر ان پر زکوۃ فرض ہو تو زکوۃ میں اصل رأس المال دینا پڑے گا اور رأس المال کا بڑا حصہ زکوۃ میں خرچ ہو جائے گا۔

دوسری رعایت یہ ہے کہ رأس المال پر سال گزرنا شرط ہے اور سال گزرنے پر بھی ایک بار زکوۃ فرض ہے، اس میں تکرار مشروع نہیں ہے۔حولانِ حول یعنی سال گزرنے کی شرط کا مقصد بھی یہی ہے کہ مالک کو آمدنی حاصل کرنے کا موقعہ مل جائے، اور پھر اس آمدنی اور افزائش سے زکوۃ ادا کی جاسکے۔

خلاصہ یہ کہ شرعاً تعبیر تو یہی کی جاتی ہے کہ زکوۃ رأس المال پر ہے لیکن ادائیگی عموماً آمدنی سے پوری ہوجاتی ہے اور اصل رأس المال محفوظ رہتا ہے۔

فی الهداية (١٨٥/١) اول كتاب الزكوة،ولا بد من الحول لانه لابد من مدة يتحقق فيها النماء وقدر ها الشرع بالحول لقوله عليه السلام لازكوة في مال حتى يحول عليه الحول ولانه الممكن به من الاستنماء لا شتماله على الفصول المختلفة والغالب تفاوت الا سعار فيها فادير الحكم عليه ....وليس في دور السلكنى وثياب البدن واثاث المنزل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكوة لانها مشغولة بالحاجة الاصلية وليست بنامية ايضاً وعلى هذا كتب العلم لاهلها والات المحترفين لما قلنا.

تیسری رعایت یہ ہے کہ مویشی میں زکوۃ اس وقت واجب ہے جبکہ وہ سائمہ ہوں یعنی سال کے اکثر حصے میں وہ جنگل، صحرا اور چراگاہوں میں چر کر گزارہ کرتے ہوں، اگر سال کے آدھے یا زائد حصہ میں جانور گھریلو چارے پر پلتے ہوں تو ان پر زکوۃ واجب نہیں ہے، اگرچہ وہ سینکڑوں میں ہوں۔

فی الدر(٢٧٥/٢)باب السائمة،هی الرّاعية وشرعاً المكتفية

بالرعی المباح فی اکثر العام لقصد الدر والنسل ولوعلفها نصفه لا تکون سائمة فلا زکوۃ فیها للشک فی الموجب.

چوتھی رعایت یہ ہے کہ جو رأس المال کسب وآمدنی کا باقی رہنے والا ذریعہ اور آلہ ہوخوداس پرزکوۃ واجب نہیں ہے،وہ زکوۃ سے مستثنی ہے،زمین،مکان دوکان،گاڑی،جو کرایہ پر دیئے ہوں،خودان پرزکوۃ واجب نہیں۔

(۲)شریعت کی رو سے صرف رأس المال پر زکوۃ فرض نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ دوسری اشیاء پربھی زکوۃ فرض ہے جیسے آمدنی اوراشخاص پر زکوۃ جس کی وضاحت عنقریب آرہی ہے نیز زکوۃ کے علاوہ بھی اسلامی بیت المال کے متعدد ذرائع آمدن ہیں جیسے جزیہ،خراج،مال فئی،خمس،ہدایا،صدقات ، کراء الارض،وقف، اموال فاضلہ ،عشور اور جائز منصفانہ ضرائب اورٹیکس،لہٰذااس امرکی رعایت شریعت نے کردی ہے۔

(۳) شریعت کی رو سے ہرکم وبیش سرمایہ پرزکوۃ فرض نہیں بلکہ اس کا ایک نصاب مقرر ہے،نصاب سے کم اموال زکوۃ سے مستثنی ہیں،زکوۃ کے نصاب کا خلاصہ یہ ہے:سونا۲۰دینار =ساڑھے سات(۲/۱،۷)تولہ =۷۹،۴۷،۸۷،گرام۔چاندی ۲۰۰درہم،۲/۱،۵۲ تولہ =۳۵،۶۱۲گرام یا مالِ تجارت یا نقدی یا ان چار اشیاء یا ان میں سے بعض کا مجموعہ سونے یا چاندی کے مذکورہ وزن کی قیمت کے برابر ہوجائے ۔ اس وقت ۳۵،۶۱۲ گرام چاندی کی قیمت تقریباً تیس ہزار روپے ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس سے کم رقم پر زکوۃ فرض نہیں ہے،وہ زکوۃ سے مستثنی ہے۔

نیز شرعاً زکوۃ صرف پانچ قسم کے رأس المال پرفرض ہے (۱) سونا (۲)

چاندی(۳)مالِ تجارت (۴)نقدی(۵)مال مویشی،ان کو قابلِ زکوۃ اموال کہا جاتا ہے،ان کے علاوہ جتنے اموال ہیں ان میں زکوۃ فرض نہیں ہے،انہیں نا قابلِ زکوۃ اموال و اثاثہ جات کہاجاتا ہے،جیسے زمین،جائیدااور ضرورت کی تمام اشیاء، گویہ کہ اس قسم کے تمام اثاثے بھی زکوۃ سے مستثنیٰ ہیں خواہ وہ کم ہوں یا زیادہ۔

فی اعلاء السنن (۹/۵۵)ابواب زکوۃ الاموال،باب زکوۃ الفضۃ ،عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال:قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: قد عفوت عن صدقۃ الخیل والرقیق،فھاتوا صدقۃ الرقۃ من کل اربعین درھما درھم ولیس فی تسعین وماتہ شی ، فاذا بلغت ماتین ففیھا خمسۃ دراھم.رواہ الترمذی(۱/۸۳)

وفیہ ایضا (۹/۵۸) باب نصاب الذھب،عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ....فاذا کانت لک مائتادرھم وحال علیھا الحول،ففیھا خمسۃ دراھم ولیس علیک شئی یعنی فی الذھب حتی یکون لک عشرون دینارا فاذا کانت لک عشرون دینارا وحال علیھا الحول ففیھا نصف دینار(الحدیث راوہ ابوداؤد(۱/۲۲۸)

(۴) شریعت کی رو سے رہن اور قرض کے بقدررقم مال سے مستثنیٰ کر کے باقی ماندہ مال کی زکوۃ ضروری ہے، رہن کی زکوۃ نہ راہن پر واجب ہے اور نہ مرتہن پر،اسی طرح ایک شخص کے پاس مثلاً ایک لاکھ روپیہ ہے لیکن اس پر مثلاً چالیس ہزار روپیہ قرض و دین ہے تو وہ قرض کی رقم منہا کر کے باقی رقم یعنی صرف ساٹھ ہزار کی زکوۃ دے گا۔

فی الدر(۲/ ۲۶۳)اول کتا ب الزکوۃ،فلا زکوۃ علی مکاتب ....ولا فی مرھون بعد قبضہ ولا فیما اشتراہ لتجارۃ قبل قبضہ ومدیون للعبد بقدر دینہ فیزکی الزائد ان بلغ نصابا.

وفی الشامیۃ:(قولہ ولا فی المرھون) ای لا علی المرتھن لعدم ملک الرقبۃ ولا علی الراھن لعدم الید واذا استردہ الراھن لا یزکی عن السنین الماضیۃ ....الخ

(۵)شریعت کی رو سے بچے اور مجنون کے مال پر زکوۃ واجب نہیں ہے،ان کا رأس المال زکوۃ سے مستثنیٰ ہے۔

انظر التفصیل فی اعلاء السنن (۹/ ۶)باب لیس علی الصبی والمجنون زکوۃ،منہ ماروی عن عائشۃؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال:رفع القلم عن ثلاثۃ عن النائم حتی یستیقظ وعن الصبی حتی یحتلم وعن المجنون حتی یعقل.اخرجہ ابوداؤد والنسائیؒ وابن ماجۃ ورواہ الحاکم فی المستدرک وقال علی شرط مسلم .

اس تفصیل سے ایسا لگتا ہے کہ ماہرین اقتصادیات نے رأس المال پر ٹیکس لگانے کی مذکورہ منصفانہ اور اصلاحی شروط اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں لگائی ہیں اوراگران کو دعوٰی ہے کہ ہم نے اسلامی تعلیمات سے استفادہ نہیں کیا تو انہیں معلوم ہوجانا چاہئے کہ انہوں نے مختلف مراحل طے کرنے کے بعد اس تہذیب یافتہ،اور ترقی کے دور میں جدید ترین نظام ٹیکس جو وضع کیا ہے اور جس نہج تک ان کے فکر کی اب رسائی ہوئی ہے اسلام نے چودہ سال پہلے یہی تصور پیش کردیا تھا بلکہ اس سے

بھی کہیں بہتر تھا۔

آمدنی پر ٹیکس

آمدنی پر ٹیکس کے سلسلے میں ماہرین اقتصادیات کی دو رائیں پائی جاتی ہیں بعض اس پر ٹیکس لگانے کے قائل ہیں اور بعض قائل نہیں ہیں ۔ دونوں فریقوں نے اپنے موقف پر دلائل پیش کئے ہیں البتہ موجودہ دور میں ماہرین اقتصادیات اس بات پر تقریباً متفق ہیں کہ آمدنی پر ٹیکس لگانا چاہیے اور جدید ریاستوں میں اس پر عملاً ٹیکس لگایا جاتا ہے اور ماہرین مالیات نے آمدنی پر ٹیکس لاگو کرنے کیلئے کچھ اصلاحی شروط مقرر فرمائی ہیں جن کی رعایت ضروری قرار دی گئی ہے ۔ ان میں سے بعض شرائط تو وہی ہیں جو راٗس المال پر ٹیکس لاگو کرنے کے سلسلے میں گزر چکی ہیں، اور بعض مزید بھی ہیں۔

(۱) ٹیکس کی شرح مناسب اور کم ہو، اتنی زیادہ نہ ہو کہ ساری آمدنی اسی میں خرچ ہوجائے ۔

(۲) صرف آمدنی پر ہی ٹیکس نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ دیگر اشیاء پر بھی ٹیکس لاگو کرنا چاہئے ۔

(۳) ایک مخصوص حد تک آمدنی ٹیکس سے مستثنی ہو۔

(۴) ٹیکس صافی آمدنی (Net Profit) پر لاگو کرنا چاہئے، اجمالی آمدنی اور منافع پر نہیں، تاکہ اخراجات آمدنی سے ادا ہوسکیں ۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ مثلاً کمپنی نے ایک لاکھ سے کاروبار کیا اور چھ ماہ کے بعد اس نے حساب کیا تو معلوم ہوا کہ ایک لاکھ مزید کما لیا ہے، تو ایک لاکھ اجمالی

آمدنی ہے،اب اس کمپنی کے اخراجات بھی ہوں گے جیسے مزدوروں اور عملہ کی تنخواہ، بجلی،گیس وغیرہ کا بل۔منصفانہ ٹیکس کا اصول یہ ہے کہ ایک لاکھ آمدنی سے یہ اخراجات منہا کر لیئے جائیں،اور جو صافی اور خالص آمدنی بچے صرف اسی پر ٹیکس لگا یا جائے،پورے ایک لاکھ پر نہیں۔

آمدنی پر زکوۃ

شریعت کی رو سے آمدنی پر بھی زکوۃ واجب ہوتی ہے جیسے (۱) زمین رأس المال ہے اور اس کی آمدنی زرعی پیداوار ہے اور پیداوار میں عشر یا نصف عشر واجب ہے (۲) تنخواہ ایک آمدن ہے اس پر بھی زکوۃ واجب ہوسکتی ہے (۳) شہد پر زکوۃ واجب ہے (۴) اجرت وکرایہ پر دی گئی زمین،مکان،دکان، گاڑی،اور دیگر اشیاء کا جو کرایہ ملتا ہے اس پر بھی زکوۃ واجب ہے۔

زکوۃ میں مذکورہ شروط کی رعایت

ماہرین مالیات نے آمدن پر ٹیکس لاگو کرنے کی جو منصفانہ شرائط ذکر کی ہیں،ان شروط کی رعایت زکوۃ میں بھی رکھی گئی ہے بلکہ ان سے زیادہ رعایت وسہولیات دی گئی ہیں،پہلی تین شرائط کے بارے رأس المال پر وجوب زکوۃ کے بیان میں تفصیل آچکی ہے۔یعنی کہ آمدنی پر زکوۃ بلا شبہ واجب ہے لیکن زکوۃ کی مقدار بالکل مناسب ہے،ساری آمدنی ہرگز زکوۃ میں خرچ نہیں ہوتی اور شرعاً زکوۃ صرف آمدنی پر واجب نہیں بلکہ دوسری اشیاء پر بھی واجب ہے اور ہر کم بیش آمدنی پر زکوۃ واجب نہیں بلکہ اس کیلئے ایک مخصوص نصاب متعین ہے۔

آمدنی پر زکوۃ کے وجوب میں چوتھی شرط کی رعایت اس طرح ہے کہ شریعت کی رو سے زکوۃ صرف ”صافی منافع“ پر واجب ہے،کل اجمالی منافع پر واجب نہیں ہے،شریعت کی رو سے اصل نفع اور آمدنی وہی کہلاتی ہے جو تمام اخراجات منہا کرنے کے بعد بچے، اس طریقہ سے کسی بھی تجارت پر آنے والے اخراجات آمدنی سے پورے ہوں گے، اصل سرمایہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

شریعت نے مزید رعایت یہ دی ہے کہ کمانے والا اگر پہلے سے صاحب نصاب نہ تھا تو آمدنی پر فی الحال زکوۃ واجب نہ ہوگی، بلکہ سال کے بعد واجب ہوگی اوراگر وہ صاحب نصاب ہے تو جس تاریخ کو وہ دوسرے اموال کی زکوۃ دیتا ہے آمدنی کی زکوۃ بھی اس تاریخ کو دے گا،اس سے پہلے اس پر زکوۃ واجب نہیں نیز آمدنی کی رقم پر بھی زکوۃ اس وقت ہے جبکہ مقررہ تاریخ تک وہ باقی ہو لہٰذا اگرکوئی شخص آمدنی لیکر خرچ کردیتا ہے تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی،مزید یہ کہ جو آمدنی مقررہ تاریخ تک وصول ہوچکی ہو اس پر زکوۃ واجب ہے،اگر ابھی تک وصول نہ ہوئی ہوتو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہے جیسے ملازم کی تنخواہ،مکان،دوکان،اور جائیداد کا کرایہ، شریعت کی رو سے دین ضعیف یا متوسط ہے،اگرکسی نے مہینہ کے درمیان میں زکوۃ ادا کرنی ہو اور اسے کرایہ اور تنخواہ مہینہ کے آخر میں ملے تو اس میں زکوۃ واجب نہ ہوگی۔

اشخاص پر ٹیکس

اشخاص ونفوس پر ٹیکس کا مطلب یہ ہے کہ ملک کا ہر باشندہ ایک مخصوص مقدار میں حکومت کو کچھ رقم دے اور اس کی بنیاد محض یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک شخص اور

زد ہے،ٹیکس بلاامتیاز سب باشندوں سے لیا جاتا ہے،اس میں مرد عورت اور بچے سب شمار کئے جاتے ہیں،نسل، مذہب اور علاقے کی کوئی خصوصیت نہیں ہوتی،البتہ بعض اوقات کچھ قانونی شرائط بھی لگائی جاتی ہیں جیسے سیاسی اہلیت کی شرط یا اقلیت کا فرد ہونا وغیرہ جن افراد میں وہ شرائط موجود ہوں ان سے ٹیکس لیا جاتا ہے اور جن میں وہ شرائط نہ پائی جاتی ہوں ان سے ٹیکس نہیں لیا جاتا۔

اس ٹیکس کے عائد کرنے میں بھی ماہرین اقتصادیات کی دو رائیں ہیں بعض اس کے قائل ہیں اور بعض اس کے مخالف،دونوں فریقوں کے دلائل اس نوعیت کے ہیں جو پہلے رأس المال اور آمدنی پر ٹیکس کے سلسلے میں بیان ہو چکے ہیں مخالفین مزید مندرجہ ذیل دلائل دیتے ہیں۔

(۱) ہر شخص پر اس کی ذات کی وجہ سے ٹیکس لاگو کرنا اصول مقدرت کے خلاف ہے اور اصول مقدرت مسلمہ اصول ہے۔

(۲)اس میں ٹیکس دہندہ کی اہلیت اور قابلیت ملحوظ نہیں رکھی جاتی جو کہ ظلم و زیادتی ہے۔

(۳)رأس المال و آمدنی خود مال ہے جس پر ٹیکس عائد کرنا سمجھ میں آتا ہے کہ اسی مال سے ٹیکس ادا کردیا جائے گا۔لیکن شخص و فرد خود مال نہیں اس پر ٹیکس لگانے کے کیا معنیٰ؟

اس ٹیکس کے قائلین مزید مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتے ہیں۔

(۱)اس سے حکومتی محصول میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۲)یہ ٹیکس چونکہ ہر فرد پر عائد ہوتا ہے،اس لئے مالیاتی اداروں کو اس

تشخیص کی ضرورت نہیں کرنی پڑتی کہ کون ٹیکس دہندہ ہے اورکون نہیں اور یہ تحقیق بھی نہیں کرنی پڑتی کہ کس نے حقیقی اثاثوں کوظاہر کیا ہے اور کس نے غلط بیانی کی ہے؟

(۳) اس ٹیکس سے قوم وافراد میں اجتماعی شعور پیدا ہوتا ہے اور انہیں یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ معاشرے کی مشترکہ ذمہ داریوں میں سب برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

بعض مغربی ممالک،امریکہ کی کچھ ریاستوں اور فرانس وغیرہ میں یہ ٹیکس عملاً عائد کردیا گیا ہے اور اس کی آمدنی تعلیم،سڑکوں اور دوسرے مشترکہ مفادات پر خرچ کی جاتی ہے اور جو شہری اس ٹیکس سے بچنا چاہے اسے تین دن سڑکوں اور راستوں کی مرمت کی خدمت انجام دینی پڑتی ہے۔

اشخاص پر زکوۃ

شریعت کی رو سے زکوۃ محض ایک مالی عبادت ہے لہٰذا شرعاً اشخاص پر زکوۃ کا کوئی تصور موجود نہیں ہے اور اس کی تائید میں وہ تمام دلائل پیش کیے جاسکتے ہیں جو اس ٹیکس کے مخالفین نے پیش کیے ہیں یعنی اشخاص پر ٹیکس اور زکوۃ عائد کرنا اصول مقدرت کے خلاف ہے،اس میں افراد کی اہلیت ملحوظ نہیں ہوتی وغیرہ اور اس ٹیکس کے قائلین اس کے جو فوائد اور مقاصد بیان کرتے ہیں شریعت میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے جس کا خلاصہ ترتیب وار مندرجہ ذیل ہے۔

(۱)زکوۃ ایک خالص اسلامی عبادت ہے،اس کا مقصد حکومت کا خزانہ اور تجوری بھرنا ہرگز نہیں ہے،یہی وجہ ہے کہ اموال ظاہرہ اور باطنہ کی زکوۃ شخصی

طور پر دینے سے ادا ہو جاتی ہے، حکومت کو دینا ضروری نہیں ہے۔

ہاں حکومت کے جائز اخراجات بلاشبہ موجود ہوتے ہیں اورزکوۃ سمیت دیگر کئی ذرائع سے انہیں پورا کیا جاسکتا ہے۔

(۲) شرعاً ٹیکس کے محکمہ اورعملہ وملازمین کا تصور ہی موجود نہیں ہے، چہ جائے کہ انکی سہولت پسندی اورراحت طلبی کیلئے عوام پر بلا امتیاز مالی تاوان عائد کر دیا جائے۔

(۳) اجتماعی شعور پیدا کرنا اورقوم کومشترکہ ذمہ داریوں کا احساس دلانا واقعی صحیح مقصد ہے لیکن اشخاص پرٹیکس عائد کرنا اس کا واحد طریقہ نہیں ہے اوربھی بہت سے طریقے ہیں جیسے فطری رجحان، مذہبی فریضہ، تعلیم کی فراوانی، اموال پر زکوۃ نیز جیسا کہ مختلف مواقع جہاد، اور غزوات میں مال کی ضرورت پڑی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کوجمع فرماکر چندہ کی ترغیب دی اوراس سے اجتماعی ذمہ داری بطریق احسن پوری ہوگئی، نیزاس گئے گزرے دور میں بھی افرادقوم کو اس ٹیکس کے بغیر اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے، جس کی تازہ مثال گزشتہ سے پیوستہ سال لرزہ خیز زلزلہ کے موقعہ پر سامنے آئی، قوم نے جس جذبہ سے امداد میں حصہ لیا ہے وہ بلاشبہ اجتماعی شعور کی واضح علامت ہے۔

اشخاص پرٹیکس کی نظیر صدقۃ الفطر

صدقۃ الفطر نہ زکوۃ ہے اور نہ ٹیکس ہے، یہ ایک مستقل اسلامی عبادت ہے،

اس لئے اس کو نہ اشخاص پر ٹیکس سے تعبیر کرنا جائز ہے اور نہ مطلق زکوۃ سے، ہاں البتہ اسے اشخاص پر ٹیکس کی ایک نظیر شمار کیا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ عبادت اسلامی نقطہ نظر سے رؤس یعنی اشخاص وافراد پر عائد کی گئی ہے اور یہ ایک ایسی منصفانہ مالی عبادت ہے کہ اشخاص پر ٹیکس کے ناقدین نے جو خرابیاں بیان کی ہیں وہ اس میں موجود نہیں ہیں۔ جس کا خلاصہ بالترتیب یہ ہے کہ:

(۱) صدقۃ الفطر اصول مقدرت کے بالکل مطابق ہے، کیونکہ اس میں فرد کی مالی حیثیت ملحوظ رکھی گئی ہے، یعنی اس کا ایک نصاب مقرر ہے جس کے پاس نصاب سے کم مال ہو اس پر صدقۃ الفطر واجب نہیں ہے، نیز صدقۃ الفطر کی مقدار اتنی کم ہے کہ کوئی غیر منصف آدمی بھی اسے زیادتی سے تعبیر نہیں کرسکتا یعنی سال کے بعد صرف دو کلو گندم یا اس کی قیمت جو اس وقت تقریبا ۴۰ روپے بنتی ہے، گویا کہ ماہانہ ساڑھے تین روپے، صدقۃ الفطر کا نصاب وہی ہے جو زکوۃ کا ہے البتہ صدقۃ الفطر کی مقدار زکوۃ کے مقابلہ میں بہت کم ہے اور یہی مقدار امیر ترین شخص بھی ادا کرسکتا ہے، اس لئے زکوۃ اور صدقۃ الفطر کے نصاب میں یہ فرق رکھا گیا ہے کہ ضرورت سے زائد اشیاء پر زکوۃ واجب نہیں ہے اور نہ ان کی قیمت کو زکوۃ کا نصاب پورا کرنے کیلئے شمار کیا جاتا ہے لیکن صدقۃ الفطر کا نصاب پورا کرنے میں ضرورت سے زائد اشیاء کی قیمت بھی ملائی جاتی ہے، اگرچہ اس کے تناسب سے مزید صدقۃ الفطر واجب نہیں ہوتا مثلاً اس وقت زکوۃ اور صدقۃ الفطر کا نصاب تیس ہزار روپے ہے، فرض کریں ایک شخص کے پاس اٹھائیس ہزار نقد موجود ہیں اور پانچ ہزار کا ٹی وی موجود ہے جو ضروریات سے زائد شمار کیا جاتا ہے، شرعاً اس شخص پر زکوۃ واجب نہیں

ہے کیونکہ اس کے پاس نصاب پورا نہیں ہے لیکن صدقۃ الفطر واجب ہے کیونکہ ٹی وی کی قیمت بھی ملانی پڑے گی، اس طرح اس کا نصاب پورا ہو جاتا ہے۔

حاصل یہ کہ صدقۃ الفطر میں اصول مقدرت کوئی اعتبار سے ملحوظ رکھا گیا ہے مثلاً (۱) صدقۃ الفطر صرف صاحب نصاب پر واجب ہے (۲) اس کی مقدار بہت کم ہے وغیرہ۔

(۲) صدقۃ الفطر میں صدقہ دہندہ کی اہلیت کو مدنظر رکھا گیا ہے، چنانچہ صدقۃ الفطر صرف مسلمان آزاد پر واجب ہے، کافر اور غلام پر واجب نہیں ہے، کافر اس کا اہل نہیں ہے اور غلام کی ملکیت میں مال نہیں ہوتا لہٰذا شریعت اسے اہل تصور نہیں کرتی، نیز جب اس کے پاس مال نہ ہوگا تو اس پر صدقۃ الفطر واجب کرنا اصول مقدرت کے بھی خلاف ہوگا۔

(۳) اس کے وجوب کا تعلق تو رؤوس سے ہے لیکن مالاً ادائیگی مال ہی سے ہوتی ہے، اور رؤوس کے ساتھ اموال کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ رؤوس اور شخص موجود ہو لیکن اس کے پاس مال نہ ہو تو اس پر صدقۃ الفطر واجب نہیں ہوگا، بخلاف اشخاص پر ٹیکس کے کہ اس کا تعلق صرف شخص سے ہے، مال کو ملحوظ رکھا ہی نہیں جاتا۔

مقاصد واہداف

صدقۃ الفطر کے وہ مقاصد بھی نہیں ہیں جو اشخاص پر ٹیکس عائد کرنے کے ہیں، کیونکہ جیسا کہ پہلے آچکا کہ وہ مقاصد شرعاً مقاصد ہی نہیں ہیں بلکہ صدقۃ الفطر کے دوسرے شرعی مقاصد ہیں مثلاً:

(۱) یہ مالی عبادت ہے،اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔

(۲) صدقۃ الفطر رمضان کے اختتام پر دیا جاتا ہے،اس طرح رمضان کے روزوں اور تراویح میں جو کمی کوتاہی ہوتی ہے صدقۃ الفطر سے اس کا تدارک ہوجاتا ہے،بچوں کے حق میں کوئی کمی کوتاہی نہیں ہوتی لیکن والد ان کی طرف سے صدقۃ الفطر ادا کر کے اپنی عبادت کی کمی کوتاہی پوری کرتا ہے۔

(۳)رمضان کے اختتام پر ایک اسلامی تہوار چھوٹی عید منائی جاتی ہے، صدقۃ الفطر کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اغنیاء اس موقعہ پر فقراء اور مساکین کو صدقہ فطر دیکر خوشیوں میں شریک کریں،یہی وجہ ہے کہ عید گاہ جانے سے پہلے صدقۃ الفطر دینا مستحب ہے۔

نیز رمضان شروع ہونے کے بعد،عید سے پہلے بھی دے سکتے ہیں،تاکہ غرباء اپنی ضروریات پوری کرسکیں۔

(۴)اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان کو تنگی اور فراخی ہر حالت میں خرچ کرنے کی عادت رہے اور ضرورت پڑنے پر خرچ کرنے سے گریز نہ کرے۔

عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال:فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زکوۃ الفطر طھرۃ للصائم من اللغو والرفث وطعمۃ للمساکین فمن اداھا قبل الصلوۃ فھی زکوۃ مقبولۃ ومن اداھا بعد الصلاۃ فھی صدقۃ من الصدقات.اخرجہ ابوداؤدوابن ماجۃ والدارقطنی والحاکم وصححہ.

وفی مصنف عبدا لرزاق بسند صحیح عن عبد اللہ بن ثعلبۃ قال:

خطب رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم قبل یوم الفطر بیوم اویومین فقال:ادوا صاعامن بر.

وفی صحیح البخاری،کتاب الزکوة،عن ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنه قال:فرض رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم زکوة الفطر صاعا.....وأمر بها ان تؤدی قبل خروج الناس الی الصلوة.

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ"المصالح العقلیة للاحکام النقلیة(۲/۱۱۰)میں صدقۃ الفطر کی حکمت ومقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

(۱)صدقۃ الفطرشریعت میں اس واسطے مقرر کیا گیا ہے کہ اول تواس کے سبب عیدالفطر کے شعار الٰہی میں سے ہونے کی تکمیل ہوتی ہے،دوسرے یہ کہ اس میں روزہ داروں کے لئے طہارت اور ان کے روزہ کی تکمیل ہے،جس طرح کہ نماز میں فرائض کی تکمیل کے لئے سنتیں مقرر کی گئی ہیں ایسا ہی یہ صدقہ مقرر ہوا۔

(۲) اغنیاء اور دولت مندوں اور ذی وسعت لوگوں کے گھروں میں تواس روزعید ہوتی ہے مگر مسکین اور مفلسوں کے گھروں میں بوجہ ناداری کے اسی طرح سے مثل صوم موجود ہوتی ہے،لہٰذا خدا تعالیٰ نے ذی وسعت لوگوں پر بوجہ شفقت علی خلق اللہ لازم ٹھہرایا کہ مساکین کوعید سے بیشتر صدقہ دیدیں تاکہ وہ بھی عید کریں یہاں تک کہ نمازعید پڑھنے سے پیشتر ہی ان کو صدقہ دینا لازم ٹھہرایااوراگرمساکین کثرت سے ہوں تو یہ صدقہ خاص جگہ جمع کرنے کا ایماء ہوا تاکہ مساکین کویقین ہو جائے کہ ہمارے حقوق کی حفاظت کی جاوے گی۔

ٹیکس کے اصول

ماہرین معاشیات وٹیکس نے ٹیکس عائد کرنے اور محصولات کے کچھ اصول لکھے ہیں جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

(ا)اصولِ مساوات: (Camon of Equity) یہ نظام ٹیکس کا اہم اور بنیادی اصول ہے اور اسی اصول میں عدل و انصاف کے تقاضوں کی رعایت پیش نظر ہوتی ہے،اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ ملک کا ہر باشندہ اپنی اپنی استطاعت اور توفیق کے مطابق ٹیکس ادا کرے،زیادہ آمدنی والے افراد زیادہ شرح سے ٹیکس دیں اور کم آمدنی والے افراد کم شرح سے، گویا کہ اس اصول کا تقاضا ''متزاید ٹیکس'' سے پورا ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے جیسے کسی کی آمدنی بڑھتی جائے ٹیکس کی شرح بھی بڑھتی جائے۔

اس اصول سے یہ مراد نہیں ہے کہ متناسب ٹیکس ادا کیا جائے،متناسب ٹیکس کا مطلب یہ ہے کہ تمام لوگ یکساں شرح سے ٹیکس دیں مثلاً غریب بھی اپنی آمدنی سے پانچ فیصد ادا کرے اور امیر بھی اپنی آمدنی سے پانچ فیصد۔

اصول مساوات کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہر ٹیکس دہندہ یکساں رقم ادا کرے مثلاً طے ہوجائے کہ ملک کا ہر باشندہ ماہانہ سو روپے ٹیکس دے گا کیونکہ یہ غریب پر صریح ظلم ہے۔

اصول تیقن: (Camon of Certainty) محصول کی رقم جو کسی فرد کو ادا کرنی ہے وہ اصولی طور پر طے اور متعین ہونی چاہئے اور اس کی مقدار

سی کی مرضی پر نہیں چھوڑنی چاہیے، ہر ٹیکس دہندہ کو معلوم ہونا ضروری ہے کہ کتنا
ٹیکس ادا کیا جائے گا اور کب ادا کیا جائے گا، کیسے اور کس کو ادا کیا جائے گا؟ اگر یہ
باتیں واضح نہ ہوں تو ٹیکس ادا کنندہ ٹیکس وصول کرنے والے کے ہاتھوں پریشان
ہوگا، وصول کنندہ اپنے مخالف اور ناپسندیدہ شخص سے زیادہ وصول کرے گا نیز خوف
اور دھمکی کی بنا پر اسے مجبور کیا جاسکے گا۔

(۳) اصول سہولت: (Camon of Convenience)

اس اصول کے مطابق جہاں تک ممکن ہو ٹیکس کی رقم اس طریقہ سے لگانی اور ایسے
وقت وصول کرنی چاہیے کہ جس میں ٹیکس دہندہ کیلئے سہولت اور آسانی ہو، مثلاً ان
سے قسطوں میں ٹیکس وصول کرنے کی اجازت ہو نیز ایسے وقت میں وصول کرنی
چاہیے جب انہیں تنخواہ یا آمدنی حاصل ہو۔

اصول تیقن یہ ہے کہ ٹیکس کی ادائیگی کا وقت اور طریقہ یقینی اور متعین ہونا
چاہیے اور اصول سہولت یہ ہے کہ ٹیکس دینے کا وقت اور طریقہ سہل ہونا چاہیے۔

اصول کفایت (Camon of ecanomy)

ہر قسم کا ٹیکس اس طرح وصول کرنا چاہیے کہ مجموعی طور پر سرکاری خزانے میں
جو رقم جمع کرائی جائے، اس کے جمع کرنے کے اخراجات کم سے کم ہوں، اگر جمع
کرنے کے اخراجات ہی خزانے میں جمع شدہ رقم کے برابر یا اس کے قریب ہیں تو
اس سے اصول کفایت پورا نہ ہوگا۔ مثلاً اگر ٹیکس وصول کرنے والے افسروں، کلرکوں
کی تنخواہیں بہت زیادہ ہوں تو درست نہیں ہے، یہ صورت بھی اصول کفایت کے

خلاف ہے کہ ٹیکس صنعت وتجارت کی ترقی میں رکاوٹ ثابت ہو، چنانچہ اگر لوگوں کی آمدنیوں پر بھاری ٹیکس لگایا جائے تو لوگوں کی حوصلہ شکنی ہوگی اور ان کے پاس سرمایہ جمع نہ ہوگا۔ چنانچہ قوم وملک کی پیدائش دولت کی صلاحیت بری طرح متاثر ہوگی۔ لہٰذا اصول کفایت کو پورا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ٹیکس ملکی وقومی خوشحالی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے، جو ٹیکس مضر اور نشہ آور اشیاء پر لگائے جاتے ہیں وہ اصول کفایت کو پورا کرتے ہیں، ان سے ایک تو حکومت کو آمدنی حاصل ہوتی ہے اور دوسری جانب یہ غیر پیداواری خرچ کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں البتہ خام مواد واموال پر لگائے گئے ٹیکس اصول کفایت کو پورا نہیں کرتے کیونکہ اس سے مصنوعات کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور صنعت کی' بین الاقوامی منڈی میں مقابلے کی قوت کمزور ہوجاتی ہے۔

یہ چار اصول آدم سمتھ نے پیش کئے ہیں، ان اصولوں میں سے پہلا اصول اخلاقی نوعیت کا ہے اور باقی تین کی نوعیت انتظامی ہے، آدم سمتھ کے بعد دوسرے ماہرین ٹیکس نے بھی کچھ اصول پیش کئے ہیں، آئندہ آنے والے اصول ان ہی لوگوں کے ہیں۔

(۵)اصول پیداواری: (Camon of Productivity)

ریاست کے مالی ذرائع کا دارومدار ٹیکسوں سے حاصل شدہ آمدنی پر ہوتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ یہ ٹیکس حکومتی جائز مصارف کیلئے کافی ہوں تا کہ انہیں صحیح طور پر پورا کیا جاسکے، البتہ ضروری ہے کہ زیادہ ٹیکس حاصل کرنے کی خواہش میں اتنے ٹیکس نہ لگا دئے جائیں کہ قوم کی قوت پیداوار کم ہوجائے یا معاشی ذرائع پر برا

اثر پڑے۔

اس اصول سے یہ مراد بھی ہے کہ بہت زیادہ اور مختلف قسم کے ٹیکس لگانا، جن سے تھوڑی آمدنی حاصل ہوتی ہو، اس سے بہتر یہ ہے کہ ایک ہی ٹیکس لگا دیا جائے جس سے کافی آمدنی حاصل ہو جائے، ٹیکسوں کی بھر مار نہیں ہونی چاہئے کیونکہ ہر ٹیکس اپنی جگہ پر شہریوں کیلئے کوفت کا باعث بنتا ہے اور یہ بات بھی ضروری ہے کہ ٹیکس صرف چند لوگوں پر نہیں لگانا چاہئے کیونکہ ایک تو یہ غیر کفایتی ہوں گے اور دوسرے ان سے عدم مساوات کا رجحان بڑھے گا۔

(٦) اصول لچکداری (Camon of elasticity) اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ نظام ٹیکس جامد نہ ہو، اس میں لچک ہو یعنی قومی آمدنی میں جوں جوں اضافہ ہوتا جائے حکومت کو ٹیکس سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی بڑھتی جائے اور اگر لوگوں کی آمدنیاں کم ہوں تو ٹیکس بھی کم ہوتے جائیں۔ اس میں یہ بھی داخل ہے کہ جیسے جیسے حکومتی ضروریات واخراجات بڑھتے جائیں تو اس کی آمدنی اور ٹیکس بھی بڑھنا چاہئے ورنہ ٹیکس کی رقم حکومت کیلئے کافی نہ ہوگی، ناگہانی حالت میں یا شدید ضرورت کے زمانے میں حکومت اس قابل ہونی چاہئے کہ اپنے مالی ذرائع میں اضافہ کر سکے بلکہ اگر ہو سکے تو بعض ٹیکس ایسے ہونے چاہئیں جن سے زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل ہو۔

(٧) اصول تنوع: (Camon of diverrsity) یہ بڑا اہم اصول ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ٹیکس مختلف قسم کے نافذ کرنا چاہئے تا کہ کوئی ایک

طبقہ ٹیکس کے بوجھ تلے نہ دب جائے، منفرد ٹیکس یا چند ٹیکس حکومت کی ضرورت کیلئے کافی نہیں رہ سکتے۔ اس لئے بھی ٹیکسوں میں تنوع کا عنصر ہونا چاہئے تاکہ وہ تمام شہری جو سرکاری مالیات میں حصہ ڈال سکتے ہیں ان سے ضرور ٹیکس وصول کیا جائے، اس سلسلے میں بالواسطہ اور بلا واسطہ ٹیکسوں کی آمیزش ہونی چاہئے اور اس طرح نہ صرف حکومت کیلئے کافی مالیات فراہم کئے جاسکتے ہیں بلکہ اصول مساوات کو بھی پورا کیا جاسکتا ہے البتہ ٹیکسوں کی بہت زیادہ بھرمار بھی بری ہے۔

(۸) اصول سادگی: (Camon of Simplicity)

نظام محصولات سادہ اور عام ٹیکس دہندہ کی سمجھ کے مطابق ہونا چاہئے، اس میں کوئی پیچیدگی اور الجھن نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اگر ٹیکس دہندہ کو اس بات کا صحیح علم نہ ہو کہ اس نے کس قدر ٹیکس دینا ہے اور کب اور کہاں ادا کرنا ہے تو پھر وہ ٹیکس کیسے ادا کرے گا؟ نیز ٹیکس جمع کرنے والے ٹیکس دہندہ گان کی اس کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے اور بے قاعدگی اور بدعنوانی کے دوروازے کھلیں گے، اگر بدعنوانی، بے قاعدگی، جبر وقہر کو ختم کرنا درکار ہو تو ٹیکسوں کے نظام میں یہ صفت ضرور ہونی چاہئے۔

(۹) اصولِ ملائمت

اگرچہ یہ اصول بظاہر اصول لچک کی مانند معلوم ہوتا ہے لیکن ان دونوں میں بہت فرق ہے، اصول ملائمت سے مراد یہ ہے کہ ٹیکسوں کا نظام اس قدر سخت نہ ہونا چاہئے کہ وہ معاملات کے مطابق ڈھالا نہ جاسکے، جب تک یہ نظام ملائم نہ

ہو حکومت کی آمدنی نہیں بڑھائی جاسکتی۔ کیونکہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکے گی، گویا کہ اصول لچک کے لئے اصول ملائمت کا ہونا ضروری ہے، اگر ٹیکسوں کا نظام کسی انقلاب کے بغیر نہ بدلا جاسکتا ہو تو سمجھ لیجئے کہ اس میں ملائمت کا فقدان ہے۔

(۱۰) معاشی ترقی کا اصول

ٹیکس عائد کرنے کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اس سے معاشی ترقی میں اضافہ ہو، اس کی روح ملک کے معاشرتی اور اقتصادی مقاصد کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو، حکومت کی مالی اور معاشی پالیسی کے ساتھ ساتھ ٹیکس لگانے کی پالیسی کا مقصد یہ بھی ہونا چاہئے کہ بحران، سرد بازاری اور بے روز گاری کا علاج کیا جائے۔ ماخذہ: (۱) اصول معاشیات از شیخ منظور علی

(۲) وجدید معاشیات از ڈاکٹر ایس ایم اختر۔

واضح رہے کہ مذکورہ اصول میں کچھ تعارض اور تضاد بھی پایا جاتا ہے، نیز ان میں سے بعض اصولوں کے مطلب میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، بعض نے کچھ مطلب لیا اور بعض نے کچھ۔

زکوۃ میں مذکورہ اصول کی رعایت

وجوب زکوۃ کے سلسلے میں شریعت نے نہ مذکورہ تمام اصول کی رعایت کی ہے اور نہ سب کو رد کیا ہے بلکہ شریعت کی رو سے ان میں سے بعض اصول درست اور قابل رعایت ہیں، ان کی رعایت کی ہے اور بعض درست، قابل رعایت اور ضروری نہیں ہیں، اس لئے ان کی رعایت نہیں کی ہے، یہی صحیح ہے، بعض حضرات ان

اصول و ضوابط کا مطلب توڑ موڑ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ سب قابل اعتبار ہیں اور اسلام نے ان سب کا اعتبار کیا ہے، لیکن یہ دعوی درست نہیں ہے، صحیح یہ ہے کہ شریعت نے بعض کو تسلیم کیا ہے اور بعض کو نہیں اور مجموعی طور پر مذکورہ اصول کے تمام مقتضیات زکوۃ میں پورے کئے گئے ہیں، خود ماہرین مالیات بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ نظام ٹیکس میں مجموعی طور پر ان اصول کی رعایت ضروری ہے۔

چنانچہ ”جدید معاشیات“ (ص۴۳۵) میں ہے:

ماہرین ٹیکس کا یہ بھی کہنا ہے کہ کسی ملک کا نظام محصولات ایسا نہیں جو ان تمام اصولوں کو پورا کرے، اس بارے الگ الگ ٹیکسوں کو دیکھنے کی بجائے پورے نظام محصولات کا جائزہ لینا چاہئے، بعض ٹیکس لازماً ایسے ہوتے ہیں جو بعض اصولوں کو پورا نہیں کرسکتے لیکن نظام محصولات کو بحیثیت مجموعی ان میں سے بیشتر اصولوں کو پورا کرنا چاہئے۔ (جدید معاشیات از ڈاکٹر ایس ایم اختر)

اصولِ مساوات (Camon of Equity) اورزکوۃ

اصولِ مساوات کا اگر وہی مطلب لیا جائے جو پہلے لکھا جاچکا ہے یعنی متزاید ٹیکس منصفانہ ہے یعنی جیسے جیسے آمدنی بڑھتی جائے اسی تناسب سے ٹیکس کی شرح بھی بڑھائی جائے، تو شریعت نے اس کا اعتبار نہیں کیا ہے، اول تو بذاتِ خود ماہرین اقتصادیات کا اس بارے شدید اختلاف ہے کہ متناسب ٹیکس عدل و انصاف کے تقاضے زیادہ پورے کرتا ہے یا متزاید ٹیکس؟ دونوں اقوال موجود ہیں لہٰذا اس اعتبار سے یہ اصول اختلافی ہوا پھر شریعت نے زکوۃ میں تزاید اور تصاعد کا اصول کیوں نہیں

اپنایا؟اس بارے مکمل تفصیل آگے مستقل طور پر آرہی ہے۔

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ شرعاً بلکہ عملاً، اخلاقاً اور اقتصاداً تناسب ہی صحیح طریقہ ہے، تصاعد و تزاید کا طریقہ صحیح نہیں ہے۔

اور اگر اصول مساوات کا یہ مطلب لیا جائے کہ ہر ٹیکس دہندہ سے متعین یکساں رقم نہ لینا چاہئے، مثلاً ہر فرد خواہ غریب ہو یا غنی، سو روپے ہی ادا کرے گا تو شریعت نے اس اصول کا اعتبار کیا ہے، چنانچہ ہر صاحب نصاب پر یکساں زکوۃ واجب نہیں ہے بلکہ اپنے اپنے مال کے تناسب سے زکوۃ واجب ہوتی ہے۔

بعض نے اصول مساوات کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ٹیکس ایسا لاگو کرنا چاہئے جس سے مطلقاً عدل وانصاف کے تقاضے پورے ہوتے ہوں، اگر یہ مطلب لیا جائے تو شریعت مقدسہ نے ہر معاملہ میں عدل وانصاف کو ملحوظ رکھا ہے اور بالخصوص زکوۃ میں بھی عدل و انصاف کی پوری رعایت موجود ہے کیونکہ عدل و انصاف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اسی پر زمین و آسمان قائم ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لقدارسلنارسلنابالبینات وانزلنامعهم الكتاب والميزان ليقوم الناس بالقسط (الحدید : ۲۵)

زکوۃ میں عدل وانصاف کی رعایت کی تفصیل

زکوۃ میں عدل وانصاف کے کئی پہلو موجود ہیں جن میں سے چند اہم پہلو مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) وجوب زکوۃ میں مساوات

شرعاً زکوۃ ہر صاحب نصاب مسلمان پر فرض ہے، خواہ وہ کسی بھی رنگ و نسل اور کسی بھی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو، اس فریضہ میں حاکم ومحکوم، عوام و خواص اور مذہبی لوگ اور دنیادار سب برابر ہیں، سب پر وجوب زکوۃ یکساں ہے، اس کے برعکس قدیم دور کے مغرب میں شرفاء اور اہل مذہب ٹیکس سے مستثنیٰ ہوا کرتے تھے، زمانہ نبوت میں جبکہ زکوۃ کی فرضیت عائد ہورہی تھی، گردوپیش کے رسم ورواج کے مطابق اس طرح کا استثناء موجود تھا لیکن شریعت نے یکساں حکم عائد کیا ہے۔

(۲) نصاب سے کم مقدار کا استثناء

وجوب زکوۃ میں عدل و انصاف کی ایک صورت یہ ملحوظ رکھی گئی ہے کہ مسلمان کے ہر کم وبیش مال پر زکوۃ واجب نہیں بلکہ اس کا ایک نصاب مقرر کرے، صرف صاحب نصاب پر زکوۃ واجب ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: خذ العفو وأمر بالعرف (الاعراف: ۱۹۹)

وقال اللہ تعالیٰ: یسألونک ماذا ینفقون، قل العفو (البقرۃ: ۲۱۹)

(۳) عدم تکرار زکوۃ

شریعت کی رو سے سال میں ایک بار زکوۃ واجب ہے، بار بار واجب نہیں، خواہ مال بہت زیادہ ہو اور سال سے پہلے بہت نفع کما چکا ہو۔

فی مصنف ابن ابی شیبۃ(۶۱/۷) کتاب الزکوۃ، رقم الباب ۱۳۱. ۱۳۱ من قال لا تؤ خذ فی السنۃ الا مرۃ، تحقیق محمد عوامۃ. رقم

الحدیث ۱۰۸۳۵ عن الزهری قال: لم یبلغنا ان احدا من ولا ة هذه الامة الذین کانوا بالمدینة:ابوبکر وعمر وعثمان انهم کانو یثنون الصدقة لکن یبعثون علیها کل عام فی الخصب والجدب،لان اخذ هاسنة من رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم.

وفیه ایضاًرقم الحدیث(۱۰۸۳۶)،عن طاؤس اله قال:اذا تدارکت الصدقتان فلا یؤخذ الا ولی کالجزیة.

وفیه ایضاً رقم الحدیث(۱۰۸۳۷)عن حسن بن حسن عن امه فاطمة:ان النبی صلی الله علیه وآله وسلم قال:لاثنی فی الصدقة وکذا فی کتاب الاموال لابی عبید (۹۸۱)ومسند الفردوس للدیلمی (۷۸۱۴) والجامع الکبیر (۱/۹۰۹) وکنزالعمال (۱۵۹۰۲)

وقال ابن الاثیر فی معنی الحدیث:ای لا تؤخذ الصدقة مرتین فی السنة والثنی بالکسر والقصر ان یفعل الشئی مرتین.

النهایة فی غریب الحدیث والاثر(۱/۲۲۴)

مزید اصول ومسائل

مذکورہ احادیث وآثار سے فقہاء اسلام نے زکوۃ کے بارے میں ایسے مسائل اور اصول کا استنباط کیا ہے جن سے زکوۃ میں عدل وانصاف کی رعایت کا پہلو نکھر کر سامنے آجاتا ہے اور جس سے ثابت ہوتا ہے کہ شریعت کے اصول عدل و انصاف محض خیالی اور فرضی نہیں ہیں بلکہ عملی ہیں اور شریعت نے ان اصول کو مسائل وفروع پر منطبق کر کے دکھایا ہے،ان اصول ومسائل میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ جن مویشی کی زکوۃ ادا کردی گئی ہے، ان کا مالک انہیں اس زرنقد کے ساتھ جمع کرنے کا پابند نہیں ہے جس کی زکوۃ نہیں دی گئی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر ان کو جمع کر دیا جائے تو مویشیوں میں زکوۃ کا تکرار لازم آیگا جبکہ حدیث کی رو سے مال میں ایک ہی سبب سے دو مرتبہ زکوۃ کا وجوب ممنوع ہے۔ البحرالرائق (۲۴۰،۲۳۹/۲) کتاب الزکوۃ۔

(۲) جس شخص نے زر نقد کی زکوۃ ادا کردی پھر ان کے عوض اونٹ وغیرہ مویشی خریدے جبکہ اس کے پاس اسی جنس کے مویشی پہلے سے بھی موجود تھے تو جب وہ اختتام سال پر پہلے سے موجود مویشی کی زکوۃ ادا کرے تو اس پر نقد کے ذریعہ خریدے مویشی کی زکوۃ ادا کرنا فرض نہیں ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ مویشی اسی نقد کا بدل ہیں جن کی زکوۃ ایک بار ادا کی جا چکی ہے اور ایک ہی سال میں مال پر دوبارہ زکوۃ واجب نہیں ہوسکتی۔ ردالمحتار (۲۱/۲)

(۳) کسی شخص نے تجارت کی نیت سے بقدر نصاب جانور خریدے تو ان کی زکوۃ کی نوعیت میں اختلاف پایا جاتا ہے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمدؒ کا مذہب یہ ہے کہ ان کو مالِ تجارت شمار کیا جائے گا اور مال تجارت کے اعتبار سے زکوۃ واجب ہوگی۔ جبکہ امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما کا مذہب یہ ہے کہ ان پر جانوروں والی زکوۃ عائد ہوگی۔ دونوں فریقوں نے اپنے اپنے موقف پر دلائل پیش کئے ہیں ان کی تفصیل ہمارے پیش نظر نہیں ہے، یہاں صرف اتنی بات واضح کرنی ہے کہ اس پر دونوں فریقوں کا اتفاق ہے کہ ان مویشی پر یاتو مالِ تجارت کی حیثیت سے زکوۃ عائد ہوگی یا بحیثیت جانور اور سائمہ ہونے کے،

...ل تجارت اور سائمہ دونوں کی حیثیت سے زکوۃ واجب نہیں ہوتی، کیونکہ اگر ان کی ...را مال تجارت کی حیثیت سے بھی دی جائے اور سائمہ ہونے کی حیثیت سے بھی ...ی جائے تو زکوۃ کا تکرار لازم آئے گا جو کہ ممنوع ہے۔

المغنی لابن قدامۃ (۳/۳۴، ۳۵)

(۴) اس پر اتفاق ہے کہ کھیتوں میں ہل چلانے یا انہیں سیراب کرنے کیلئے جو جانور رکھے جاتے ہیں ان پر زکوۃ واجب نہیں ہے، اس عدم وجوب کی وجہ کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ جانور زمین، مشینری، وغیرہ کی طرح آلاتِ کسب ہیں اور شریعت کی رو سے آلات کسب پر زکوۃ نہیں ہوتی بلکہ ان سے حاصل ہونے والی آمدنی پر ہوتی ہے، امام ابو عبیدؒ نے کتاب الاموال ص ۳۸۱ میں اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ اصل میں پیداوار اور اناج پر عائد زکوۃ جب ادا کی جاتی ہے تو اس سے ان جانوروں کی زکوۃ بھی ادا ہو جاتی ہے، اگر ان جانوروں کی الگ سے بھی زکوۃ ادا کرنا ضروری قرار دی جائے تو زکوۃ میں تکرار لازم آئے گا۔

(۵) فقہاء احنافؒ کا اصول یہ ہے کہ زمین سے یا تو عشر لیا جائے گا یا خراج، دونوں نہیں لئے جائیں گے، جیسا کہ تجارت کے جانوروں میں یا تو جانوروں والی زکوۃ واجب ہوتی ہے یا مالِ تجارت والی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر ایک ہی زمین سے عشر اور خراج دونوں وصول کئے جائیں تو اس میں تکرار لازم آئے گا اور ایسا کرنا اصول عدل وانصاف کے خلاف ہے۔

فی المحیط البرهانی (۳/۲۹۰) کتاب العشر، الفصل السابع فی المتفرقات ۲۹۶۰، وفی الاصل: ولا یجتمع العشر والخراج فی ارض

واحدة،سواء كانت الارض عشرية اوخراجية وبه ورد الاثرعن رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم والمعنى فيه ان سبب وجوب الحقين واحد،وهوالارض النامية ولهذا يضاف كل واحدمنهما الى الارض يقال: عشر الارض وخراج الارض والحكم ابدا يضاف الى سبب قلنا:لايجب حقان لله تعالىٰ بسبب واحد،ولو اشترى ارض عشر او خراج للتجارة ففيها العشر اوالخراج دون زكوة التجارة.

اخرج ابن عدى فى الكامل (۲۷۱۰/۷)والبيهقى فى السنن (۱۳۲/۴)والخطيب فى التاريخ (۱۴ /۱۶۲)وابن الجوزى فى الموضوعات (۱۵۱/۲)عن ابن مسعود رضى الله تعالىٰ عنه عن النبى صلى الله عليه وآله وسلم انه قال:لايجتمع عشر وخراج فى ارض مسلم.

(٦) جمہور فقہاء کا اتفاق ہے کہ قابلِ زکوۃ اموال کا قرض سے فارغ ہونا زکوۃ کیلئے شرط ہے یعنی اگر صاحب نصاب پر نصاب کے برابر قرض ہوتو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہے،اسی طرح اگر کسی کے پاس نصاب کے برابر مال ہے لیکن اس پر اتنا قرض ہے کہ اگر قرض کو منہا کیا جائے تو نصاب پورا نہیں ہوتا تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہے،اسی طرح اگر صاحب نصاب کے پاس مال کافی زیادہ ہے لیکن اس پر کچھ قرض ہے تو شرعاً جب وہ زکوۃ ادا کرے تو اپنے مال سے بقدر قرض منہائی کر کے صرف باقی رقم کی زکوۃ ادا کرے،گویا اس پر اتفاق ہے کہ قرض کو زکوۃ کے مال سے منہا کیا جائیگا۔ البتہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی توجیہات مختلف کی گئی ہیں مثلاً بعض

فرماتے ہیں کہ جو مال قرض میں ادا کرتا ہے وہ معدوم کی طرح ہے بلکہ وہ مقروض شخص کہ جس کے پاس اداء قرض کے بعد مال باقی نہ بچے تو وہ غنی نہیں بلکہ محتاج اور فقیر ہے وہ خود زکوۃ لے سکتا ہے اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ بقدر قرض مال پر صاحب نصاب کی ملکیت ہی کمزور ہے اس لئے اس پر زکوۃ واجب نہیں ہے اور بعض فقہاء کرامؒ نے مذکورہ اصول عدل وانصاف کی روشنی میں اس کی یہ توجیہ لکھی ہے کہ شریعت کی رو سے قرض خواہ بھی قرض کی رقم پر زکوۃ ادا کرتا ہے، نفس وجوب اس پر بھی ہے، اگرچہ وجوب ادا تب ہوگا جب وہ رقم وصول ہوگی، اب اگر مقروض پر بھی اس کی زکوۃ واجب قرار دے دی جائے تو ایک ہی مال پر دوبارہ زکوۃ عائد ہوجائیگی جوکہ شریعت سے رو سے ممنوع ہے۔

المجموع شرح المهذب للامام النووی الشافعی (۳۳۶/۵)

(۴) محنت ومشقت کے لحاظ سے مقدار زکوۃ میں فرق

شریعت مقدسہ نے وجوب زکوۃ میں جو اصول عدل وانصاف ملحوظ رکھے ہیں ان میں ایک اصول یہ بھی ہے کہ اخراجات اور محنت ومشقت کے لحاظ سے زکوۃ کی شرح میں فرق رکھا ہے یعنی اگر مال کمانے میں اخراجات زیادہ ہوتے ہیں یا محنت ومشقت زیادہ کی ہے تو اس میں زکوۃ کی شرح کم رکھی گئی ہے اور اگر کمائی میں اخراجات کم ہوتے ہیں یا محنت ومشقت کم ہوتی ہے تو اس تناسب سے زکوۃ کی شرح زیادہ رکھی گئی ہے۔

درسِ ترمذی (۴۶۸/۳) میں ہے۔

اسلام نے مقادیرِ زکوۃ کی تعیین میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ جس مال کے حصول میں جتنی دشواری ہو، اس پر زکوۃ اتنی ہی کم واجب ہو، چنانچہ سب سے سہل الحصول مال کنز، مدفون یا معدن ہے لہٰذا اس پر سب سے زیادہ شرح عائد کی گئی ہے یعنی خمس، پانچواں حصہ پھر اس سے کچھ زیادہ مشقت اس زرعی پیداوار کے حصول میں ہوتی ہے جو بارانی زمین میں اگائی گئی ہو چنانچہ اس پر اس سے کم شرح یعنی عشر، دسواں حصہ لگایا، پھر اس سے کچھ زیادہ مشقت اس زمین کی زرعی پیداوار میں ہوتی ہے، جو کنویں وغیرہ سے سیراب کی جاتی ہے، چنانچہ اس پر اس سے بھی کم یعنی بیسواں حصہ مقرر کیا گیا ہے اور سب سے زیادہ مشقت نقد روپیہ کے حصول میں ہوتی ہے، اس لئے اس پر سب سے کم شرح عائد کی گئی ہے یعنی چالیسواں حصہ۔

اسلام کا یہ اصول انتہائی مبنی بر انصاف ہے اور ہمارے علم کی حد تک نظام ہائے ٹیکس میں سے کسی نظام ٹیکس نے اس پہلو کو ملحوظ نہیں رکھا، دنیا کے نظام ہائے ٹیکس میں صرف آمدنی ٹیکس کے مصدر کو ملحوظ رکھا گیا ہے، کسی بھی نظام میں آمدنی پر آنے والے اخراجات اور انسانی محنت و مشقت کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔

(۵) زکوۃ دہندہ کے شخصی حالات

زکوۃ میں عدل وانصاف کی مکمل رعایت ملحوظ رکھنے کی خاطر شریعت مقدسہ نے زکوۃ دہندہ کے ذاتی وشخصی حالات کو بھی مدنظر رکھا ہے، اس کے برعکس نظام ٹیکس میں اموال پر عائد ہونے والے ٹیکس میں صرف عین مال کو مد نظر رکھا جاتا ہے، صاحب مال کے شخصی حالات کو نہیں دیکھا جاتا اور اشخاص پر ٹیکس میں مالی پوزیشن

نظر نہیں ہوتی،صرف فرد کا اعتبار کیا جاتا ہے پھر جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ بعد کے ماہرین اقتصادیات نے ''اشخاص پر ٹیکس'' عائد کرنے کیلئے درمیانی راہ نکالی اور کچھ اصلاحی شرائط پیش کیں،وہ شرائط مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) حد کفایت تک ٹیکس کا استثناء

(۲) آمدنی کے مصدر کی رعایت

(۳) اخراجات اور واجبات کو منہا کر کے خالص آمدن پر ٹیکس۔

(۴) خاندانی ذمے داریوں کی رعایت

(۵) نوعیت فرضیت میں تناسب ورعایت۔

اسلام نے پہلے ہی زکوۃ کی فرضیت میں ان امور کو ملحوظ رکھا ہے بلکہ دیگر ایسے امور بھی اسلام نے ملحوظ رکھے ہیں جن کی جانب ہنوز انسانیت کی رسائی نہیں ہوسکی اوراسلام کی یہ تعلیمات اس وقت منصۂ شہود پر آئیں جب دنیائے معاشیات میں عین مال پر ٹیکس اور اشخاص پر ٹیکس میں سرے سے کوئی فرق موجود نہیں تھا۔جس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) حد نصاب کی رعایت

شریعت مقدسہ نے وجوب زکوۃ کا ایک نصاب مقرر کیا ہے جس کی کچھ وضاحت پہلے آچکی ہے،اس نصاب سے کم مال ومتاع کے مالک پر کوئی ٹیکس واجب نہیں ہے نہ مالی ٹیکس اور نہ شخصی ٹیکس،صرف غنی پر زکوۃ واجب ہے گویا کہ کفایت کی حد تک زکوۃ کا استثناء کیا ہے۔

(۲) ضروریات اصلیہ سے فارغ ہونا

شریعت کی رو سے جو مال انسان کی اصلی حاجات وضروریات میں مشغول ہو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہے، زکوۃ صرف اس مال پر ہے جو ضروریات اصلیہ سے زائد ہو، گویا کہ شریعت نے اموال زکوۃ کے مصدر کی بھی رعایت کی ہے۔

(۳) خالص آمدن پر زکوۃ

اس کی وضاحت پہلے آچکی ہے کہ عام مال تجارت میں شرعاً صرف خالص اور صافی آمدن پر زکوۃ واجب ہے، اخراجات، واجبات، کرایہ اور تمام خاص خرچ منہا کئے جاتے ہیں، اس میں یہ بھی داخل ہے کہ صاحب مال پر اگر قرض ہو تو بقدر قرض اس پر زکوۃ ہی واجب نہیں ہے۔

اخراجات کا استثناء:

(۴) بعض فقہاء ملت کی رائے یہ ہے کہ زراعت پر جو اخراجات آتے ہیں ان کے استثناء کے بعد پیداوار پر عشر واجب ہے چنانچہ حضرت عطاءؒ بن ابی رباح کا یہی قول ہے، حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی رائے یہ ہے کہ فصل وزراعت پر آنے والے اخراجات اگر قرض کی صورت میں ہوں جیسا کہ اس زمانے میں زرعی بینکوں سے قرض لیا جاتا ہے تو یہ قرض پہلے منہا کیا جائے گا پھر پیداوار میں عشر واجب ہوگا، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی منقول ہے، جمہور فقہاء کے ہاں ایسے اخراجات منہا نہیں کئے جاتے، خواہ قرض کی صورت میں ہوں یا کسی اور صورت میں البتہ اس صورت میں عشر (۱/۱۰) کی بجائے نصف عشر (۱/۲۰) واجب

ہوتا ہے یعنی مقدار عشر میں کمی آجاتی ہے،اس اعتبار سے گویا شریعت نے ذمہ داریوں اور اخراجات کی رعایت کردی ہے۔

فی فقه السنة للسيد سابق(١/١١٣)وتكاليف الزرع من حصاد وحمل ودياسة وتصفية وحفظ وغيرذلک من خالص مال المالک ولا يحسب منها شئی من مال الزكوة،ومذهب ابن عباس رضی الله تعالیٰ عنه انه يحسب ماالقترضه من اجل زرعه وثمره،عن جابر بن زيد عن ابن عباس رضی الله تعالیٰ عنه وابن عمر رضی الله تعالیٰ عنه فی الرجل يستقرض فينفق على ثمرته واهله قال ابن عمر رضی الله تعالیٰ عنه يبد أ بما استقرض فيقضيه ويزكی مابقی.قال (جابر بن زيد)وقال ابن عباس رضی الله تعالیٰ عنه:يقضی ما انفق على الثمرةثم يزكی مابقی رواه يحی بن آدم فی الخراج.

فكأ نما اتفق ابن عباس وابن عمر رضی الله تعالیٰ عنهما على قضا ء ما انفق على الثمرة وزكوة الباقی واختلفا فی قضاء ماانفق على اهله وذكر ابن حزم عن عطاء انه يسقط مما اصاب النفقة فان بقی مقدار مافيه زكی والا لا.

اوراس پرسب کااتفاق ہے کہ عام اموال زکوۃ میں آمدن کے تمام اخراجات ونفقات زکوۃ سے مستثنیٰ ہیں اورصرف اسی آمدنی پر زکوۃ واجب ہوتی ہے جو مقررہ تاریخ تک بچ جائے۔

(۵)نوعیت فرضیت

زکوۃ کی فرضیت کی نوعیت مختلف مقرر کی گئی ہے جس کی وضاحت پہلے آچکی ہے یعنی خمس، عشر، نصف عشر اور چالیسواں حصہ۔

(۶)نظام زکوۃ میں اصول عدل وانصاف کی عملی تنفیذ

مروجہ نظام ٹیکس میں جو عدل وانصاف کے قوانین واصول طے کئے گئے ہیں، ان پر عمل اور تطبیق کی صورت بہت کم ہی پیش آتی ہے، یہ اصول محض بلند وبالا دعووں، زبانی جمع خرچ تک محدود ہیں اور کتب ورسائل کے زیب وزینت بنے ہوتے ہیں، اس کے مقابلے میں اسلام نے ان اصول وضوابط کو با قاعدہ نظام زکوۃ کا عملی حصہ بنایا ہے، انکو نافذ اور جاری کیا ہے، اسلام کی ہدایت یہ ہے کہ اخذ زکوۃ پر ایسے عاملین مقرر کئے جائیں جن کے دل ودماغ میں عدل وانصاف ایمان کے درجے میں سرایت کر چکا ہو، اسلام نے ان اصول کی تنفیذ کے بارے میں جو احکامات صادر فرمائے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)عامل کا انتخاب

خلیفہ وقت کا فریضہ ہے کہ صدقات وزکوۃ وصول کرنے کیلئے نیک عادل صالح اور متقی شخص کا انتخاب کرے، نااہل اور غیر صالح عامل منتخب کرنے پر سخت وعیدیں آئی ہیں، تاریخ بتاتی ہے کہ اگر کسی خلیفہ وقت نے نااہل عاملین کا تقرر کیا تو

علماء وقت نے اس پر سخت نکیر کی ہے۔

چنانچہ کتاب الخراج (ص۸۰) میں منقول ہے کہ امام ابویوسفؒ نے ہارون الرشید کو یہ خط لکھا کہ امانت دار، قابل اعتماد، پاکدامن، ناصح، اور آپ کے اور عایا کے حق میں موزوں فرد کو جمع صدقات پر مامور کیجئے، وہ لوگوں کے پاس جائے اورنرمی سے ان کے مسلک، طریقہ آمدنی اور امانتوں کے بارے میں دریافت کرے اور صدقات جمع کرے۔

مجھے اطلاع ملی ہے کہ فی الوقت عمال خراج جن لوگوں کو صدقات کی وصولیابی پر روانہ کرتے ہیں وہ ظلم اور زیادتی روا رکھتے ہیں، حالانکہ نیک اور پارسا لوگ اس کام پر مامور ہونے چاہئیں۔

عامل کو ہدایات

احادیث میں عامل کو عدل وانصاف سے کام لینے کی بڑی ترغیب آئی ہے اور ظلم وزیادتی کرنے پر سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔

فی جامع الترمذی (۲۵۸/۱)ابواب الزکوۃ،باب ماجاء فی العامل علی الصدقة بالحق،عن رافع بن خدیجؓ قال:سمت رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم یقول:العامل علی الصدقة بالحق کالغازی فی سبیل الله حتی یرجع الی بیته .

سچائی اور دیانت کے ساتھ صدقات جمع کرنے والا اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے یہاں تک کہ اپنے گھر واپس آجائے۔

وفیه ایضا باب فی المعتدی فی الصدقة،عن انس بن مالک قال

قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم: المعتدى فى الصدقة كما نعها .....قال ابو عيسىٰ .....قوله المعتدى فى الصدقة كمانعها يقول:على المعتدى من الاثم كما على المانع اذامنع.

ورواه ابوداؤد(۱/۲۳۴)كتاب الزكوة،اخر باب فى زكوة السائمة.

یعنی صدقات کی وصولیابی میں حد سے تجاوز کرنے والا اتنا ہی گناہگار ہے جتنا صدقہ نہ دینے والا ہوتا ہے۔

وفى سنن ابى داؤد (۱/۲۳۴) عن ابن عباس رضى الله تعالىٰ عنه ان رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم بعث معاذا الى اليمن .....تؤخذ من اغنيائهم وتردفى فقرائهم فان هم اطاعوک لذلک فاياک وكرائم اموالهم واتق دعوة المظلوم فانه ليس بينها وبين الله حجاب .

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجنے کا ارادہ کیا تو انہیں نصائح کیں ۔۔۔۔ان لوگوں کے عمدہ مال لینے سے بچو اور مظلوم کی بددعا سے بچو کیونکہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ۔

زکوۃ دہندہ کو ہدایات

احادیث میں زکوۃ دہندہ حضرات کو سخت تاکید کی گئی ہے کہ عاملین کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھو اور وہ تمہارے مہمان ہیں، لہذا وہ ہر حالت میں تم سے راضی ہوکر جائیں ۔

فی جمع الفوائد(۳۸۸/۱)جریربن عبدالله رضی الله عنه رفعه:اذااتاکم المصدق فلیصدر عنکم وهو راض لمسلم واصحاب السنن.

یعنی جب تمہارے پاس زکوۃ وصول کنندہ آئے تو وہ تم سے راضی ہو کر واپس لوٹے۔

سنن ابی داؤد (۲۳۵/۱)باب رضی المصدق میں حضرت جریرؓ کا قول نقل کیا ہے:

ماصدر عنی مصدق بعد ماسمعت من رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم الا وهوعنی راض .

یعنی جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بات سنی ہے تو میرے پاس سے کبھی بھی عامل ناراض ہو کر نہیں گیا۔

خزانچی کو ہدایات

فی سنن ابی داؤد (۲۴۸/۱)کتاب الزکوۃ باب اجر الخازن عن ابی موسیٰؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم:ان الخازن الامین الذی یعطی ماامر به کاملا موفرا طیبة به نفسه حتی ید فعه الی الذی امر له به احد المتصدق.

جو امانت دار خزانچی بخوشی پورا کا پورا حق دیتا ہے تو اس کو بھی صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔

اصولِ تیقن: (Camon of certainty)اور زکوۃ۔

شریعت مقدسہ نے نظام زکوۃ میں اصول تیقن کی جس طرح رعایت رکھی ہے وہ کسی نظام ٹیکس میں موجود نہیں ہے، قرآن وسنت اور فقہ میں زکوۃ کی مقداروں اور ادائیگی کے اوقات کی مکمل وضاحت کردی گئی ہے اور کمال یہ کہ یہ مقداریں ہمیشہ کیلئے ہیں، تا قیامت ان میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے، اس لئے ہر زکوۃ دہندہ کو بسہولت ان مقداروں کا علم ہوسکتا ہے، اس کے برعکس نظام ٹیکس میں خود اس اصول پر کم ہی عمل ہوتا ہے، ٹیکسوں کی شرح ومقدار میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے، اور ٹیکس دہندہ گان کو پتہ ہی نہیں ہوتا۔

زکوۃ کے مذکورہ اصول تیقن سے ان روشن خیال اور جدت پسندوں کی بھی تردید ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ زکوۃ بھی ایک ٹیکس ہے اور اس کی مقداریں قابل تغیر وتبدل ہیں، ہم اس کی تفصیل الگ بحث میں کرچکے ہیں۔

اصولِ سہولت (Camon of convenience)اور زکوۃ

نظام زکوۃ میں اس اصول کی رعایت اس طرح رکھی گئی ہے کہ زکوۃ دہندہ قسطوں میں زکوۃ دے سکتا ہے جس کی دو صورتیں بنتی ہیں۔

(۱) سال کے بعد عائد ہونے والی زکوۃ ابھی سے قسطوں میں ادا کرنا شروع کردے اور سال کے اختتام پر حساب کتاب اور تصفیہ کرلے، بہتر صورت یہی ہے۔

(۲) سال گزر چکا ہے اور زکوۃ واجب ہوچکی ہے، اس میں اصل حکم تو یہی

ہے کہ جلد از جلد زکوۃ دیدے اورفریضہ سے سبکدوش ہوجائے اور ظاہر ہے کہ صاحب نصاب کیلئے اڑھائی فیصد کی ادائیگی بہت آسان مقدار ہے،اس کے باوجود بھی اگر وہ کسی وجہ سے جلدی نہ ادا کرسکتا ہوتو قسطوں میں بھی دے سکتا ہے،زکوۃ ادا ہی شمار ہوگی،زکوۃ قضا نہیں ہوا کرتی۔

نیززکوۃ تنخواہ اور آمدنی حاصل ہونے پر ہی واجب نہیں بلکہ مقررہ تاریخ تک نصاب کے برابر موجود ہوتو واجب ہوتی ہے۔

اصول کفایت (Camon of ecanomy)اورزکوۃ

☆اسلام نے وصولی زکوۃ وصدقات کیلئے عاملین کے تقرر کا جو نظام وضع کیاہے اس کی رو سے عملاً عاملین کا خرچہ بہت کم ہوتا ہے،بہت زیادہ رقم بیت المال میں جمع ہوتی ہے،اسلام کا نظام بہت سادہ رہا ہے،عہد نبوی اور بعد کے ادوار میں پورے علاقے کیلئے ایک عامل بھیجا جاتا تھا نیز عموماً مقررہ وقت پر کسی کو بھیج دیا جاتا اور زکوۃ میں سے اس کو معاوضہ دیدیا جاتا،پورے سال کیلئے مستقل عامل نہ ہوتا تھا جیسا کہ آجکل نظام ٹیکس کے مستقل تنخواہ دار ملازم ہوتے ہیں اور پورے سال کی تنخواہ لیتے ہیں۔

☆امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے ہاں عامل زکوۃ کو زکوۃ کا صرف آٹھواں حصہ دیاجاسکتاہے،جس سے معلوم ہوا کہ باقی سات حصے بیت المال میں جمع ہوں گے،احناف کے ہاں آٹھواں حصہ متعین نہیں ہے لیکن تاریخ وتجربہ اس بات کی گواہ ہے کہ احناف وجمہور کے مذہب کے مطابق عامل کو آٹھویں حصہ سے بھی بہت کم ملتاہے،باقی سب بیت المال میں جمع ہوتا ہے۔

☆نظام ٹیکس کے برعکس، نظام زکوۃ میں مذکورہ اصول کی عملی رعایت اس طرح کی گئی ہے کہ عہدِ نبوی، عہدِ خلفاء راشدین اور بعد کے اسلامی ادوار میں صرف زکوۃ وغیرہ اسلامی ذرائع آمدن سے بیت المال بھر جاتا تھا، کسی دور میں ٹیکس نہیں لگایا گیا۔

☆نظام زکوۃ، صنعت وتجارت کی ترقی میں رکاوٹ کیا ہوتا ممد ومعاون ہے، زکوۃ کی شروح انتہائی کم ہیں جس کی وجہ سے سرمایہ کاروں کی حوصلہ شکنی ہرگز نہیں ہوتی۔

☆اگر نظام زکوۃ نافذ کیا جائے تو ملک وملت میں خوشحالی پیدا ہوگی، سرمایہ کاری اور صنعت وتجارت میں ترقی ہوگی۔

☆مروجہ نظام ٹیکس میں مضر اور نشہ آور اشیاء پر ٹیکس کو اصول کفایت سے ہم آہنگ قرار دینے کا مطلب یہ ہوا کہ ان اشیاء کی تجارت کی اجازت ہے، البتہ ان پر ٹیکس لیا جائے گا تا کہ خزانے میں اضافہ ہو حالانکہ یہ بنیادی غلطی ہے، اس ٹیکس کا اتنا فائدہ نہیں ہوتا جو ان اشیاء کے نقصانات کا تدارک کر سکے، اس کا احساس صرف اسی معاشرے کو ہو سکتا ہے جس کو منشیات کی لعنت سے سامنا کرنا پڑا ہے، اسلام نے خود ان مضر اور نشہ آور اشیاء کو ناجائز اور ان کی تجارت کو ممنوع قرار دیا ہے تا کہ فساد کی جڑ ہی ختم ہو جائے، اور معاشرے کے افراد اس لعنت میں مشغول ہونے کے بجائے ایسی جائز تجارت اپنائیں جس میں ملک وقوم کا نفع ہو۔

☆اسلام میں ہر مال تجارت پر زکوۃ واجب ہے، خام مال ہو یا تیار کردہ مصنوعات، اور یہ علت کہ خام مال پر ٹیکس لگانے سے مصنوعات کی قیمتوں میں اضافہ

ہوتا ہے ٹیکس کی حد تک تو درست ہے کیونکہ ٹیکس کو مصنوعات کی لاگت (Cost) میں شمار کیا جاتا ہے لیکن زکوۃ کو نہ شرعاً لاگت میں شمار کیا جاتا ہے اور نہ عرفاً واخلاقاً۔

اصول پیداواری (Camon of Productivity) اور زکوۃ

☆اسلام کی رو سے زکوۃ سمیت بیت المال کے جتنے جائز ذرائع آمدن ہیں وہ اسلامی حکومت کے تمام جائز مصارف کیلئے کافی ہوتے ہیں اوراس کی دلیل یہ ہے کہ عہدِ نبوی اور اس کے بعد اسلامی حکومتوں میں انہی اسلامی ذرائع آمدن پر انحصار تھا،اس دوران کسی قسم کا ٹیکس نہیں لگایا گیا،موجودہ دور میں بلا شبہ حکومتی اخراجات میں اضافہ ہوا ہے لیکن ایک تو ان میں سے بہت سے اخراجات واقعی نہیں ہیں،دوسرے اس کے ساتھ حکومتی ذرائع آمدن میں بھی اضافہ ہوا ہے،اس وقت حکومتوں کی ذاتی املاک،زمین،جائیدادیں،سرکاری محکمیں جیسے جہاز،ریلوے،بجلی، ٹیلی فون، وغیرہ اتنے زیادہ ہیں کہ پہلے اس کا تصور بھی نہ ہوتا تھا۔

☆زکوۃ کی شروح اتنی کم اور مناسب ہیں کہ اسے کوئی بھی منصف مزاج شخص بوجھ تصور نہیں کرسکتا اور نہ اس سے معاشی ذرائع پر اثر پڑتا ہے بلکہ اس کے برعکس اچھا اثر پڑنا تجربات سے ثابت ہے۔

☆زکوۃ ہر قسم کے اموال پر نہیں ہے بلکہ مخصوص اموال پر واجب ہے۔

☆زکوۃ کسی خاص طبقے یا مخصوص نسل پر واجب نہیں بلکہ تمام صاحب نصاب مسلمانوں پر بلا امتیاز واجب ہے،ہر علاقے اور ہر طبقہ اور نسل کے مسلمان زکوۃ ادا کرتے ہیں جس سے اصول کفایت پر صحیح عمل ہوسکتا ہے۔

اصولِ لچکداری (Camon of elasticity) اور زکوۃ

اس اصول کا مال یہ ہے کہ ٹیکس متزایداور تصاعدی ہونا چاہئے، شریعت نے نظام زکوۃ میں اس اصول کی رعایت نہیں رکھی جس کی تفصیل آگے آیا چاہتی ہے، اس لئے اس کے جو نقصانات ہیں جوکہ تصاعدی ٹیکس کے مخالفین بیان کرتے ہیں، زکوۃ کے نظام میں ان سے احتراز کیا گیا ہے، اور تصاعدی ٹیکس کے مؤیدین اس کے جو فوائد بیان کرتے ہیں اسلام نے ان تمام فوائد و مقتضیات کو پورا کیا ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

مثلاً حکومت کے اخراجات بڑھ جائیں یا ہنگامی حالت ہو تو شرعی حدود میں رہتے ہوئے جائز اور منصفانہ ٹیکس لگایا جاسکتا ہے، جبکہ عام حالات میں ٹیکس لگانا جائز نہیں، پھر وہ ٹیکس بھی تصاعدی عائد کرنا درست ہے نیز اہل ثروت مسلمانوں کو ترغیب دیکر چندہ وصول کیا جاسکتا ہے جیسا کہ عہدِ نبوی میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

اصولِ تنوع (Camon of diversity) اور زکوۃ

اسلام نے اصول تنوع کی رعایت اس طرح کی ہے کہ ہر قسم کے اموال پر زکوۃ واجب نہیں ہے جیسا کہ ٹیکسوں کی بھرمار ہوتی ہے، بعض اموال پر زکوۃ واجب ہے، البتہ قابل زکوۃ اموال ایک ہی نوعیت کے نہیں ہیں بلکہ مختلف نوعیت کے ہیں جیسے سونا، چاندی، نقدی، مالِ تجارت، اور مال مویشی، اگر ایک ہی نوع کے مال پر زکوۃ واجب ہوتی تو اس سے کفایت نہ ہوتی۔

اصولِ سادگی (Camon of Simplicity) اور زکوۃ

اس اصول کا مفہوم اصول تیقن کے قریب ہے اور اسلام نے اس کی مکمل رعایت رکھی ہے۔

☆ چنانچہ قابل زکوۃ اموال کا تعین زکوۃ کی شروح اور مقادیر، مصارف، اور ادائیگی کا وقت شرعاً ہے ہے اور ان میں کسی وقت بھی تبدیلی ممکن نہیں ہے، نہ عامل ان میں کمی بیشی کر سکتا ہے اور نہ خلیفہ وقت۔

☆ زکوۃ کا نظام اتنا سادہ اور عام فہم ہے کہ ٹیکسوں میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، فقہ میں کتاب الزکوۃ اور باب الرضاع کے مسائل بظاہر مشکل معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت اور تجربہ یہ ہے کہ زکوۃ اور رضاع کے چند بنیادی اصول ہیں، اگر وہ ذہن نشین ہو جائیں تو عام آدمی کیلئے ان پر عمل ممکن ہوگا بلکہ وہ دوسروں کی راہنمائی کر سکے گا، اس کے برعکس ٹیکس کے بارے ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ روز روز نئے اصول اور الگ نظام بنایا جاتا ہے اور نظام اتنا پیچیدہ ہوتا ہے کہ اس کی وضاحت اخباروں میں کی جاتی ہے، مختلف رسالے لکھے جاتے ہیں وہ لوگوں میں مفت تقسیم کئے جاتے ہیں، ٹیکس دہندہ عموماً پڑھے لکھے اور اعلیٰ تاجر ہوتے ہیں لیکن وہ بھی الجھ جاتے ہیں پھر نظام سمجھانے کیلئے کانفرنسیں، میٹنگیں اور مستقل نشستیں رکھی جاتی ہیں، بڑی مشکل سے جب وہ نظام سمجھ آجاتا ہے تو یکایک وہ نظام ختم کر کے دوسرا طریقہ کار شروع کر دیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے اور ایک حکومت ختم ہونے پر دوسری حکومت تو اپنا فرض سمجھتی ہے کہ ٹیکس کا نظام بدلا جائے۔

اصولِ ملائمت اور زکوۃ

اصولِ ملائمت اصول لچک ہی کا جزء اور اس کی ایک صورت ہے اور یہ بات پہلے آچکی ہے کہ اسلام نے نظام زکوۃ میں اصول لچک کی رعایت نہیں رکھی، اس کے برعکس اصول تیقن کی مکمل رعایت رکھی ہے، اس لئے زکوۃ کے بارے اسلام کا نظام بلاشبہ سخت ہے، حالات کیسے بھی آجائیں نظام زکوۃ میں تبدیلی ممکن نہیں ہے، البتہ بعض حالات کے پیش نظر یہ ہوسکتا ہے کہ زکوۃ کے جتنے مصارف ہیں بعض کو بعض پر ترجیح دیدی جائے یعنی جس مصرف میں خرچ کرنے کی ضرورت ہو توزکوۃ اس پر خرچ کر دی جائے اور جہاں تک اس دلیل کا تعلق ہے کہ اگر مالیاتی نظام ملائم نہ ہوتو حکومتی آمدنی میں اضافہ نہ ہوسکے گا تو نظام زکوۃ کے بارے یہ درست نہیں ہے کیونکہ اسلامی حکومت کا ذریعہ آمدن صرف زکوۃ نہیں بلکہ دوسرے بھی کئی ذرائع ہیں حتی کہ شرعی شروط کی رعایت کرتے ہوئے ٹیکس بھی نافذ کیا جاسکتا ہے۔

معاشی ترقی کا اصول اور زکوۃ

اسلام نے نظام زکوۃ میں اس اصول کی مکمل رعایت کی ہے لیکن نظام زکوۃ کا بنیادی مقصد ہی معاشی ترقی ہے اور یہ ایک وسیع موضوع ہے، تاہم خلاصہ اس کا یہ ہے کہ زکوۃ مخصوص اموال پر واجب کی گئی ہے، تمام اموال پر نہیں پھر زکوۃ کی متعدد شرائط ہیں اور اس کی شرح انتہائی کم ہے، اس لئے زکوۃ اغنیاء پر بوجھ نہیں بنتی، کاروبار متاثر نہیں ہوتا۔ دوسری طرف مستحقین اس سے مستفید ہوتے ہیں اور بے روزگاری ختم ہوتی ہے، قرون اولیٰ میں جب سرکاری سطح پر زکوۃ کا نظام رائج تھا تو معیشت

اقتصاد نے اتنی ترقی کی تھی کہ زکوۃ دینے والے تو سب تھے لیکن وصول کرنے والا نہ ملتا تھا۔

تناسبی ٹیکس اور تصاعدی ٹیکس

مقدار اور شرح کے تعین وعدم تعین کے اعتبار سے ٹیکس کی دو قسمیں ہیں۔(۱) تناسبی ٹیکس (۲) تصاعدی ٹیکس۔

(۱) تناسبی ٹیکس کا مفہوم

تناسبی ٹیکس وہ ٹیکس ہے جس کی شرح متعین اور طے ہوتی ہے خواہ صاحب مال کا مال کم وبیش ہوتا رہے، مثلاً آمدنی اور مالیت پر دس فی صد ٹیکس لگا دیا گیا تو یہ ٹیکس ہر قسم کی مالیت پر لاگو ہوگا مال خواہ کم ہو یا زیادہ، مثلاً ایک شخص کے پاس پچاس ہزار کی مالیت ہے وہ بھی دس فیصد ادا کرے گا اور جس کے پاس پچاس لاکھ کی مالیت ہے وہ بھی دس فیصد ٹیکس ادا کرے گا، گویا کہ اس میں فیصد کی نسبت سے ٹیکس کی مقدار طے اور متعین ہوتی ہے خواہ مالیت تبدیل ہوجائے۔ چونکہ اس میں نسبت طے ہوتی ہے اس لئے اسے تناسبی ٹیکس کہا جاتا ہے۔

(۲) تصاعدی ٹیکس کا مفہوم

تصاعدی ٹیکس وہ ٹیکس ہے جس کی شرح طے اور متعین نہیں ہوتی بلکہ اس کی شرح مالیت کی تبدیلی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، اگر مالیت کم ہو تو ٹیکس کی شرح بھی کم ہوتی ہے، پھر جوں جوں مالیت بڑھتی جاتی ہے ٹیکس کی شرح بھی بڑھتی جاتی ہے مثلاً آمدنی ٹیکس یوں مقرر کیا جائے کہ پہلی آمدنی پر دس فیصد، دوسری پر بارہ فیصد

اور تیسری بار آمدنی پر پندرہ فیصد ٹیکس لیا جائے گا یا ہزار وں کی مالیت پر دس فیصد، لاکھوں کی مالیت پر پندرہ فیصد اور کروڑوں کی مالیت پر بیس فیصد طے کر لیا جائے۔ اب اگر بکر کی ملکیت میں پچاس ہزار ہیں تو وہ دس فیصد ٹیکس ادا کرے گا اور خالد کی ملکیت میں دس لاکھ یا پچاس لاکھ ہیں تو وہ پندرہ فیصد ادا کرے گا اور محمود کی ملکیت میں دس کروڑ یا پچاس کروڑ ہیں تو وہ بیس فیصد ادا کرے گا وغیرہ۔

تصاعدی صعود سے ہے جس کے معنی چڑھنے کے آتے ہیں پھر باب تفاعل میں مشارکہ بھی پایا جاتا ہے یعنی طرفین کا چڑھنا، اس ٹیکس میں بھی اسی طرح ہوتا ہے کہ جوں جوں مالیت بڑھتی اور چڑھتی جاتی ہے اسی تناسب سے ٹیکس کی شرح بھی بڑھتی اور چڑھتی جاتی ہے، اس لئے اسے تصاعدی ٹیکس کہتے ہیں نیز اسے متزاید ٹیکس بھی کہتے ہیں، اس کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے کہ متزاید الزیادۃ سے ہے اور یہاں جانبین میں زیادتی ہوتی ہے۔

کونسا ٹیکس منصفانہ ہے؟

تناسبی اور تصاعدی ٹیکس میں سے کونسا منصفانہ ٹیکس ہے؟ اس بارے ماہرین معیشت واقتصاد کا شدید اختلاف پایا جاتا ہے، بعض تناسبی ٹیکس کو منصفانہ ٹیکس کہتے ہیں اور اس کے دلائل پیش کرتے ہیں اور بعض تصاعدی کے منصفانہ ہونے کے دلائل پیش کرتے ہیں۔

تصاعدی ٹیکس کے منصفانہ ہونے کے دلائل

چند دلائل مندجہ ذیل ہیں:

(۱) تصاعدی ٹیکس میں دولت مند افراد پر ”زیادتی دولت“ کا ضابطہ عائد ہوجاتا ہے، کیونکہ اس ٹیکس میں دولت و مالیت میں جس قدر اضافہ ہوتا ہے اس پر ٹیکس میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور دولت مند افراد میں یہ استطاعت موجود ہوتی ہے کہ تصاعدی ٹیکس ادا کریں۔

(۲) تصاعدی ٹیکس آمدنیوں کے فرق اور دولت کے وسیع تناسب کو کم کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے کیونکہ اس سے غریبوں اور امیروں کے درمیان دولت کے فاصلے کم ہوجاتے ہیں، گویا کہ اس سے امیری غریبی کا فرق کم ہوجاتا ہے اور معاشرے میں اقتصادی توازن پیدا ہوتا ہے۔

مخالفین کے اعتراضات

جو حضرات تناسبی ٹیکس کے قائل ہیں، وہ تصاعدی ٹیکس پر مختلف اعتراضات کرتے ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) تصاعدی ٹیکس کے گروپ کی تحدید کسی مضبوط اساس و بنیاد پر قائم نہیں ہوتی بلکہ اس میں محض تعسف اور تحکم سے کام لیا جاتا ہے اور ماہرین و مفکرین نے اس کے مساوات کے جو اصول و ضوابط بیان کئے ہیں وہ کوئی مستقل نہیں ہوتے۔

(۲) تصاعدی ٹیکس پر مسلسل عمل ممکن نہیں ہے کیونکہ اس سے عملی استحالہ لازم آتا ہے یعنی اگر اس کا تسلسل باقی رکھا جائے اور جتنی مالیت بڑھے ٹیکس کی شرح بھی بڑھتی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بالآخر ٹیکس کی شرح آمدنی کے برابر ہوجائے گی بلکہ بڑھ جائے گی۔

(۳) تصاعدی ٹیکس سے مالدار طبقوں پر زد پڑتی ہے اور سرمایہ کے ذخائر

ختم ہوجاتے ہیں، بالخصوص اشتراکی ممالک میں طبقاتی کشمکش اسی جانب لے جاتی ہے۔

(۴) تصاعدی ٹیکس سے بچت اور منافع بخش کاموں میں سرمایہ لگانے کی کشمکش ختم ہوجاتی ہے جس سے پیداواری سرگرمیاں متاثر ہوتی ہیں۔

فقه الزكوة(۲/ ۱۵۴)الباب التاسع،الفصل الخامس عن علم المالية (ص ۳۷۹) لرشيد الد فر ومبادى علم المالية(ص ۲۷۹) لفواد ابراهيم.

(۵) تصاعدی ٹیکس ترقی اور مالیت کے اضافہ میں بڑی رکاوٹ ہے، مالیت کے اضافہ کے ساتھ ساتھ جب ٹیکس میں اضافہ ہوگا اور اتنی بھاری رقم ٹیکس میں دینی پڑے گی تو لوگوں کے حوصلے پست ہوں گے، کاروبار کو ترقی ہی نہیں دیں گے۔ کیونکہ اس کا فائدہ حکومت کو ہوگا، خود انہیں استفادہ کا موقعہ کم ہی ملے گا۔

(۶) تصاعدی ٹیکس میں حکومت اپنے اختیارات کو استعمال کرتی ہے اور شرح کو تدریجاً بڑھانے کا فیصلہ وزیر مال کرتا ہے لیکن اس سلسلے میں اس کے پاس کوئی محکم اور واضح کلیہ نہیں ہوتا، یہ خالصۃً اس کی اپنی ذاتی رائے ہوتی ہے اور ٹیکسوں کے بارے میں اس کی پیش کردہ تجاویز پر اس کے اپنے افکار وخیالات کا رنگ غالب ہوتا ہے۔

(۷) تصاعدی ٹیکس سے بچت کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے، سرمایہ ملک سے فرار ہوتا ہے اوراس طرح صنعت وتجارت کی ترقی رک جاتی ہے، لہٰذا یہ ٹیکس معاشی لحاظ سے نقصان دہ ہے۔

اور تصاعدی ٹیکس کی تائید میں جو دلائل دیئے گئے ہیں ان کے مختصر جوابات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) زیادتی دولت کا ضابطہ جس طرح تصاعدی ٹیکس کی صورت میں عائد ہوتا ہے تناسبی ٹیکس سے بھی اس کے تقاضے پورے ہوتے ہیں، یہ بالکل غلط ہے کہ تصاعدی ٹیکس ہی اس کا ذریعہ ہے۔

(۲) تصاعدی ٹیکس کے ذریعہ امیر و غریب کے درمیان جس طریقہ سے فاصلے کم کئے جاتے ہیں وہ طریقہ مطلوب نہیں ہے، اس میں امیر سے مال چھین کر غریب بنانے کی منصوبہ بندی ہوتی ہے، فاصلہ کم کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ غریب ترقی کرکے امیر بنے، یہ تناسبی ٹیکس میں ہوتا ہے، اگر اس قدر ممکن نہ ہوتو کم از کم امیر تو غریب نہیں بنتا۔

دورِ حاضر میں تصاعدی ٹیکس کو منصفانہ قرار دیا جاتا ہے اور اس کی تائید کی جاتی ہے اور اول وہلہ میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ تصاعدی ٹیکس ہی منصفانہ ہے لیکن اگر غور وفکر سے کام لیا جائے اور اس کے نتائج پر غور کیا جائے تو اسے کوئی بھی عقلمند منصفانہ ٹیکس نہیں کہہ سکتا، اس کی کچھ وضاحت آگے آیا چاہتی ہے۔

زکوۃ تناسبی ٹیکس ہے

زکوۃ ٹیکس نہیں بلکہ ایک اہم عبادت ہے لیکن اس میں تناسب کی رعایت رکھی گئی ہے، تصاعد کی نہیں، مجازاً یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ زکوۃ تناسبی ٹیکس ہے، تصاعدی ٹیکس نہیں ہے یعنی زکوۃ کی شرح اور مقدار ہمیشہ کیلئے طے اور متعین ہے، اس میں کمی بیشی ممکن نہیں ہے مال کم ہو یا زیادہ بہر صورت اس طے شدہ شرح کے مطابق زکوۃ

لازم ہے،بشرطیکہ نصاب پورا ہو،جس کے پاس لاکھ روپیہ ہے وہ بھی اڑھائی فیصد کے حساب سے زکوۃ دے گااور جس کے پاس پچاس لاکھ ہے وہ بھی اور جس کے پاس کروڑ یا بیس کروڑ ہے وہ بھی، جس کی زمین کی پیداوار ایک من ہو وہ بھی عشر یا نصف عشر دے گااور جس کی پیداوار سو من ہو وہ بھی اسی تناسب سے عشر ادا کرے گا۔

خلاصہ یہ کہ زکوۃ تناسبی ٹیکس ہے تصاعدی ٹیکس نہیں ہے،البتہ ماہرین ٹیکس نے تصاعدی ٹیکس کے جو فوائد بیان کئے ہیں زکوۃ کے نظام میں ان فوائد اور تقاضوں کو پورا کیا گیا ہے۔

زکوۃ میں تصاعدی اصول کو کیوں مدنظر نہیں رکھا گیا ہے؟

پچھلی بحث میں تناسبی وتصاعدی ٹیکس کے درمیان جو موازنہ پیش کیا گیا ہے اگر اس کا خلاصہ ذہن میں ہو تو اس سوال کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی کہ اسلام نے نظام زکوۃ میں تصاعد وارتقاع کے پہلو کو کیوں نظر انداز کیا ہے؟ کیونکہ ماہرین اقتصادیات بھی اس کے قائل ہیں کہ تناسبی اصول وضوابط ہی منصفانہ اور عادلانہ ہیں اسلام نے اسی اصول کو اپنایا ہے اور تصاعدی پہلو کے تقاضوں کی بھی رعایت رکھی ہے

تصاعدی تقاضوں کی رعایت

اسلام نے نظام زکوۃ میں تصاعدی پہلو کے مقاصد،فوائد اور تقاضوں کو اس طرح پورا کیا ہے۔

☆زکوۃ سے مال و دولت کے وسیع فاصلے کم ہوتے ہیں اور کمزور وغریب طبقوں کا معیار بلند ہوتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ زکوۃ صرف ان لوگوں پر خرچ کی جاتی ہے جن کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا یا بہت کم مالیت ہوتی ہے یعنی فقراء اور مساکین۔

شریعت نے اس مصرف پر خرچ کرنے کی صرف تاکید نہیں کی بلکہ اسے ہی زکوۃ کا مصرف ٹھہرایا ہے، چنانچہ زکوۃ کی رقم رفاہِ عامہ، سڑکوں، پلوں، تعلیم وغیرہ پر لگا ہی نہیں سکتے۔ اس کے برعکس ٹیکس صرف مستحقین پر خرچ نہیں ہوتا، تمام حکومتی مصارف ومصالح پر صرف کیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے فقراء و مستحقین بہت کم مستفید ہوتے ہیں۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو بیشتر ٹیکس دولت مند اور غنی طبقہ سے لے کر انہیں ہی بالواسطہ طور پر واپس کردیا جاتا ہے مثلاً زرعی زمین پر ٹیکس اسلئے لیا جاتا ہے کہ اس کا اکثر حصہ اراضی کی اصلاح و بندوبست پر صرف کیا جائے، تاجروں سے تجارت اور گاڑی والوں سے گاڑی کا ٹیکس لیکر اس میں سے معتد بہ حصہ شعبہ تجارت اور سڑکوں پر خرچ کیا جاتا ہے، اسی وجہ سے ٹیکس دہندہ طبقہ کی طرف سے مطالبہ ہوتا ہے کہ ہم سے ٹیکس لیکر کسی دوسری جگہ خرچ نہ کیا جائے بلکہ ہمارے شعبہ کے فلاح و بہبود پر لگایا جائے تا کہ ہمیں اس کا فائدہ ہو، اس مقصد کیلئے مظاہرے ہوتے ہیں، ہڑتالیں کی جاتی ہیں اور مطالبات منوانے کیلئے دباؤ ڈالا جاتا ہے، یہ عملی پہلو ہے جو کہ ٹیکس کے حقیقی مفہوم ہی کے خلاف ہے، ٹیکس کا بنیادی مطلب یہ ہے کہ کسی مفاد کے حصول کے بغیر حکومت کو رقم دینا، لہٰذا اصل میں زکوۃ ہی ایک ایسا نظام ہے جس کی وجہ سے فقراء و مستحقین کا معیار بلند ہوتا ہے اور افراد ومعاشرہ کے درمیان

دولت کے فرق کو مٹا کر توازن قائم کیا جاتا ہے۔

(۲) تصاعدی ٹیکس کے قائلین جو مقاصد واہداف بیان کرتے ہیں، اسلام ان مقاصد کو دوسرے متعدد ذرائع سے بھی حاصل کرتا ہے مثلاً اسلام نے میراث اور وصیت کے قوانین جاری کئے ہیں، اسلام سود، رشوت، جوے، ذخیرہ اندوزی کو ناجائز کہتا ہے، ہر حرام کمائی سے منع کرتا ہے، ان سب ذرائع سے ملکیتوں اور آمدنیوں میں کٹوتیاں واقع ہوتی ہیں، سرمایہ داراور مالدارافراد کے پاس ناجائز طریقہ سے مال جمع نہیں ہوتا، مختلف طبقات قریب قریب آتے ہیں اور معاشرے میں عدل قائم ہوتا ہے

(۳) تصاعدی ٹیکس کی تائید میں کہاجاتا ہے کہ اس کی رو سے زیادہ سرمایہ والے دوسروں کی بنسبت ملک وملت کی ترقی میں زیادہ حصہ لیتے ہیں جو کہ ایک ایسی خوبی ہے جو تناسبی ٹیکس میں موجود نہیں ہے، اورزکوۃ میں چونکہ تناسبی پہلوملحوظ ہے، لہذا یہی بات زکوۃ کے بارے بھی کہی جاسکتی ہے لیکن یہ بات بالکل غلط ہے، تناسبی پہلو میں یہ خوبی احسن طریقہ سے موجود ہے وہ اس طرح کہ مثلاً ایک شخص کے پاس ایک لاکھ روپیہ ہے وہ اڑھائی ہزارروپیہ زکوۃ ادا کرے گااور جس کے پاس ایک کروڑ روپیہ ہے وہ اڑھائی لاکھ روپیہ زکوۃ دے گا، اس سے واضح ہوگیا کہ زیادہ مالدار شخص تناسبی پہلو کے اعتبار سے بھی ملک وملت کی تعمیر میں زیادہ حصہ لیتا ہے کیونکہ مال میں اضافہ کے ساتھ ساتھ زکوۃ کی مقدار بھی بڑھتی رہتی ہے، اگرچہ شرح متعین ہوتی ہے، گویا کہ معاشرے کی ترقی میں اس کا حصہ بھی بڑھ جاتا ہے اور وہ اسے محسوس بھی نہیں کرتا کیونکہ اس کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں ہوتا، اس کے برعکس تصاعدی پہلو میں مال میں اضافہ کے ساتھ ٹیکس کی مقدار ویسے ہی بڑھ جاتی

ہے پھر شرح میں اضافہ کرنے سے دوگنی تنگی ہوجاتی ہے جس کو بوجھ تصور کیا جانا یقینی امر ہے، اس کو امتیازی قانون بھی کہا جائے گا اور لوگ اس سے بھرپور طریقہ سے بچنے اور راہ فرار اختیار کرنے کی کوششیں کریں گے۔

حاصل یہ کہ اسلام نے نظام زکوۃ میں تصاعدی پہلو کی رعایت بالکل نہیں رکھی البتہ اس کا مذکورہ مقصد احسن طریقہ سے پورا کیا ہے بلکہ تصاعدی طریقہ کار سے بھی بہتر اور افضل طریقہ سے۔

(۴) نظام زکوۃ ابدی لائحہ عمل ہے، اس میں کمی بیشی کسی صورت میں ممکن نہیں ہے اور تصاعدی تقاضے اس میں پورے کردئے گئے ہیں بالفرض اگر تصاعدی طریقہ ٹیکس کی مزید ضرورت پیش آئے تو ایسی حالت میں اسلام ٹیکس لگانے کی اجازت دیتا ہے جس کی تفصیل اور شرائط پہلی آچکی ہیں، خلاصہ اس کا یہ ہے کہ خلیفہ وقت کو شرعاً یہ اجازت ہے کہ وہ آمدنیوں کے فرق، بجٹ کی ضرورتوں اور عدم توازن کے اسباب کی بناء پر تصاعدی وتناسبی ٹیکس، جو بھی اس وقت مناسب ہو عائد کرسکتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ ناانصافیوں اور زیادتیوں کا قلع قمع ہو، عدل قائم ہو اور ریاست کی ضرورتیں پوری ہوں بشرطیکہ یہ ٹیکس واقعی ضرورت کی وجہ سے عائد کئے جائیں اور اہل شوریٰ اس کی اجازت دیں اور دوسری تمام شرائط کا لحاظ کیا گیا ہو۔

ماخذ: فقہ الزکوۃ (۲/۶۵۳) بزیادۃ کثیرۃ

حیوانات میں زکوۃ تصاعدی ہے یا تناسبی؟

اس میں متاخرین نے بحث کی ہے کہ حیوانات کی زکوۃ میں تصاعدی پہلو رکھا گیا ہے یا تناسبی؟ اس بارے اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ تناسبی ہے اور بعض

کہتے ہیں کہ عکس تصاعدی ہے۔

پہلے یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ زکوۃ ایک خالص عبادت ہے اور اس کی بنا تعبد پر ہے لہٰذا اگر حیوانات کی زکوۃ میں تصاعد وتناسب میں سے کوئی پہلو موجود نہ ہو یا کوئی ایک موجود ہو یا کسی مقدار میں ایک پہلو ہو اور دوسری میں دوسرا پہلو ہو تو بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

اس بارے محقق بات یہ ہے کہ حیوانات کی زکوۃ میں بھی اصلاً تناسبی پہلو کی قریب قریب رعایت رکھی گئی ہے، تصاعدی پہلو کی بالکل رعایت نہیں رکھی گئی البتہ ایسی صورت ملتی ہے کہ جس میں کچھ مصالح اور حکم کیلئے عکس تصاعدی کو مدنظر رکھا گیا ہے، اس اجمال کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) جو فقہاء کرامؒ گھوڑوں میں زکوۃ کے قائل ہیں جیسے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابراہیم نخعی وغیرہ ان حضرات کا قول یہ ہے کہ گھوڑوں کی قیمت لگا کر اس کا چالیسواں حصہ زکوۃ میں ادا کیا جائے گا، گھوڑے کم ہوں یا زیادہ، معلوم ہوا کہ ان کی زکوۃ کی شرح طے اور معین ہے۔

(۲) گائے کی زکوۃ کا شرعی حکم اس طرح ہے کہ تیس گائیوں پر ایک تبیع یا تبیعہ واجب ہے، تبیع اور تبیعہ گائے کے یک سالہ بچے یا بچی کو کہتے ہیں اور چالیس گائیوں پر ایک مسن یا مسنہ واجب ہے، مسن اور مسنہ دو سالہ بچے کو کہتے ہیں پھر ساٹھ پر دو تبیع واجب ہیں اور ستر پر ایک تبیع اور دو مسن واجب ہیں، اس سے آگے بھی یہی اصول ہے کہ ہر تیس پر تبیع اور ہر چالیس پر مسن واجب ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ ہر دس گائے پر تبیع اور مسن کا وجوب بدلتا ہے اور تیس گائے پر جو تبیع واجب ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ تیس سے لے کر انتالیس تک سب پر تبیع واجب ہے اور چالیس پر جو ایک مسن واجب ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ چالیس سے انسٹھ تک سب پر یہی ایک مسن واجب ہے وھو الاصح اس سے قدر مشترک یہ بات سامنے آئی کہ گائے کی زکوۃ میں چالیسویں حصے کا خیال رکھا گیا ہے گویا کہ چالیس گائے پر ایک مسن واجب ہے، یہی اصل شرح ہے، اگر جانوروں میں کمی بیشی ہوتی ہے تو شرح تو برقرار ہے لیکن زکوۃ کی مقدار کم وبیش ہو جاتی ہے چنانچہ تیس پر ایک تبیع واجب ہے اور تبیع مسن سے چھوٹا ہوتا ہے لہٰذا یہ کہنا بجا ہوگا کہ تبیع تیس سے انتالیس گائیوں کا چالیسواں حصہ یا اس کے قریب ترین ہے، یہی نصاب بھینسوں کا بھی ہے۔

(۳) اونٹوں کی زکوۃ کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

۵ سے ۹ تک	یک سالہ بکری
۱۰ سے ۱۴ تک	دو بکریاں
۱۵ سے ۱۹ تک	تین بکریاں
۲۰ سے ۲۴ تک	چار بکریاں
۲۵ سے ۳۵ تک	بنتِ مخاض (یکسالہ اونٹنی)
۳۶ سے ۴۵ تک	بنتِ لبون (دوسالہ اونٹنی)
۴۶ سے ۶۰ تک	حقہ (سہ سالہ اونٹنی)
۶۱ سے ۷۵ تک	جذعہ (چار سالہ اونٹنی)
۷۶ سے ۹۰ تک	دو بنت لبون
۹۱ سے ۱۲۴ تک	۲ حقے

۱۲۵ سے ۱۲۹ تک ایک بکری اور دو حقے

۱۳۰ سے ۱۳۴ تک دو بکریاں اور دو حقے

۱۳۵ سے ۱۳۹ تک تین بکریاں اور دو حقے

۱۴۰ سے ۱۴۴ تک ۴ بکریاں اور دو حقے

۱۴۵ سے ۱۴۹ تک ۲ حقے اور ایک بنتِ مخاض

۱۵۰ سے ۱۵۴ تک ۳ حقے فقط

۱۵۰ کے بعد قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ ہر پانچ اونٹوں پرایک بکری پھر ۲۵ سے ۳۵ تک بنتِ مخاض پھر ۳۶ سے ۴۵ تک بنتِ لبون پھر ۴۶ سے ۵۰ تک حقہ واجب ہے، اس کے بعد نئے سرے سے ہر پانچ پرایک بکری، ۲۵ پر بنتِ مخاض، ۳۶ پر بنت لبون، ۴۶ سے ۵۰ تک حقہ الخ۔

خلاصہ یہ کہ گویا ہر تیس اونٹوں پر بنتِ مخاض، ہر چالیس اونٹوں پر بنت لبون اور ہر پچاس اونٹوں پر حقہ واجب ہے، یہ تناسبی پہلو سے اقرب اس طرح ہے کہ گویا اونٹوں میں بھی چالیسواں حصہ ہی واجب ہے، چنانچہ چالیس پرایک بنت لبون ہے پھر جب اونٹوں کی تعداد کم وبیش ہوتی ہے تو زکوۃ کی شرح وہی ہے، البتہ زکوۃ کی مقدار کم وبیش ہوجاتی ہے، چنانچہ تیس پر ایک سالہ (بنتِ مخاض) واجب ہے، جسے تیس اونٹوں کا چالیسواں کہاجاسکتا ہے، اور پچاس اونٹوں میں تین سالہ (حقہ) واجب ہے جو بنتِ لبون سے بڑی ہے، اسے بھی پچاس اونٹوں کا چالیسواں حصہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

☆ ۵ اونٹوں پرایک بکری، ۱۰ پر دو بکریوں، ۱۵ پر تین بکریوں ۲۰ پر چار بکریوں

کے وجوب میں بھی تناسبی پہلو (چالیسویں حصے) کی رعایت موجود ہے کیونکہ یہاں اس ادنیٰ اونٹ کا لحاظ کیا گیا ہے جو آٹھ بکریوں کے برابر شمار کیا جاتا تھا یعنی آٹھ بکریاں اور ایک اونٹ برابر شمار کئے جاتے تھے۔اب ۵ اونٹ چالیس بکریوں کے برابر ہوئے اور ۵ اونٹوں پر ایک بکری واجب ہے تو چالیسواں حصہ ہی واجب ہوا، دس پر دو، پندرہ پر تین اور بیس پر چار بکریوں کے وجوب میں بھی یہی حال ہے پھر چونکہ ادنیٰ اونٹ کا لحاظ کیا گیا ہے اس میں احتیاط پیش نظر تھی لیکن اس کے باوجود یہ رعایت بھی دے دی گئی ہے کہ عفو پر مزید کچھ واجب نہیں کیا یعنی پانچ پر ایک بکری واجب ہے تو یہ حکم نو تک جاتا ہے، دس پر دو ہیں تو چودہ کا بھی یہی حکم ہے، درمیانی مقدار عفو ہے الخ۔

☆ادنیٰ اونٹ آٹھ بکریوں کے برابر شمار کیا گیا، اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ عہدِ نبوی اور زمانہ سابق میں تین طرح کے اونٹ ہوتے تھے (۱) بڑا اونٹ جو بارہ بکریوں کے برابر سمجھا جاتا تھا (۲) درمیانہ اونٹ جو دس بکریوں کے برابر شمار ہوتا تھا (۳) ادنیٰ جو کہ آٹھ کے برابر تصور ہوتا تھا جیسا کہ بہت سی روایات میں وارد ہوا ہے۔ المصالح العقلیہ (۹۵/۱)

(۴) مذکور ساری تفصیل اس وقت ہے کہ جانور سائمہ ہوں، اگر تجارت کے جانور ہوں تو بر بالاتفاق چالیسواں حصہ واجب ہے خواہ وہ کم ہوں یا زیادہ، اس میں تناسبی پہلو بالکل واضح ہے۔

(۵) بکریوں کی زکوۃ اس طرح ہے کہ چالیس بکریوں پر ایک واجب ہے، اس کے بعد ایک سو بیس تک عفو ہے پھر ایک سو اکیس پر دو بکریاں واجب ہیں اور

دوسو تک عفو ہے پھر دوسو ایک پر تین واجب ہیں، اس کے بعد تین سو ننانوے تک عفو ہے پھر چار سو پر چار بکریاں واجب ہیں، اس کے بعد ہر سو پر ایک ایک بکری واجب ہے۔ الخ

یہاں ظاہر ہے کہ اس زکوۃ کے تین مراحل ہیں:

(۱) ابتداء (۲) وسط (۳) انتہاء، ابتداء میں تو تناسبی پہلو ملحوظ ہے اور عام اموال زکوۃ کی طرح چالیسواں حصہ طے ہے، اور وسط میں عکس تصاعدی ہے یعنی جوں جوں بکریوں میں اضافہ ہوتا ہے ایک خاص نسبت سے ان کی زکوۃ کی شرح میں کمی آرہی ہے اور انتہاء میں پھر تناسبی پہلو ملحوظ ہے البتہ عام اموالِ تجارت کی بنسبت زکوۃ کی شرح کافی کم کردی گئی ہے یعنی ایک فیصد (۱۰۰/۱)۔

وسط اور انتہاء میں قدر مشترک امر یہ ہے کہ یہاں بکریوں کی زکوۃ کی شرح کم رکھی گئی ہے، شرح میں اس تخفیف کی کیا حکمت و مصلحت ہے؟ اس بارے محققین نے کئی مصالح ذکر کی ہیں۔

(۱) جزیرہ عرب میں مجموعی طور پر مال مویشی اور بکریوں کی کمی تھی، ان کی زکوۃ میں تخفیف کردی تا کہ لوگ ان کی طرف توجہ دیں اور ان کی نسل او رافزائش میں اضافہ ہو۔

(۲) شرعاً بھیڑ بکریوں کے بچوں کو بھی زکوۃ میں شمار کیا جاتا ہے اور ان کی بھی زکوۃ ادا کی جاتی ہے، دوسری طرف دوسرے حیوانات کی بنسبت بھیڑ بکریوں میں بچوں کی کثرت ہوتی ہے، کم عمری میں توالد وتناسل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، حمل کی مدت بھی کم ہوتی ہے اور درمیان کا وقفہ بھی مختصر ہوتا ہے، چنانچہ سال ڈیڑھ میں ایک

ے زائد مرتبہ اور ہر مرتبہ میں ایک سے زائد بچے جنم دے سکتی ہیں، وسط اور انتہاء میں بھی یہی چالیسواں حصہ فرض قرار دیا جاتا تو اس میں مالکوں کو ضرر اور نقصان ہو سکتا تھا اس لئے زکوۃ کی شرح میں ایک خاص نسبت سے تخفیف کر دی گئی ہے۔

فقہ الزکوۃ (۲/۶۵۲)

☆حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے انتہا میں ایک فیصد شرح مقرر کرنے کی حکمت یہ لکھی ہے کہ اس میں سہولت اور آسانی ہے۔

المصالح العقلیہ (۱/۹۵)

یعنی بھیڑ بکریوں کے رکھوالے عموماً تعلیم یافتہ نہیں ہوتے، تفصیل، حساب وکتاب اور پیچیدگی سے بچنے کیلئے طے کر دیا گیا کہ ہر سو بکری پر ایک بکری دیدیا کرو۔

ٹیکس کی ضمانتیں اور زکوۃ کی ضمانتیں

ٹیکس سے فرار

ٹیکس میں آدمی کو اپنا مال دینا پڑتا ہے جس کی محبت اس کے دل میں رچی بسی ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ٹیکس دہندگان مختلف حیلوں اور بہانوں سے ٹیکس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، یہاں تک کہ جو عام حالات میں لوگوں سے امانت دارانہ معاملات کرتے ہیں وہ بھی حکومت کو، جو ایک معنوی وجود ہے ٹیکس دینے سے گریز کا جذبہ رکھتے ہیں۔

فرار کے اسباب ووجوہ

اس فرار کے متعدد نفسیاتی عوامل ہیں جن میں چند مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ہر مالدار شخص چاہتا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس باقی رہے۔

(۲) یا وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو ٹیکس اس سے لیا جارہا ہے وہ مبنی بر انصاف نہیں ہے۔

(۳) یا اس کا خیال ہے کہ وہ جو ٹیکس دیتا ہے، حکومت کی جانب سے اسے فلاحی اقدامات کی صورت میں اس کا صلہ نہیں ملتا۔

(۴) یا وہ سمجھتا ہے کہ حکومت ٹیکسوں کی رقوم کو مفاد عامہ میں صرف نہیں کرتی۔

(۵) یا اس کی رائے میں حکومت وصول زیادہ کرتی ہے اور دیتی کم ہے۔

(۶) یا بعض لوگ اس لئے ٹیکس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ دوسرے لوگ ایسا کر رہے ہیں۔

(۷) یا ٹیکس دہندہ ایک ٹیکس سے اس لئے فرار اختیار کرتے ہیں کہ یہ دوسرے ظالمانہ ٹیکس کا بدل ہو جائے وغیرہ۔

جس قدر ٹیکس بھاری ہوگا لوگوں کے فرار کا جذبہ اسی قدر زیادہ ہوگا، اسی طرح ٹیکس دہندگان اس صورت میں بھی ٹیکس سے فرار چاہیں گے جب وہ ٹیکسوں کے وجوب اور ان کے مصارف سے مطمئن نہ ہوئے ہوں۔

فرار کے اسالیب اور طریقے

ٹیکس سے فرار اختیار کرنے یا ٹیکس چوری کے مختلف طریقے ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) قانون میں موجود خامیوں سے بھی ٹیکس دہندگان ٹیکس سے بچنے کی سعی

کرتے ہیں۔

(۲) بعض اوقات غلط گوشوارے داخل کردیتے ہیں۔

(۳) مشینری اورآلات پر آنے والے اخراجات بڑھاچڑھا کر دکھا تے ہیں۔

(۴) بسا اوقات دولت کو چھپا لیتے ہیں ۔

(۵) ایک سرمایہ دار ایک سے زائد بینک کھاتے رکھتا ہے۔

(۶) مختلف ناموں سے بینک اکاؤنٹ کھولتا ہے ۔

(۷) بوگس شرکت

(۸) ایک شخص ایک سے زائد کاروبار کرتا ہے یا غلط ناموں سے متفرق کاروبار میں شریک رہتا ہے ۔

(۹) خرید وفروخت کا ریکارڈ نہ رکھنا۔

(۱۰) بعض سرمایہ دار ٹیکس چوری کیلئے بعض قانونی ذرائع بھی اختیار کرتے ہیں مثلاً:

(۱) کاروباری منافع جات کو منتقل کرنے کیلئے ٹرسٹ قائم کرنا۔

(۲) کمپنیوں کے حصص کو کم یا برائے نام قیمت پر اپنے عزیزوں کو فروخت کرنا۔

(۳) دوران سال کمپنیوں کے منافع جات کا تقسیم نہ کرنا اور یہ ظاہر کرنا کہ وہ متوقع نقصان کی تلافی کیلئے رکھے ہیں۔

(۴) ذیلی اور عارضی کمپنیوں کو عارضی رکھنا وغیرہ۔

فرار کے نقصانات

بہر حال بہت سے لوگ ٹیکسوں سے فرار کے مختلف ذرائع اختیار کرتے ہیں جن سے متعدد نقصانات رونما ہوتے ہیں۔

(ا) خزانے کو نقصان پہنچتا ہے اور اس کے محصولات میں کمی آتی ہے۔

(ب) کچھ افراد پورے ٹیکس ادا کرتے ہیں اور چوری سے اصل وزن غیر منصفانہ طور پر ان کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔

(ج) محصولات میں کمی مزید ٹیکسوں کے عائد ہونے کا سبب بنتی ہے۔

(د) محصولات میں کمی کی بنا پر بہت سے مفید منصوبے پایہ تکمیل کو پہنچنے سے رہ جاتے ہیں۔

(ہ) اس دھوکہ دہی اور بے ایمانی سے عام اخلاقی حالت کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔

فرار کا سد باب اور حصول ٹیکس کی ضمانتیں

جدید مالی قوانین میں ٹیکس سے فرار کے سد باب کے لئے بعض ضوابط بھی مقرر کئے گئے ہیں مثلاً:

(ا) مالی اداروں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ ٹیکس دہندہ کا حساب اور ضروری کاغذات چیک کر سکتے ہیں۔

(ب) ٹیکس دہندہ اپنے حقیقی گوشوارے داخل کرے بلکہ بعض ملکوں میں یہ بھی شرط ہے کہ یہ بیانات حلفیہ ہوں اور عدم صحت بیان کی صورت میں سزا بھی رکھی

گئی ہے۔

(ج) جس شخص کے بارے میں معلوم ہو کہ اس نے اپنے گوشوارے غلط داخل کئے ہیں اس سے ہرجانہ وصول کرنا۔

(د) ملازمین وغیرہ کی تنخواہوں اور آمدنیوں سے ادائیگی سے پہلے ہی ٹیکس وضع کرلینا۔

(ہ) ٹیکس چوری کرنے والوں پر دیوانی اور فوجداری جرمانہ عائد کرنا۔

(و) ٹیکس کے مقروض پر خزانے کا امتیازی حق جواس کے دوسرے قرض خواہوں پر ترجیح کا حامل ہو۔

ان سب ضوابط کے باوجود مالیاتی ادارے ٹیکس سے فراراور ٹیکس چوری کو ختم کرنے میں اپنے عجز کا اظہار کرتے رہتے ہیں بالخصوص ان اموال میں جن کو چھپایا جاسکتا ہے، کیونکہ درحقیقت اس کا تعلق قانون کی دفعات سے نہیں ہے بلکہ ضمیر کی اصلاح سے ہے۔

شریعت میں زکوۃ کی ضمانتیں

زکوۃ کی صورت حال ٹیکس کی اس مذکورہ صورت حال سے قطعی طور پر مختلف ہے اور مسلمان زکوۃ کو اس زاویہ نظر سے نہیں دیکھتے جس زاویہ نظر سے ٹیکس دہندگان ٹیکس کو دیکھتے ہیں، اسلام نے زکوۃ کے سلسلے میں جو ضمانتیں مقرر فرمائی ہیں وہ بنیادی طور پر دو قسم کی ہیں (۱) دینی اور خلاقی ضمانتیں (۲) قانونی وانتظامی ضمانتیں

دینی اور اخلاقی ضمانتیں

مسلمان زکوۃ کو اپنے اور حکومت کے درمیان ایک معاملہ نہیں سمجھتا بلکہ اپنے اور خدا کے درمیان ایک معاہدہ تصور کرتا ہے اور یہی زکوۃ کے عبادت ہونے کا مفہوم ہے، اس مفہوم کو ابوبکر بن العربیؒ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ حقیقی مستحق اللہ سبحانہ ہے اور اللہ نے اپنے اس حق کو ان لوگوں کی جانب منتقل فرمادیا ہے جن کے رزق کی ذمے داری **وما من دآبة فی الارض الا علی الله رزقها** کہہ کر اللہ نے خود اپنے ذمے لی ہے۔

امام کاسانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مال کے ایک حصے کو اللہ تعالیٰ کے لئے علیحدہ کردینا زکوۃ ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اس مال کا فقیر کو مالک بنادے یا جو اللہ سبحانہ کا نائب (حاکم وقت) جو کہ مالدار سے لے کر فقیر کو دے، اسے مالک بنادے، چنانچہ فرمایا۔

الم یعلموا ان الله هویقبل التوبة عن عباده ویاخذ الصدقات

(التوبہ : ۱۰۴).

کیا وہ جانتے نہیں کہ اللہ اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور زکاتیں لیتا ہے۔

اور فرمانِ نبوی ہے کہ صدقہ فقیر کے ہاتھ میں جانے سے پہلے رحمٰن کے ہاتھ میں جاتا ہے۔ مجمع الزوائد (۱۱۲/۳) تفسیر الطبری (۴۵۹/۱۴)

غرض زکوۃ عبادت ہے اور عبادت کا مفہوم ہی یہ ہے کہ عمل پوری طرح خالصتاً للہ کیا جائے۔ البدائع (۳۹/۲) ایچ ایم سعید کمپنی کراچی

قال ابن العربی فی احکام القرآن له(۲/۴۹۴)تحت قوله تعالی:الم یعلموا ان الله یقبل التوبة الخ(سورة التوبة:۱۰۴) هذه الآیة نص صریح فی ان الله تعالی هو الآخذ للصدقات وان الحق لله،والنبی واسطة فان توفی فعامله هو الواسطة والله حی لایموت،فلایبطل حقه،کماقالت المرتدة، فی الحدیث الصحیح(الصحیح لمسلم)ان الصدقة لتقع فی کف الرحمن قبل ان تقع فی کف السائل فیربیها کمایربی احدکم فلوه اوفصیله والله یضاعف لمن یشاء.

زکوۃ دہندہ کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ زکوۃ کے ذریعے اس پر کوئی زیادتی ہورہی ہے،اس لئے کہ اس کا عقیدہ ہے کہ زکوۃ اللہ کا مقرر کردہ فریضہ ہے اوراللہ سبحانہ سراپا عدل ہے اور وہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا وہ خود رب العباد ہے۔

جب مسلمان کا تصور ہی یہ ہے کہ زکوۃ اس کے اوراس کے رب کے درمیان ایک معاہدہ ہے جو ہر پوشیدہ اور خفیہ بات کو جانتا ہے،اورجانتا ہے کہ اللہ نقیر اور قطمیر (ریزے اور دانے) کا بھی حساب کرے گا تو اس کے زکوۃ سے فرار کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا،اس لحاظ سے مسلمان کی تربیتِ اسلامی ہی ادائے زکوۃ کی سب سے بڑی ضمانت ہے کیونکہ اسلام،مسلمان کی تربیت ان خطوط پر کرتا ہے کہ اس میں زہد دنیا اور رغبت آخرت پیدا ہوتی ہے،وہ راہ خدا میں خرچ کرتا ہے اور تمام دنیا کی نعمتوں پر اللہ اوررسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کوترجیح دیتا ہے،کہ اگر دنیا کے تمام لذائذ اور جملہ نعمتیں ایک طرف ہوں اوراللہ اوررسول کی محبت دوسری جانب ہو اور اسے ان دونوں میں سے کسی کے اختیار کا موقع دیا جائے تو وہ بلاشبہ اللہ

اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کو اختیار کرے گا،خود اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے۔

قل ان کان آباء کم وابناء کم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ واللہ لایھدی القوم الفاسقین ٥(التوبہ:۲۴)

آپ فرمائیں اگرتمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اورعورتیں اور برادری اور مال جوتم نے کمائے ہیں اورتجارت جس کے بندہونے سے تم ڈرتے ہو اورحویلیاں جوتم پسند کرتے ہو،تم کو اللہ سے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اوراس کی راہ میں جہاد سے عزیز ہیں توانتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم نازل کردیں اور اللہ تعالیٰ فاسق اقوام کو ہدایت نہیں دیتے۔

اسلام کی اس تربیت کے زیراثر مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ مال کا حقیقی مالک اللہ ہے اور وہ اس مال میں بطور نیابت احکام الٰہی کے مطابق تصرف کرتا ہے، چنانچہ قرآن بیان کرتا ہے کہ مؤمنین نے دومرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استفسار کیا کہ وہ کیا خرچ کریں؟ قرآن نے ایک مقام پر اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ایک مرتبہ انفاق کو بیان فرمایا اور دوسرے مقام پر مصارف کو بیان کیا۔

یسالونک ماذا ینفقون قل العفو (البقرۃ:۲۱۹)

وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ فرمائیں کہ جو بچ جائے۔

یسألونک ماذا ینفقون قل ماانفقتم من خیرفللوالدین والاقربین والیتامی والمساکین وابن السبیل وما تفعلوا من خیر فان اللہ بہ

علیمo(البقرۃ:۲۱۵)

آپ سے پوچھتے ہیں کیا چیز خرچ کریں ؟آپ فرمائیں ماں،باپ،اور نزدیک رشتے والوں اور یتیموں اور محتاجوں،اور راہ کے مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھی تم مال خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ بنی تمیم کا ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے پاس بہت سامان ہے فرمایئے اسے کس طرح خرچ کروں؟آپ ﷺ نے فرمایا کہ زکوۃ ادا کرو،اس نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذرا مختصر ارشاد فرمایئے،آپ نے فرمایا کہ قرابت داروں،مساکین اور مسافروں کا حق ادا کرو اور اسراف نہ کرو،اس نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر میں آپ کے ایلچی کو زکوۃ ادا کردوں تو کیا میں اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک بری ہو جاؤں گا؟آپ نے فرمایا ہاں اور تمہیں اجر ملے گا اور جو اس میں ردو بدل کرے گا گناہ اس پر ہوگا۔

مجمع الزوائد(۶۳/۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے پاس ایک دینار ہے،آپ نے فرمایا کہ اپنے اوپر صدقہ کرلے،اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور بھی ہے،آپ نے فرمایا کہ اپنے بیٹے پر صدقہ کردے،اس

نے کہا کہ میرے پاس ایک اوربھی ہے،آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنی بیوی کو دیدے،اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور ہے،آپ نے فرمایا کہ اب تم جو مناسب سمجھو کرو۔مستدرک الحاکم (۱/۱۴۵)

بعض صحابہ کرام آپ ﷺ کی خدمت میں پورا مال نذر کر دیتے اور اپنی ضرورت روک کرچاہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے صرف فرمائیں،آپ ﷺ اس پر انہیں تنبیہ فرماتے،چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک شخص انڈے کے برابر سونا لے کر آیا اور اس نے عرض کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ مجھے کان میں سے ملا ہے،آپ اسے لے لیجئے،یہ میری جانب سے صدقہ ہے لیکن میرے پاس اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے،اس پر آپ ﷺ نے اعراض فرمایا،پھروہ بائیں جانب سے آیا،اوریہی عرض کی،آپ ﷺ نے پھر اعراض فرمایا پھروہ دائیں جانب سے آیا،آپ نے پھر اعراض فرمایا،پھر وہ پیچھے سے آیااورعرض کی،آپ ﷺ نے سونے کاڈلااس کے ہاتھ سے لے کر اس طرح پھینکا کہ اگراس کے لگ جاتا تواسے تکلیف پہنچتی،پھر فرمایا کہ تم میں سے کوئی جس شے کا مالک ہوتا ہے اسے صدقہ لے کر آجاتا ہے اورخود لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے بیٹھ جاتا ہے،بہترین صدقہ وہی ہے جو تونگری کے ساتھ ہو۔الذہبی (۱/۴۱۳)

یہ ہے ایمان کا صحیح اور سچااثراور یہ ہے اسلامی تربیت کی تاثیرجوایک مسلمان کوآمادہ کرتی ہے کہ وہ خود ولی امر کے پاس آتا ہے اوراس سے اپنے مال کی زکوۃ لے لینے کی درخواست کرتا ہے،نبی علیہ السلام کے بعدبھی اس طرح کے

واقعات ملتے ہیں، چنانچہ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس لوگ آئے کہ ہمارے گھوڑوں کی زکوۃ لے لیجئے۔ مجمع الزوائد (۶۹/۳) ایک شخص شہد کی زکوۃ لے کر آیا اور اس نے کہا کہ جس مال پر زکوۃ ادا نہ ہو اس میں کوئی خیر نہیں ہے، ایضاً (۷۷/۳) حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی زمین کا عشر اور نصف عشر دینے کے بعد پیداوار کو تین حصوں میں تقسیم کرتے، ایک حصہ اپنے گھر والوں کی ضرورت کے لیے رکھتے، ایک حصہ بیج کی ضرورت کے لئے رکھ چھوڑتے اور ایک تہائی راہِ خدا میں صدقہ کر دیتے تھے۔ ایضاً (۶۸/۳)

مسلمان کا عقیدہ ہے کہ زکوۃ سے وہ خود پاک ہوتا ہے اور اس کا مال بھی پاک ہوتا ہے اور نشو ونما پاتا ہے اور جو کمی واقع ہوتی ہے وہ محض ظاہری ہے حقیقی نہیں ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وما اٰتیتم من زکوۃ تریدون وجہ اللہ فاولئک ھم المضعفون ○

(سورۃالروم: ۳۹)

اور جو زکوۃ تم اللہ کی رضا اور خوشنودی کیلئے دیتے ہو اسی سے تم مال کو دو گنا کرتے ہو۔

الشیطان یعد کم الفقر ویامرکم بالفحشاء واللہ یعدکم مغفرۃ منہ وفضلا.(البقرہ: ۲۶۸)

شیطان تم کو تنگی کا وعدہ دیتا ہے، اور بے حیائی کا حکم کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ کرتا ہے۔

وما انفقتم من شئی فھو یخلفہ وھو خیر الرازقین ○(سبا: ۳۹)

اور تم جو بھی خرچ کرتے ہو اس کا عوض دیتا ہے اور وہ بہترین روزی دینے والا ہے۔

اس مقام پر دورِ نبوت کی دو مثالیں ذکر کی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ عقیدہ وایمان کے زیراثر دینی ضمانتوں کی کس قدر گہری تاثیر تھی کہ اس وقت لوگ نہ صرف یہ کہ فرض زکوۃ از خود ادا کرتے بلکہ واجب سے زائد ادا کرتے تھے۔

سویدؓ بن غفلہ سے مروی ہے کہ عہدِ نبوت میں زکوۃ وصول کنندگاں کا حکم تھا کہ دودھ پلانے والا جانور زکوۃ میں نہ لیا جائے، جدا جدا جانوروں کو جمع کیا جائے اور یکجا جانوروں کو جدا نہ کیا جائے، میں ایک مرتبہ ایک زکوۃ وصول کنندہ کے ساتھ تھا، اس نے پانی کے ایک چشمہ پر جاکر لوگوں سے کہا کہ اپنے جانوروں کی زکوۃ دو، ایک شخص بڑی کوہان کا اونٹ لایا، اس نے اسے قبول نہیں کیا، پھر وہ دوسرا لے کر آیا جو اس نے قبول کرلیا اور کہا کہ میں اگر اچھے اونٹ زکوۃ میں لوں گا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناراض ہوں گے۔ نیل الاوطار (۱۳۳/۴) ومختصر السنن (۱۹۶/۲)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے عامل زکوۃ بنا کر بھیجا، میں ایک شخص کے پاس پہنچا، اس نے اپنا مال میرے سامنے جمع کیا تو اس میں ایک ہی بنتِ مخاض تھی، میں نے کہا بس یہی اونٹنی دے دو، یہی تمہاری زکوۃ ہے، اس نے کہا کہ اس کا دودھ بھی نہیں ہے اور سواری کے بھی کام نہیں آتی البتہ میں یہ بڑی موٹی اونٹنی دے دیتا ہوں، یہ لے لو، میں نے کہا کہ میں تو ایسا جانور نہیں لوں گا جس کے لینے کا مجھے حکم نہیں، چلو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس چلتے ہیں، اگر وہ قبول کرلیں تو میں لے لوں گا

چنانچہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس نے کہا کہ اے اللہ کے نبی: اس سے قبل میرے پاس اللہ کا رسول یا اس کا ایلچی نہیں آیا، اب یہ آپ کا ایلچی آیا تو میں نے اپنا تمام مال جمع کیا اس نے مجھے بتایا کہ میرے مال پر ایک بنت مخاض تھی، نہ تو اس میں دودھ ہے اور نہ سواری کے قابل ہے، اس پر میں نے ایک بڑی موٹی اونٹنی پیش کی، لیکن اس نے لینے سے انکار کردیا، اب یہ آپ کی خدمت میں پیش ہے آپ اسے قبول فرمالیں۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارے اوپر بنت مخاض ہی لازم تھی لیکن اگر تم بطور تطوع اور تبرع زیادہ اچھی اونٹنی دیتے ہو تو ہم قبول کرلیتے ہیں اور آپ ﷺ نے اس کے مال میں خیر وبرکت کی دعا کی۔

نیل الاوطار (۱۱۵/۴) ومختصر السنن (۱۹۸/۲)

حقیقت یہ ہے کہ یہ دینی ضمانتیں زکوۃ سے فرار سے مانع ہیں جبکہ تمام مغربی دنیا میں ٹیکسوں سے فرار ایک شیوہ عام ہے، چنانچہ اگر ٹیکس چوری نہ کی جائے تو ٹیکسوں کی شرح میں تخفیف کردی جائے اور محصولات میں اضافہ ہوجائے، اگر ٹیکس چوری کا سد باب ہوجائے تو بجٹ کی ضروریات پوری ہوجائیں۔

قانونی اورانتظامی ضمانتیں

ضمیر واخلاق پر عائد کی جانے والی دینی اور اخلاقی ضمانتوں کے علاوہ شریعت اسلامیہ نے تحصیل زکوۃ کی چند قانونی اور تنظیمی ضمانتیں بھی فراہم کی ہیں جو سب حسب ذیل ہیں۔

(۱) زکوۃ وصول کنندگان سے تعاون اور ان سے مال کے پوشیدہ نہ رکھنے کا حکم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے پاس کچھ ناپسندیدہ عامل آتے ہیں، جب وہ آئیں تو انہیں خوش آمدید کہو، اور جو وہ زکوۃ لینا چاہیں وہ انہیں لینے دو، اگر وہ انصاف کریں گے تو ان کے حق میں بہتر ہوگا اور اگر وہ ناانصافی کریں گے تو اس کا وبال خود ان پر ہوگا۔ مختصر السنن (۲/۲۰۲)

حضرت جریر بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ ہمارے پاس زکوۃ وصول کرنے والے آتے ہیں اور زیادتی کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ انہیں راضی رکھو، وہ بولے خواہ ہم پر ظلم کریں، آپ نے فرمایا کہ انہیں راضی رکھو حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس فرمان کے بعد ہمارے پاس جو زکوۃ وصول کنندہ آیا وہ راضی واپس گیا۔ ابوداؤد (۱/۱۳۴) کتاب الزکوۃ، باب رضی المصدق۔

بشیر بن خصاصیہؓ سے مروی ہے کہ ہم نے رسولؐ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی کہ زکوۃ وصول کرنے والے ہم پر ظلم کرتے ہیں کیا ہم ان کے ظلم کے بقدر مال چھپالیں، آپ نے فرمایا نہیں۔ سنن ابوداؤد (۱/۱۳۷) کتاب الزکوۃ، باب رضی المصدق۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ زکوۃ کی وصولیابی میں بعض وصول کنندگان کی سختی اور ان کا ظلم اس امر کا جواز فراہم نہیں کرتا کہ ان کے ساتھ تعاون نہ کیا جائے۔

باان سے مال چھپایا جائے،اورریاست کے میزانیہ کو متاثر کرنے کاذریعہ بنایاجائے لیکن اگر زکوۃ دہندگان یہ محسوس کریں کہ ان پر صریح ظلم کیاجارہا ہے تو پھر وہ زکوۃ ادا کرنے سے انکار کرسکتے ہیں جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زکوۃ کی مقداریں بڑی وضاحت سے بیان فرمادی ہیں جو ان کے مطابق زکوۃ لے تو درست ہے اوراگر ان مقداروں سے زائد وصول کرے تو زکوۃ دہندہ انہیں نہ دے۔

(۲) سقوط زکوۃ کے حیلوں کا ابطال

اسلام نے سقوط زکوۃ کے حیلوں سے بھی منع فرمایا ہے اگرچہ وہ بظاہر قانونی لحاظ سے جائز قرار پائیں، جنہیں اہلِ مغرب ٹیکس سے فرار کے جائز طریقے کہتے ہیں اور فقہ کی زبان میں انہیں حیل شرعی کہاجاتا ہے۔مثلاً سال گزرنے سے پہلے شوہر اپنی ملکیت بیوی کے نام کردے اوروہ سال گزرنے سے قبل شوہر کی طرف منتقل کردے،اس طرح کا حیلہ حرام ہے،اوراس کے حرام ہونے کہ دلیل حدیث انماالاعمال بالنیات ہے۔امام بخاریؒ نے حیلوں کے باطل ہونے پر حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے کہ"زکوۃ میں کمی بیشی کرنے کیلئے یکجاجانوروں کوجداجدانہ کیاجائے اورجداجداجانوروں کویکجانہ کیاجائے۔

صحیح البخاری کتاب الحیل

امام مالک رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ مثلاً تین اشخاص میں سے ہرایک کے پاس چالیس چالیس بکریاں ہوں توہرایک پر ایک بکری زکوۃ عائد ہوگی تووہ تینوں اپنی بکریاں جمع کرلیں تاکہ تینوں پر ایک ہی بکری

زکوۃ عائد ہو یا دو اشخاص میں ہر ایک کے پاس ایک سو ایک بکریاں ہوں، اس طرح دونوں پر تین بکریاں زکوۃ ہو جائے تو وہ علیحدہ علیحدہ کرلیں تا کہ ہر ایک پر ایک ہی بکری زکوۃ عائد ہو۔

فی الموطا للامام مالک(۱۱۳ ۱)کتاب الزکوة،باب صدقة الخلطاء،.......قال مالک:وتفسیرقوله:لایجمع بین متفرق انه یکون النفرالثلاثة الذین یکون لکل واحدمنهم اربعون شاة وقدوجبت علی کل واحدمنهم فی غنمه الصدقة،فاذاظهرالمصدق جمعوهالئلایکون علیهم فیهاالاشاة واحدة،فنهواعن ذلک،وتفسیرقوله:لایفرق بین مجتمع ان الخلیطین یکون لکل واحدمنهماماة شاة شاة فیکون علیهمافیهاثلاث شیاة فاذااظلهم المصدق فرقاعنهمافلم یکن علی کل واحدمنهماالاشاة واحدة فنهی عن ذلک.

امام یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ زکوۃ نہ دے یا زکوۃ سے بچنے کے لئے مال زکوۃ کسی اور کو دے دے اور یا کوئی اور ایسا حیلہ کرے جس سے زکوۃ ساقط ہو جائے کتاب الخراج (ص۸۰)

زکوۃ سے بچنے کیلئے حیلہ اختیار کرنا حرام ہے جیسا کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ بالا قول سے ظاہر ہے لیکن اگر کوئی شخص ایسا کوئی حیلہ کر لے تو قانوناً اس کے باطل ہونے کا حکم نہیں دیا جا سکتا، اس لئے کہ قانون کا تعلق اعمال کے ظاہر سے ہے نیتوں سے نہیں ہے، جب کہ فقہائے حنابلہ اور مالکیہ کے نزدیک یہ

حیلے قانونا بھی باطل قرار پائیں گے۔چنانچہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی کتب میں ہے کہ اگر کوئی شخص زکوۃ سے بچنے کیلئے جائیداد خرید لے تو اس جائیداد کی قیمت پر زکوۃ ہوگی۔شرح غایۃ المنتھی (۱/۱۰۱)والقواعدالنورانیۃ (ص۸۹)

(۳)زکوۃ نادہندہ سے جبراً وصولی

اگر کوئی مسلمان صاحبِ نصاب ہونے کے باوجود زکوۃ ادا نہ کرے تو خلیفہ وقت اس سے جبراً زکوۃ وصول کرسکتا ہے، زکوۃ خواہ اموال ظاہرہ کی ہو یا باطنہ کی،ابتداء میں اموال ظاہرہ وباطنہ کا کوئی فرق نہ تھا،حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک خاص مصلحت کے تحت اموالِ ظاہرہ وباطنہ کے درمیان تفریق کی تھی یعنی کہ اموال ظاہرہ کی زکوہ حکومت وصول کرے گی اور اموالِ باطنہ کی زکوۃ لوگ خود ادا کریں۔

زکوۃ کی وصولی کا معاملہ بڑا سخت ہے،یہی وجہ ہے کہ اگر ایک قوم من حیث القوم زکوۃ کی ادائیگی سے انکار کردے تو خلیفہ ان کے خلاف قتال بھی کرسکتا ہے جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مانعین زکوۃ کے خلاف باقاعدہ جہاد کیا تھا۔

فی کتاب الفقه الحنفی فی ثوبه الجدید (۳۵۶/۱) کتاب الزکوة والجدیر بالذکر انه لما کثرت الا موال فی عهد عثمان رضی الله تعالیٰ عنه وعلم ان فی تتبعها ضررا باصحابه رای المصلحة فی تفویض الاداء الیهم واجمع الصحابة رضی الله تعالیٰ عنهم علی ذلک فصاراصحاب الاموال کالوکلاء عن الامام فی اخراج زکوة اموالهم.

والعلماء یقررون ان حق ولی الامر لم یبطل بأخذ الزکوۃ والمطالبة بها،فلوعلم ان اهل البلاد لایؤدون الزکوۃ فانه یطالبهم بها ویجبر هم علی اخراجهااه

وفی فتح القدیر(۱/۴۸۷)وهذالایسقط طلب الامام اصلا ولهذا لوعلم اهل بلدة لایؤدون زکاتهم طالبهم بها.

(۴)زکوۃ نادہندہ پر مالی جرمانہ

اس بات پر تو تقریباسب کا اتفاق ہے کہ حکومت وقت زکوۃ نادہندہ سے زکوۃ کی مقدار زبردستی لے سکتی ہے لیکن کیا بطور سزا اس سے زائد بھی لے سکتی ہے؟ اس کا تعلق تعزیز مالی کے مسئلہ سے ہے،احناف کے ہاں مالی تعزیر جائز نہیں ہے البتہ دوسرے بعض ائمہ کے ہاں تعزیر مالی جائز ہے،اس بنا پر حکومت وقت ایسے شخص سے بطور سزا مزید مال ضبط کرسکتی ہے۔

حصہ سوم متفرقات

مالِ حرام سے ظالمانہ ٹیکس ادا کرنا

حرام مال سے ظالمانہ ٹیکس ادا کرنا درست ہے یانہیں ؟ اس بارے تفصیل یہ ہے کہ مال حرام کی دوصورتیں ہیں۔

(۱)وہ مال حرام جوحکومت وقت سے حاصل کیا گیا ہے جیسے سٹیٹ بینک اور نیشنل بینک کا سود،سرکاری پرائز بانڈ ز پر ملنے والا انعام،تمام سرکاری تمسکات اور دستاویز پر ملنے والے منافع،ایسے مال حرام سے ظالمانہ ٹیکس ادا کرنا شرعا جائز ہے اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شریعت کی رو سے یہ رقم لینے والے کیلئے حلال نہیں،اس پر لازم ہے کہ اسے کسی طرح حکومت کو واپس کردے ، دوسری طرف حکومت جو ظالمانہ ٹیکس وصول کرتی ہے وہ اس کی حقدار نہیں ہے،اس لئے اگر اس مال حرام کا حامل شخص اس کوظالمانہ ٹیکس کے نام سے سرکاری خزانے میں جمع کرادے توجائز ہے،اس طریق سے وہ حرام مال سے بھی جان چھڑا لے گااور ظالمانہ ٹیکس سے بھی بچ جائے گااور حکومتی قانون کی خلاف ورزی بھی لازم نہیں آئے گی۔

بعض حضرات نے حکومت سے حاصل کردہ مال حرام سے ٹیکس ادا کرنے میں کچھ تفصیل کی ہے کہ اس کی تین صورتیں ہیں۔

(۱)حکومت سے پہلے حرام وصول کرلے پھر وہی مال ٹیکس میں ادا کردے

(۲)براہِ راست مال حرام حکومت سے وصول نہ کرے بلکہ چیک کے ذریعہ بینک کے توسط سے ٹیکس میں ادا کردے۔

(۳)اپنی طرف سے پہلے ظالمانہ ٹیکس ادا کردے پھر بعد میں اتنی ہی مقدار میں مال حرام کی مد میں کسی طریقہ سے وصول کرلے۔

ان میں سے پہلی دوصورتیں جائزنہیں ہیں اور آخری صورت جائز قرار دی گئی ہے۔مال حرام اوراس کے شرعی مصارف واحکام (ص۷۰،۷۱)

لیکن صحیح یہی ہے کہ مذکورہ تینوں طریقوں سے مال حرام ٹیکس میں دینا صحیح ہے۔ان میں وجہ فرق موجودنہیں ہے،یہ فرق ذہن میں آسکتا ہے کہ بعض علماء کا موقف یہ ہے کہ اگرکسی نے بینک یا کسی سرکاری ادارہ میں رقم رکھی اور اس پر سود ملے تواپنے اختیار سے وہ سود لینا اورکہیں صدقہ کرنا صحیح نہیں ہے،البتہ اگر لاعلمی میں وصول کرلیاتو صدقہ کردیاجائے،اس موقف کے مطابق یہ توجیہ ہوسکتی ہے کہ پہلے دواقوال میں اپنے اختیار سے سود لیکر ٹیکس میں ادا کرنا پڑتا ہے اس لئے درست نہیں ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اس بارے میں بھی راجح قول دوسرا ہے کہ وہ سودی رقم بینک سے لے لیناجائز بلکہ ضروری ہے،اگروہاں چھوڑدی جائے تواس سودی ادارے کا تعاون لازم آئے گا اور وہ اس کوغلط جگہ استعمال کریں گے۔

حاصل یہ کہ حکومت سے جو مال حرام وصول ہوا ہے خواہ وہ کسی بھی طریقہ سے ہواس سے ٹیکس ادا کرنادرست ہے اوراس کی موقع ومحل کی مناسب سے کوئی صورت اختیارکی جاسکتی ہے،تاہم یہ رخصت ہے،عزیمت یہی ہے کہ اس سے بھی بچا جائے۔

(۲)وہ مال حرام جوحکومت وقت کے علاوہ کسی پرائیویٹ ادارے بینک یا فرد سے حاصل کیا گیاہے،ایسے مال حرام سے ٹیکس ادا کرنا کسی صورت میں جائزنہیں

ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ایسا مال، اگر اصل مالک معلوم ہو تو اس کو یا اس کے ورثا کو واپس کرنا ضروری ہے، اگر مالک معلوم نہ ہو تو احوط قول کے مطابق کسی مستحق زکوۃ شخص کو قابض و مالک بنا کر دینا ضروری ہے اور ایک قول کے مطابق اس میں تملیک ضروری نہیں ہے رفاہِ عامہ اور مصالح عامہ جیسے مصارف میں بھی خرچ کیا جاسکتا ہے، یہ طے شدہ بات ہے کہ اس کا استعمال خود اپنے لئے جائز نہیں ہے اور اگر مال حرام حکومت کو ظالمانہ ٹیکس کی صورت میں ادا کیا جائے تو اس میں اپنے لئے استعمال پایا جاتا ہے، کیونکہ اگر اس مد میں یہ مال حرام نہ دیا جائے تو اپنی جیب سے حلال مال دینا پڑے گا، گویا کہ اس سے اپنا مال ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے، یوں دفع ضرر کی صورت میں حرام مال سے انتفاع ہوا، اس لئے جائز نہیں ہے۔

سود کی رقم سے ٹیکس ادا کرنے کا حکم

مذکورہ حکم سود کی رقم کا بھی ہے یعنی اگر کسی حکومتی ادارے سے سود ملا ہے تو وہ ٹیکس میں دیکر جان چھڑانا جائز ہے اور اگر کسی پرائیویٹ ادارہ یا شخص سے سود حاصل کیا ہے تو اسے ٹیکس میں دینا کسی صورت میں جائز نہیں ہے، سود اور عام مال حرام کا ایک ہی حکم اس لئے ہے کہ سود بھی مالِ حرام کی ایک قسم ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ مال حرام کی بنسبت سود زیادہ بڑا گناہ ہے اور اس بارے سخت وعیدیں آئی ہیں، باقی دونوں کا حکم اور مصرف ایک ہی ہے۔

امداد المفتین (ص۸۵۱) کتاب الربوا والقمار میں ہے۔

سوال: گورنمنٹ آف انڈیا نے پرائز بانڈ کے نوٹ جاری کئے ہیں، ان پر بحساب.....فی صدی سالانہ سود ملتا ہے، میں کہ گورنمنٹ آف انڈیا کو تقریبا تین ہزار

روپیہ سالانہ ٹیکس دیتا ہوں، تو کیا میرے لئے جائز ہوگا کہ میں بانڈ خرید کر اس کا سود اس نیت سے لوں کہ مجھ سے گورنمنٹ یہ رقم انکم ٹیکس جو شرعاً ایک ناجائز مطالبہ ہے وصول کر چکی ہے وہ میں واپس لے رہا ہوں، جو لوگ گورنمنٹ کو کسی قسم کا ٹیکس وغیرہ نہیں دیتے ہیں ان کو مذکورہ قسم کا سود لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جس قدر روپیہ گورنمنٹ آپ سے بذریعہ ٹکس وصول کرتی ہے، اسی قدر روپیہ گورنمنٹی بینک اور دوسرے محکمات سرکاری سے جس طرح ممکن ہو، وصول کر سکتے ہیں، گورنمنٹ اس کا نام سود رکھے یا کچھ اور آپ اپنا جائز مطالبہ وصول کرنے کی نیت سے لیں تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں اور آپ کے حق میں سود نہ ہوگا، ایسے مواقع میں فقہاء رحمۃ اللہ علیہم نے اس کی بھی اجازت دی ہے کہ اپنے حق کی مقدار چوری یا غصب کر کے بھی اگر کوئی شخص اپنے مدیون سے وصول کرے تو جائز ہے۔

قال الشامی فی باب حد السرقة: فاذظفر بمال مدیونه له الاخذ دیانة بل الاخذ من خلاف الجنس علی ماںذکره قریباً.

(شامی ص ۲۱۸ ج ۳)

دوسرے مسلمان جن کا کوئی مطالبہ ٹیکس وغیرہ کی وجہ سے بذمہ گورنمنٹ نہیں ہے، ان کیلئے سود لینا جائز نہیں، اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے لیکن سود کے بارے میں جو شدید وعیدیں قرآن و حدیث عموم کے ساتھ وارد ہوئی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے احتیاط فتوی میں یہی ہے کہ ناجائز قرار دیا جائے۔ (**هذه المسئلة الا خیرة تتعلق بمسئلة اخذ الربافی دارالحرب والراجح هوالحرمة کما لایخفی**)

فتاوی رحیمیہ (۱۴۹/۵) کتاب الزکوۃ میں ہے۔

سوال: علماء دین اس بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ اسلام میں ڈھائی فیصد زکوۃ فرض ہے، اس کے علاوہ سرکاری ٹیکس جو بہت زیادہ ہوتا ہے وہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے کیا اس صورت میں بینک (سرکاری بینک کماسیاٗتی ریاض محمد) کے سود سے ٹیکس ادا کرنے کی شریعت کی طرف سے گنجائش ہے یانہیں؟

الجواب: زکوۃ ادا کرنا عبادت ہے اور بہت سی مصیبتوں اور بلاؤں سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، غریب رشتہ دار وغیرہ کی امداد کرکے دعائیں لینا ہے، اس میں رنجیدہ خاطر اور دل برداشتہ نہ ہونا چاہئے، بینک کی زائد رقم کے غرباء حقدار ہیں، سرکاری ٹیکس ناقابلِ برداشت ہے اور بینک بھی سرکاری ہے، اسلئے بینک کے سود سے سرکاری ناقابل برداشت ٹیکس ادا کرنے کی گنجائش ہے مگر جہاں تک ہوسکے، بچنے کی کوشش کی جائے کہ اس میں سود اپنے ستعمال میں لانے کے مرادف ہے۔

احسن الفتاوی (۲۱/۷) باب الربا والقمار میں ہے۔

سوال: سود کی رقم جو بینک میں حفاظت کیلئے جمع کروانے سے حاصل ہوتی ہے، کیا اس کو گورنمنٹ کی طرف سے عائد کردہ انکم ٹیکس میں ادا کردینا اور اس غیر شرعی رقم کے ذریعہ غیر شرعی ٹیکس سے براءت حاصل کرنا جائز ہے یانہیں؟

الجواب: بینک سے جو سود ملتا ہے وہ حکومت کے خزانے سے نہیں ہوتا لہٰذا اس سے انکم ٹیکس ادا کرنا صحیح نہیں بلکہ مالک معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مساکین پر واجب التصدق ہے البتہ دوسرے سرکاری محکموں سے جیسے بھی ممکن ہو ادا کردہ ٹیکس کی مقدار اس کیلئے حلال طیب ہے، اس لئے کہ انکم ٹیکس کا مروج دستور محض ظلم ہے

اور مظلوم اپنا حق بذریعہ چوری اور غصب بھی لے سکتا ہے۔

قال ابن عابدین رحمه الله في حد باب السرقة: فاذا ظفر بمال مديون له الاخذ ديانة بل له الاخذ من خلاف الجنس على ماذكرناه قريباً. رد المحتار (۳/۲۰۶)

فتاوی مفتی محمود (۳۴۱/۸) میں ہے۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علمادین دریں مسئلہ کہ روپیہ جمع کرنے پر بینک جو سود عوام الناس کو دیتا ہے، کیا عوام الناس اس سود کی رقم سے حکومت وقت کے عائد کردہ ٹیکس ادا کر سکتے ہیں؟ کیونکہ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ زکوۃ کے علاوہ تمام تر ٹیکس غیر اسلامی ہیں چونکہ بینک کا سود بھی غیر اسلامی ہے، اس لئے ٹیکس کی ادائیگی سود کی رقم سے کرنے میں کوئی حرج نہیں درآنحالیکہ اس دور میں کارخانہ حکومت تمام تر ٹیکسوں پر چل رہا ہے، اگر عوام الناس اس روش پر چل پڑے تو ملازمین کی تنخواہیں اور ملک گیر منصوبہ بندی از قسم دفاعی، رفاہی، فلاحی و تعلیمی وغیرہ حرام مطلق سود کے پیسے سے متصور ہوگی۔

جواب: بینک میں روپیہ داخل کر کے جو کچھ نام نہاد منافع رقم متعینہ سالانہ وہاں سے روپیہ داخل کنندہ کو ملتا ہے وہ شرعاً سود ہے، لینا اس کا جائز نہیں، اس رقم کو فقراء ومساکین پر بغیر نیت ثواب کے تقسیم کرنا لازم ہے جبکہ بینک جمع کنندہ کو سود والی رقم وصول ہوجائے۔ بینک سے جو رقم سود کی ملتی ہے اگر یہ رقم گورنمنٹ کے خزانے سے نہیں تو اس سے انکم ٹیکس ادا کرنا صحیح نہیں ہے، اس لئے رد علی المالک اور تصدق علی الفقراء میں سے کوئی صورت نہیں پائی گئی، اور اگر سود کی رقم گورنمنٹ کی

طرف سے ملتی ہے تو ردعلی المالک ہونے کی وجہ سے انکم ٹیکس وغیرہ ٹیکسوں میں یہ رقم دینا جائز ہوگا۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

عوام الناس میں مشہور ہے کہ ہر مال حرام اور سود کی رقم سے ظالمانہ ٹیکس ادا کرنا صحیح ہے خواہ وہ سرکاری ادارہ سے لیا گیا ہو یا پرائیویٹ ادارہ سے اور بعض علماء کا بھی شاید یہی موقف ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے اور اس نظریہ کی کوئی بنیاد اور شرعی وجہ موجود نہیں ہے۔البتہ بعض حضرات کی عبارات سے اس کا شبہ ہوسکتا ہے، اس لئے وہ عبارات نقل کرکے ان کی وضاحت ضروری ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی بعنوان ''ٹیکس میں سود کی ادائیگی'' جدید فقہی مسائل (۱/۴۰۶، ۴۰۷) زمزم پبلشرز میں لکھتے ہیں۔

ٹیکس جوحکومت عوام سے وصول کرتی ہے، وہ دوطرح کے ہیں، بعض منصفانہ ہیں اورخود اسلام میں ان کی گنجائش ہے مثلاً پانی، روشنی، سڑک، ہسپتال، لائبریری، اور پارک وغیرہ سہولتوں کے بدلے بلدیہ جو ٹیکس لیا کرتی ہے وہ اس کا فائدہ محسوس طور پر ہماری طرف لوٹادیتی ہے، دوسرے قسم کے ٹیکس ایسے ہیں جن کو غیر منصفانہ اور ناواجبی کہا جاسکتا ہے، مثلاً انکم ٹیکس جو بسااوقات اسی فیصد تک پہنچ جاتا ہے۔شرعی اعتبار سے غیر منصفانہ ہونے کے کے علاوہ واقعہ ہے کہ اس قسم کے ٹیکس غیر معقول بھی ہیں کہ ایک شخص اپنے گاڑھے پسینہ سے جو کچھ حاصل کرے آپ اس کا اسی فیصد اجتماعی مفاد کیلئے وصول کرلیں۔

پہلی قسم کے ٹیکس میں بینک کی سودی رقم دینادرست نہ ہوگا، اس لئے کہ

وہاں سود دینا گویا اپنی ذات میں سود کا استعمال ہوگیا، اس لئے کہ وہ بھی ان قومی سہولتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے اور فقہاء نے ایسے ٹیکس کی اجازت دی ہے جیسا کہ ابوالحسن مرغینانی رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔

فان اريد بها مايكون بحق ككرى النهر المشترک واجر الحارس والموظف كتجهيزالجيش وفداء الاسارى وغيرها جازت الكفالة بهاعلى الاتفاق. هدايه(۳/۱۰۹)

دوسری قسم کے ٹیکس میں یہ رقم دی جاسکتی ہے کہ اس طرح یہ مال حرام اس حکومت یا ادارہ کو پہنچتا ہے جس نے یہ مال امانت داروں کو سود کے نام سے دیا ہے۔

مولانا رحمانی نے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے سود کے درمیان صراحۃً فرق بیان نہیں کیا لیکن آخر میں جو وجہ بیان کی ہے اس سے واضح ہورہا ہے کہ صرف حکومتی اداروں سے ملنے والا سود ٹیکس میں دیاجاسکتا ہے عام سود ٹیکس میں نہیں دیا جاسکتا اگر مولانا کا یہی مطلب ہے تو ان کا موقف بالکل درست ہے لیکن ان کی عبارت اس مطلب کی ادائیگی سے قاصر ہے، عبارت میں ابہام پایا جاتا ہے، جیسا کہ ظاہر ہے اور اگر مولانا کا مطلب عموم ہے یعنی ہر قسم کا سود ٹیکس میں دیا جاسکتا ہے تو ہمارے ناقص علم میں یہ موقف صحیح نہیں ہے کما ذکرنا نیز پہلی قسم کو جو ٹیکس میں شامل کیا گیا ہے وہ مجازاً ہے ورنہ علم الاقتصاد کی رو سے وہ ٹیکس نہیں بلکہ فیس یا قیمت ہے، ٹیکس، فیس اور قیمت کے درمیان فرق ابتدا میں بیان کر چکے ہیں۔

آگے چل کر (۱/۴۱۹،۴۲۰) میں بعنوان ''انشورنس کے سود سے ٹیکس ادا کرنا'' کے تحت لکھتے ہیں۔

اگر غیر ارادی طور پر کسی مجبوری کے تحت رقم جمع کرنے پر سود مل گیا، جیسے انشورنس میں حاصل شدہ اضافی رقم یا فکس ڈپازٹ میں ملا ہوا سود اور گورنمنٹ کی طرف سے اس پر کوئی ناواجبی ٹیکس جیسے کسٹم ڈیوٹی، انکم ٹیکس اور سیل ٹیکس وغیرہ عائد کیا گیا تو یہ سود کی رقم ٹیکس میں ادا کی جاسکتی ہے اس لئے کہ شریعت کا اصول یہ ہے کہ اگر کسی کا مال حرام اپنے پاس آجائے اور مالک معلوم ہو تو مالک کو پہنچانے کی کوشش کی جائے۔

فی رد المحتار(۲/۱۳۰) باب البیع الفاسد، اذا علم المالک بعینه فلا شک فی حرمته ووجوب رده علیه. الخ

ہمیں اس مسئلہ سے اتفاق نہیں ہے اور کوئی بھی صاحب علم اس سے اتفاق نہیں کرسکتا، اس میں جو جزئیہ نقل کیا گیا ہے وہ خود اس مسئلہ کے خلاف ہے، انشورنس کمپنی ایک پرائیویٹ ادارہ ہے، اگر اس سے سود کسی نے حاصل کرلیا تو حکومتی ٹیکس میں ادا کرنا اس کا کونسا مصرف ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سود اس کمپنی کو واپس کردیا جائے۔ اگر چہ صحیح یہ ہے کہ یہ سود ثواب کی نیت کئے بغیر صدقہ کیا جائے گا۔ اس کی توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ شاید ہندوستان میں بیمہ کمپنی سرکاری ہوں، پرائیویٹ نہ ہو۔

اس نیت سے سودی معاملہ کرنا کہ سود سے ٹیکس ادا کرے گا۔

مذکورہ حکم اس وقت ہے کہ کسی نے لاعلمی میں یا غیر اختیاری طور پر حکومت

سے کی جائے یا ضم الذمة الی الذمة فی الدین. سے کی جائے۔دونوں تعریفوں کے مطابق ٹیکس کی کفالت کی صحیح ہے .وھو الاصح والتفصیل فی النصوص الآیة

پھر اگر اصیل کے حکم سے کفالت قبول کی ہوتو کفیل اتنی رقم اصیل سے لے سکتا ہے اوراگر اس کے بغیر ٹیکس ادا کرنے کی کفالت قبول کی تو یہ تبرع ہے اوروہ اصیل پر رجوع نہیں کر سکے گا۔

فی الدرالمحتار(۳۳۰/۵)کتاب الکفالة،وصح ضمان الخراج والرھن به وکذا النوائب ولوبغیرحق کجبایات زماننا فانھا فی المطالبة کالدیون بل فوقھا حتی لواخذت من الاکار فله الرجوع علی مالک الارض وعلیه الفتویٰ صدر الشریعة.....والقسمة ای النصیب من النائبة وقیل ھی النائبة الموظفة وقیل غیرذلک وایاما کان فالکفالة بھا صحیحة،صدر الشریعة.

وقال ابن عابدین رحمه الله:(قوله وکذا النوائب)جمع نائبة وفی الصحاح النائبة المصیبة واحده نوائب الدھراه وفی اصطلاحھم مایأ تی،قال فی ألفتح:قیل اراد بھا مایکون بحق کاجرة الحراس وکری النھر المشترک والمال الموظف لتجھیز الجیش وفداء الاسری اذا لم یکن فی بیت المال شئی وغیرھما مما ھوبحق فالکفالة به جائزة بالا تفاق لانھاواجبة علی کل مسلم موسربایجاب طاعة ولی الامر فیما فیه مصلحة المسلمین ولم یلزم بیت المال اولزمه ولاشئی فیه وان ارید بھا مالیس

بحق كالجبايات الموظفة على الناس فى زماننا ببلاد فارس على الخياط والصباغ وغيرهم للسلطان فى كل يوم اوشهرفانها ظلم فاختلف المشائخ فى صحة الكفالة بها فقيل تصح اذالعبرة فى صحة الكفالة وجود المطالبة امابحق اوباطل ولهذا قلنا ان من تولى قسمتها بين المسلمين فعدل فهوماجورو ينبغى ان من قال:الكفالة ضم فى الدين يمنعهاهنا،ومن قال فى المطالبة يمكن ان يقول بصحتهااويمنعهابناء على انها فى المطالبة بالدين اومطلقااه فان قال بالدين منعها وان قال مطلقا اى بالدين وغيره اجازها (قوله حتى لواخذت الخ) تائيد للقول بجواز الكفالة بها فانها اذااخذت من الاكار وجاز له الرجوع بها بلا كفالة فمع الكفالة اولى،لكن فى البزازية لايرجع الاكار فى ظاهر الرواية وقال الفقيه يرجع ....(قوله وعليه الفتوى)راجع لقوله ولو بغيرحق وكذا مسئلة الاكار كما علمت وفى البحر وظاهر كلامهم ترجيح الصحة اى فى كفالة االنوائب بغير حق ولذا قال فى ايضاح الاصلاح والفتوى على الصحة وفى الخانية الصحيح الصحة ويرجع على المكفول عنه ان كان بامره اه وعليه مشى فى الاختياروالمحتاروالملتقى،نعم صحح صاحب الخانية فى شرحه على الجامع الصغير عدم الصحة وكذلك افتى فى الخيرية بعد م الصحة مستندا لما فى البزازية والخلاصة من انه قول عامة المشائخ ولمافى العمادية من ان الاسير لوقال لغيره:خلصنى فدفع المامور مالا وخلصه قال السرخسى:يرجع وقال صاحب المحيط:لاوهوالاصح وعليه الفتوى

قال:فهذا يدفع مافى الاصلاح ومافى الخانية والعلة فيه ان الظلم يجب اعدامه ويحرم تقريره وفى القول بصحة تقريره اه ملخصا.

قلت:غاية الأمرانها قولان مصححان ومشى على الصحة بعض المتون وهوظاهر اطلاق الكنز وغيره لفظ النوائب فكان ارجح.واما مسئلة الاسير فليس فيها كفالة ولاامرالرجوع على انه فى الخانية صحح انه يرجع على الاسير وبه جزم فى شرح السير الكبير بلاحكاية خلاف كماقدمناه فى متفرقات البيوع،فاما قوله والعلة فيه الخ فهو مدفوع بما رأيته فى هامش نسختى المنح بخط بعض العلماء واظنه السيدالحموى مماحاصله ان المراد من صحة الكفالة بالنوائب رجوع الكفيل على الاصيل لوكانت الكفالة بالامر لاانه يضمن لطالبهاالظالم لان الظلم يجب اعدامه ولا يجوزتقريره فلا تغتر بظاهرالكلام وهوتنبيه حسن ولهذالم يذكرواالرجوع على الكفيل بل اقتصروا على بيان الرجوع عن الاصيل لوالكفالة بأمره وليس فى هذا تقريرالظلم بل فيه تحقيقه لانه لو لا الكفالة يحبس الظالم المكفول ويضربه ويكلفه ببيع عقاره وسائراملاكه بثمن بخس اوبالاستدانة بالمرابحة ونحوذلک مماهو مشاهد، ولعلهم لهٰذااجازواهذه الكفالة وان لم يجيروها بثمن خمرو نحو ه والله سبحانه اعلم.

قال ابن عابدين فى ردالمحتار(٢/٣٣٦)كتاب الزكوة قلت: ومعنى صحة الكفالة بالنائبة التى بغير حق ان الكفيل اذاكفل غيره بها

بامره كان له الرجوع عليه بما اخذه الظالم منه لا بمعنى انه يثبت للظالم حق المطالبة على الكفيل فلا يرد ماقيل ان الظلم يجب اعدامه فكيف يصح الكفالة به كما سنحققه في محله ان شاء الله تعالىٰ.

رجوع کے چند مسائل

اگر کسی نے دوسرے کی طرف سے ٹیکس ادا کردیاتواس پر رجوع کے بارے یہ تفصیل ہے کہ اگر اس کے حکم سے ادا کیا ہے اور طے ہوا تھا کہ وہ بعد میں اسے ادا کردے گا تو وہ اس پر اتنی رقم میں رجوع کرسکتا ہے اور اگر اس نے حکم نہیں دیا تھااور نہ یہ طے ہوا تھا کہ وہ اس کی ادائیگی کرے گا،اس نے ازخوداس کی طرف سے ادائیگی کردی تو یہ تبرع اور احسان ہے،اسے اصل شخص پر رجوع کا حق حاصل نہیں ہے۔

☆اگر مزارع سے زمین کا ٹیکس لیا گیاتوایک قول کے مطابق وہ مالک سے لے سکتا ہے۔کیونکہ وہ مجبور ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ رجوع نہیں کرسکتا۔

☆اگر شریکین میں سے ایک نے دوسرے کی اجازت کے بغیر ٹیکس یا خراج ادا کیا تو یہ تبرع واحسان ہے اسے رجوع کا حق حاصل نہیں ہے۔

☆کسی کرایہ دار سے گھر یا دوکان کا مقرر شدہ ٹیکس لے لیا گیاتو وہ مالک پر رجوع کرسکتا ہے۔

☆اگر پڑوسی سے بلا اجازت ٹیکس لے لیا گیاتووہ بھی اصل پر رجوع نہیں کرسکتا۔

☆حکم اور اجازت کی صورت میں اصل مالک پر رجوع درست ہے لیکن

اس کی شرط یہ ہے کہ اصل مالک نے اپنی رضا اور اختیار سے حکم دیا ہو، اگر مجبور ہو کر حکم دیا ہو تو اکراہ کی وجہ سے اس حکم کا کوئی اعتبار نہیں ہے، نہ ہی دوسرے کے لئے اس پر عمل کرنا ضروری ہے، لہٰذا اگر اس نے ٹیکس دیدیا تو اصل مالک پر رجوع نہیں کر سکے گا۔

فی الدرلمختار(۵/ ۳۳۰)کتاب الکفالة،حتی لواخذت من الاکار فله الرجوع علی مالک الارض وعلیه الفتوی،صدرالشریعة واقره المصنف وابن الکمال وقیده شمس الائمة بما اذا امره به طائعافلومکرها فی الامرلم یعتبر لما امره بالرجوع ذکره الاکمل.

قال ابن عابدین رحمه الله:(قوله حتی لواخذت الخ)تأیید للقول بجوازالکفالة بها.......لکن فی البززیة لایرجع الاکارفی ظاهرا الروایة وقال الفقیة:یرجع وان اخذ من الجارلایرجع،وزاد فی جامع الفصولین ان احد الشریکین لوادی الخراج یکون متبرعا،نعم فی اخر اجارات القنیة برمزظهیرالدین المرغینانی وغیره المستاجر اذا اخذ منه الجبایةالراتبة علی الدور والحوانیت یرجع علی الاخر وکذاالاکار فی الارض وعلیه الفتوی(قوله وعلیه الفتوی)راجع لقوله ولوبغیرحق وکذامسئلة الاکارکما علمت...(قوله وقیده شمس الأئمة)لامرجع فی کلامه لهذا الضمیروالمناسب قول النهر:وفی الخانیة:قضی نائبه غیره بامره رجع علیه وان لم یشترط الرجوع وهوالصحیح وقیده شمس الأئمة الخ ای قیده قوله بامره وهذا التقیید ظاهر اذ لاخفاء ان امرالمکره

غیرمعتبر......وحینئذ فالمعنی انه اذاکان مکرها بالأمر بالقضاء لم یعتبرامره فی حق الرجوع لفسادالامر بالا کراه فلا رجوع للمأمور علیه .

وفی البزازیة علی الهندیة(۴/۱۰۱)کتاب الزکوة،الباب الثالث فی العشر والخراج والجزیة،بخلاف ماأذاامن الاکار والارض فی یده ولم یقدر علی الامتناع یرجع علی المالک لا نه مضطرفا شبه معیرالرهن وفی ظاهرا الروایة لایرجع وهو الصحیح ولا یرد علیه ما اذانصب اهل قریة عاملا بالاتفاق لیجبی خراجهم فتواری واحد واخذ خراجه من العامل حیث یرجع علی المتواری لان الاذن ثمه وجد.

ٹیکس کی وجہ سے خیار عیب

کسی نے اس شرط پر زمین خریدی کہ اس پر ٹیکس نہیں ہے یا کم ہے لیکن بعدمیں معلوم ہوا کہ اس پرقانونا ٹیکس لوگو ہے یا طے شدہ مقدار سے زیادہ ہے تو ایک قول کے مطابق یہ بیع فاسد ہے اور ایک قول کے مطابق مشتری کو اختیا رحاصل ہے اگر چاہے تو یہ زمیں خرید لے اور اگر چاہے تو واپس کرکے اپنی رقم لے لے۔

فی الفتاوی البزازیةعلی هامش الهندیة(۴/۴۶۸)کتاب البیوع، نوع فی الخراج،اشتری علی انها حرة من النوائب الدیوانیة او علی ان قانونه کذا فبان خلافه فی الاول اواکثرفی الثانی،قال الامام ظهیرالدین یفسد کالخراج وقال القاضی یخیرالمشتری وکذا بشرط ان لایؤخذ منه الجبایة ولو شرط الجبایة الا ولی علی البائع واتفقاعلیه جاز.

وصی کے لئے مالِ یتیم سے ٹیکس دینا

اگر وصی مجبور ہو اور خلاصی کی کوئی صورت موجود نہ ہو تو وہ یتیم کے مال سے اس کا ٹیکس ادا کرسکتا ہے۔

فی البزازیۃ علی ھاش الھندیۃ (۲۶۳/۶) کتاب الوصایا، الثامن فی دفع الظلم، الوصی اذا طولب بجبایۃ دار الیتیم ولو امتنع ازدادت المؤنۃ یؤدیھا.

خواب میں ٹیکس لینے اور دینے کی تعبیر

علامہ عبدالغنی النابلسی رحمۃ اللہ علیہ "تعطیر الانام فی تعبیر المنام" ص ۲۱۱ میں لکھتے ہیں: خواب میں اگر دیکھے کہ مسلمان کفار کو جزیہ دے رہا ہے تو یہ ذلت کی دلیل ہے اور اگر مسلمان کفار سے جزیہ وٹیکس لے رہا ہے تو یہ عزت ونصرت کی دلیل ہے۔

ظالمانہ ٹیکس وجوب زکوۃ سے مانع نہیں؟

شریعت کی رو سے ظالمانہ ٹیکس وجوبِ زکوۃ سے مانع نہیں ہے مثلاً ایک شخص نے آئندہ کوئی ظالمانہ ٹیکس ادا کرنا ہے اور ادائیگی سے پہلے زکوۃ ادا کرنے کی تاریخ آگئی تو تنی رقم ظالمانہ ٹیکس میں ادا کرنی ہے اس کی بھی زکوۃ ادا کرے گا، اسے زکوۃ سے مستثنیٰ نہیں کیا جائے گا یا مثلاً اس کے پاس نصاب برابر ہے لیکن اگر آئندہ ٹیکس ادا کرے گا تو نصاب کم ہو جائے گا تو فی الحال اس کو صاحب نصاب شمار کیا جائے گا اور زکوۃ ادا کرنی ہوگی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ظالمانہ ٹیکس شرعاً دین نہیں ہے۔

فی المحیط البرهانی(۳/۲۲۹)کتا ب الزکوۃ،الفصل العاشر: بیان منع وجوب الزکوۃ وکان الشیخ الا مام الزاهد احمد الطواویسی یحکی عن استاذہ الشیخ الامام عبد الواحد انه کان یقول:هذا اذا کان خراجا یؤخذ بحق فامایؤخذ بغیرحق کخراج المستقرض لایمنع وجوب الزکوۃ مالم یؤخذ منه قبل الحول لان هذا لیس بدین بل هومصادرۃ یؤخذ من ارباب الاراضی،فمالم یؤخذ منه حتی یصیر النصاب ناقصا لایمنع وجوب الزکوۃ الخ.

ٹیکس وصول کنندہ کی شہادت

جائز،عادلانہ اور منصفانہ ٹیکس وصول کنندہ اور اس محکمہ کے ملازمین کی شادۃ شرعاً معتبر ہے بشرطیکہ ان میں ردشہادت کی کوئی دوسری وجہ موجود نہ ہو، اور ظالمانہ ٹیکس کے وصول کنندہ اور اس محکمہ کے ملازمین کی شہادۃ قابل قبول نہیں ہے۔

اصل مسئلہ یہی ہے کیونکہ وہ فاسق ہیں اور فاسق کی شہادۃ قبول نہیں کیجاتی البتہ متاخرین کا فتوی اس پر ہے کہ اگر فاسق وجیہ اور صاحب مروت ہوتواس کی گواہی قبول کرلی جائے گی۔

فی الهدایة(۳/۱۷۱)کتاب الشهادۃ،شهادۃ العمال جائزۃ والمرادعمال السلطان عندعامة المشائخ لان نفس العمل لیس بفسق الااذا کانوا اعوانا علی الظلم وقیل العامل اذاکان وجیها فی الناس ذامروۃ لایجازف فی کلامه تقبل شهادته کمامرعن ابی یوسف فی الفاسق لانه لوجاهته لایقدم علی الکذب حفظا للمروۃ ولمهابته لایستأجرعلی

الشهادة الكاذبة.

منصفانہ توزیع وتقسیم پر اجر وثواب

عوام الناس پر ظالمانہ ٹیکس لاگو کرنا ایک ظلم ہے ہی لیکن ظلم پر ظلم یہ ہوتا ہے کہ بعض جابر و ظالم قسم کے لوگ ان ٹیکسوں کی تقسیم میں انصاف سے کام نہیں لیتے کسی کو بالکل معاف کر کے سارا بوجھ دوسرے پر ڈال دیتے ہیں یا کسی پر کم لاگو کر کے دوسرے پر اضافہ کر دیتے ہیں، نیز وصولی کے بعد بھی صحیح مصرف پر نہیں لگایا جاتا، غیر مصرف پر خرچ کر دیا جاتا ہے، اس بنا پر فقہاء کرامؒ نے لکھا ہے کہ ان ٹیکسوں کے لاگو کرنے کا ظلم اپنی جگہ پر ہے لیکن اگر کوئی عادل شخص یہ نظام سنبھال لے اور لوگوں سے اصول عدل وانصاف اور ٹیکس کے قواعد وضوابط کے مطابق ٹیکس وصول کرے کسی پر زیادتی نہ کرے اور وصولی کے بعد صحیح مصرف پر خرچ کرے تو باعث اجر وثواب ہے، لیکن اس مسئلہ کے بارے فقہاء کرام رحمہم اللہ نے لکھا ہے: "هذامما يعرف ولا يعرف" یعنی اس کی تشہیر نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ بعض لوگ یہی بتائیں کہ ہم عدل وانصاف سے کام لیں گے، لیکن بعد میں عدل وانصاف نہ کریں، یا ان کا اپنا خیال غلط بھی ہوسکتا ہے۔

فى الدرالمختار(۲/۳۳۶) كتاب الزكوة:

ويؤجرمن قام بتوزيعهابالعدل،وان كان الاخذبهاطلاًوهذايعرف ولايعرف كفالمادة الظلم.

قال ابن عابدينؒ:(قوله ويؤجرمن قام بتوزيعهابالعدل)اى بالمعادلة كماعبرفى القنية اى بان يحمل كل واحدبقدرطاقته لانه

لوترک توزیعهاای الظالم ربمایحمل بعضهم مالایطیق فیصیرظلماعلی ظلم ففی قیام العارف بتوزیعهابالعدل تقلیل للظلم فلذایؤجروهذاالیوم کالکبریت الاحمربل هوالدر.

قال الرافعی:.....(قول الشارح:وهذایعرف ولایعرف)وذلک الالوعرفنا الناس ان من قام بتوزیع المظالم المضروبة بالعدل یؤجریتجاسرالناس علی الدخول فی التوظیف بهازاعمین العدل کذبابخلاف ماااذالم یعرفواذلک اذدینهم یمنعهم من الدخول بهاوربمایحصل الکف عن مادة الظلم لعدم من یقوم به.

فی البزازیة علی هامش الهندیة(۱۰۵/۴)کتاب الزکوة،قال بعض المشائخ:من قسم هذاالمؤن وان بغیرحق علی السواء یکون ماجوراًلانهم جعلواالمؤن واجبالازماًلایدعونه فلایضاف الی القسام،ومن قام بهاعلی القسط یؤجروبه افتی بعض ائمة خوارزم وسیأتی ان شاء الله.

چونگی سے مال چھپا کر لے جانا

فتاوی رشیدیہ(ص ۴۹۹) میں ہے۔

سوال:ریل میں بلااجازت زیادہ اسباب رکھ لینادرست ہے یا نہیں؟علی ہذاچنگی سے چھپا کر مال لے جانا درست ہے یا نہیں ؟

جواب:سامان اجازت سے زیادہ لے جانا درست نہیں ہے فقط

چنگی سے مال بچانا

فتاوی محمودیہ (۴۱۰/۱۴) میں ہے۔

سوال: چنگی اور ریل کے کرایہ سے چوری جائز ہے یانہیں؟ یعنی اپنے مال کو ریل میں لائے اور کرایہ نہ دے یا خود آئے یا گارڈ وغیرہ کے ساتھ جائے اوراپنا مال لائے اور چنگی سے چھپا کرلائے تاکہ چنگی نہ دینی پڑے، یا ہے تو بڑھیا مال پٹی میں اور لکھ دیا گھٹیا تاکہ چنگی کم لگے؟

جواب: جھوٹ بولنا بھی ناجائز ہے اور چوری کرنے سے آبروریزی بھی ہوتی ہے، اس سے بچنا بھی واجب ہے۔

چونگی ناکہ کم دینے کیلئے خریداری بل کم بنوانا

آپ کے مسائل (۲۷۹/۸) میں ہے۔

سوال: ہم باہر سے جو سامان لاتے ہیں اس پر چنگی ناکہ ادا کرنا پڑتا ہے اور چنگی والے خریداری بل دیکھ کر چار فیصد وصول کرتے ہیں، ہم سیٹھوں سے جعلی بل بنواتے ہیں جس سے ناکہ کم ادا کرنا پڑتا ہے، کیا ایسا کرنا یعنی جعلی بل بنوا کرنا کہ چنگی کم ادا کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ جب کہ سرکاری ناکہ کم ہوتا ہے لیکن ٹھیکیدار بولی بڑھا بڑھا کر تقریباً دوگنا زیادہ کرلیتے ہیں، اگر یہ ٹھیکیدار بولی بڑھا کر ٹھیکہ زیادہ نہ کریں تو سرکاری شرح کم ہوگی۔

جواب: جعل سازی کو جائز تو نہیں کہا جاسکتا مگر چنگی وصول کرنا خود بھی ظلم ہے اور ظلم سے بچنے کیلئے اس میں کچھ تخفیف ہوجائے تو ہوجائے۔

محصول چونگی نہ دینا شرعاً کیسا ہے؟

آپ کے مسائل (۱۹۳/۶) میں ہے۔

سوال: محصول چونگی لینا یا دینا کیسا ہے؟ اگر کوئی شخص مال چھپا کر لے گیا تو اس کے لئے وہ مال کیسا ہے اور کیا چونگی ٹھیکیدار کو اس کی شکایتیں لگانا چاہیے؟۔

جواب: محصول چونگی شرعاً جائز نہیں، اگر مال و آبرو کا خطرہ نہ ہو تو نہ دی جائے

کسی تدبیر سے یا رشوت دے کر میونسپلٹی کو ٹیکس کم دینا

فتاوی رحیمیہ (۲۵۶/۶) میں ہے۔

سوال: ہماری کپڑے کی دکان ہے اور ہم باہر سے مال منگواتے ہیں، میونسپلٹی کے قانون کے اعتبار سے سو روپے مال پر ڈیڑھ روپیہ بطور ٹیکس حکومت کو دینا ضروری ہوتا ہے، بہت سے لوگ کسی تدبیر سے یا افسروں کو رشوت دیکر کم ٹیکس دیتے ہیں، تو یہ حرکت جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب: میونسپلٹی کا ٹیکس بچا کر پولیسوں اور افسروں کو رشوت دینا اور ان کو اس کا عادی بنانا کوئی اچھا کام نہیں ہے، اس سے بہتر تو یہی ہے کہ ٹیکس پورا دیدیا جائے، نہ دینے میں کبھی ذلیل اور بے عزت ہونے کا موقعہ آجاتا ہے اور خود کو ذلیل کرنا شرعاً جائز نہیں فقط

ٹیکس سے بچنے کیلئے اپنے آپ کو شادی شدہ بتانا

فتاوی محمودیہ (۳۹۱/۱۵،۳۹۲) میں ہے۔

سوال: میری سالانہ تنخواہ چار ہزار روپیہ ہے جس پر شادی شدہ کیلئے ۷۵روپے انکم ٹیکس لگتا ہے اور غیر شادی شدہ کیلئے دوسو روپے انکم ٹیکس لگتا ہے، میں غیر شادی شدہ ہوں، اگر گورنمنٹ کو شادی شدہ بتلا کر ۱۲۵ روپے انکم ٹیکس نہ دوں تو وہ میرے لئے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: یہ روپیہ تو آپ کے ہی ہیں کسی غیر سے آپ نے نہیں لئے، اپنے روپیہ غیر کو دینے سے آپ نے بچا، بے جا لینے والے کو نہیں دئے، آپ کے لئے درست ہیں لیکن غلط بیانی کر کے اپنے کو قانونی خطرہ میں ڈالنا کوئی دانشمندی نہیں۔

سود کی رقم سے ٹیکس ادا کرنا

فتاوی رحیمیہ (۱۴۹/۵) میں ہے۔

سوال: علماء دین اس بارے میں کیا فرماتے ہیں کہ اسلام میں ڈھائی فیصد زکوۃ فرض ہے، اس کے علاوہ سرکاری ٹیکس جو بہت زیادہ ہوتا ہے وہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔ کیا اس صورت میں بینک کے سود سے ٹیکس ادا کرنے کی شریعت کی طرف سے گنجائش ہے یا نہیں؟

الجواب: زکوۃ ادا کرنا عبادت ہے اور بہت سی مصیبتوں اور بلاؤں سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، غریب رشتہ دار وغیرہ کی امداد کر کے دعائیں لینا ہے، اس میں رنجیدہ خاطر اور دل برداشت نہ ہونا چاہئے، بینک کی زائد رقم کے غرباء حقدار ہیں

سرکاری ٹیکس ناقابلِ برداشت ہے اور بینک بھی سرکاری ہے، اس لئے بینک کے سود سے سرکاری ناقابل برداشت ٹیکس ادا کرنے کی گنجائش ہے مگر جہاں تک ہو سکے بچنے کی کوشش کی جائے کہ اس میں سود اپنے استعمال میں لانے کے مترادف ہے۔

مسجد کی رقم کا سود مسجد کے مکان کے ویرے (ٹیکس) میں استعمال کرنا

فتاوی رحیمیہ (۱۹۷/۹) میں ہے۔

سوال: ہماری مسجد کے پیسے بینک میں رکھے جاتے ہیں، اس پر جو سود ملا ہے اسے کس جگہ استعمال کریں؟ سنا ہے کہ مسجد کی بیت الخلاء میں استعمال کی گنجائش ہے مگر ہمارے ہاں بیت الخلاء تیار ہے اس میں ضرورت نہیں ہے، بعض متولیوں کا خیال ہے کہ مسجد کا جو مکان ہے، اس کا ٹیکس (ویرا) ادا کرنا ہے اس میں یہ رقم استعمال کریں تو ٹیکس ادا کرنے میں یہ سودی رقم ادا کرنا کیسا ہے؟

الجواب: مسجد کی رقم اور اس پر حاصل شدہ سود کا حساب رکھنا چونکہ ضروری ہوتا ہے، اس لئے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ سود کی رقم مسجد کے بیت الخلاء کی تعمیر یا مرمت میں استعمال کر سکتے ہیں، صورت مسؤلہ میں بیت الخلاء تیار ہے، اور سود کا حساب بتانا ضروری ہوتا ہے تو اس صورت میں مسجد کے مکان کے ٹیکس (ویرے) میں استعمال کرنے کی گنجائش ہے۔ فقط

ٹیکس تشخیص کرنے والے سے اپنا مال چھپانا

امداد الفتاوی (۱۵۲/۴) میں ہے۔

سوال: زید انکم ٹیکس ادا کرنے کی حیثیت رکھتا ہے تاہم معافی کے خیال سے اپنے مال تجارت کو تشخیص کنندہ ٹیکس سے چھپا کر اپنے کو نا قابل ثابت کرتا ہے، آیا یہ فعل زید کا ازروئے شرع شریف کیسا ہے؟

الجواب: گناہ تو نہیں لیکن خطرہ میں پڑنا بھی شرعا پسند نہیں۔

انکم ٹیکس کے محکمے کو رشوت دینا

آپ کے مسائل (۶/ ۱۷۹) میں ہے۔

سوال: انکم ٹیکس کا محکمہ خصوصاً اور دیگر سرکاری محکمے بغیر رشوت دیئے کوئی کام نہیں کرتے، جائز کام کیلئے بھی رشوت طلب کرتے ہیں، اگر رشوت نہ دیجائے تو ہر طرح سے پریشان کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ آدمی کا جینا دوبھر ہوجاتا ہے، مجبوراً آدمی رشوت دینے پر مجبور ہوجاتا ہے، اب گناہ کس پر ہوگا، دینے والے پر بھی یا صرف لینے والے پر؟ یہاں پر واضح کردوں کہ کوئی بھی شخص اپنی جائز اور محنت کی آمدنی سے رشوت دینے کیلئے خوش نہیں بلکہ مجبور ہوکر دینے پر تیار ہونا پڑتا ہے بلکہ مجبور کیا جاتا ہے۔

جواب:

رشوت اگر دفع ظلم کیلئے دی گئی ہوتو امید کی جاسکتی ہے کہ دینے والے کی بجائے صرف لینے والے کو گناہ ہوگا۔

حکومت کا نکاح پر ٹیکس لگانا ناجائز ہے۔

خیر الفتاوی (۵۸۴/۴) متفرقات نکاح میں ہے۔

سوال: بلدیہ ٹبہ سلطان پور نے شرعی نکاح پر ایک صد روپے شادی ٹیکس نکاح فیس عائد کی ہے جو کہ لڑکے اور لڑکی والوں سے وصول کی جاتی ہے جب کہ شریعت نے نکاح کی ترغیب دی ہے، یہ فیس شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: مذکورہ ٹیکس کا شرعاً کوئی جواز نہیں ہے۔

نکاح ٹیکس کا ظلم اور اس کا حیلہ

آجکل بعض یونین کونسلوں میں مہر کی مقدار کے تناسب سے ٹیکس لگایا جاتا ہے، مہر جتنا زیادہ ہوا تنا ہی زیادہ ٹیکس وصول کیا جاتا ہے، یہ ٹیکس بلاشبہ ظالمانہ ہے، اس کا مقصد سنتِ نکاح کی شرح کو کم کرنا ہے اور شرعی حکم کی حوصلہ شکنی ہی ہے اور اس کے مدمقابل بغیر نکاح کے اختلاط، زنا، فحاشی، بدکاری اور معاشقوں کی ترویج ہے، اس مشکل اور ظالمانہ ٹیکس سے بچنے کیلئے یہ حیلہ اختیار کیا جاسکتا ہے کہ مہر آپس کی رضامندی سے شوہر کی مالی حیثیت اور استطاعت کے مطابق زیادہ مقرر کردیا جائے لیکن نکاح فارم میں کم لکھ کر یونین کونسل والوں کے سامنے کم ہی کا اظہار کیا جائے، شرعاً اس طرح کرنے کی کوئی گنجائش ہے البتہ زبانی جو مہر طے ہوا ہے شوہر کے ذمہ اس کا پورا کرنا ضروری ہے چونکہ اصل مہر کو قانونی حیثیت حاصل نہیں ہے، اس لئے اختلاف کی صورت میں شوہر اصل مہر دینے سے انکاری ہوسکتا ہے، اس خطرہ کے پیش نظر عورت کے حق کو تحفظ دینے کیلئے گواہوں اور فریقین کی موجودگی میں الگ سے تحریر بھی لکھوا دی جائے اور اس میں اصل مہر لکھ دیا جائے، نیز نکاح فارم میں کم مہر لکھا تو یونین کونسل والوں کے ہاں مہر کے بارے زبانی بات چیت نہ کی جائے۔ تا کہ صریح جھوٹ نہ بولنا پڑ جائے لیکن اگر وہ باقاعدہ پوچھ لیں تو اس صورت میں محل

وموقعہ کی مناسبت سے توریہ (syllepsis) سے کام لیا جاسکتا ہے مثلاً اصل مہر پچاس ہزار ہے اور فارم میں دس ہزار لکھا ہے اور پوچھ لیا جائے تو جواب میں یوں کہا جائے کہ دس ہزار طے ہوا ہے، اب ظاہر ہے کہ پچاس ہزار روپے میں دس ہزار بھی شامل ہے لیکن یوں کہنا درست نہیں ہوگا کہ دس ہزار ہی مقرر ہوا ہے۔

زکوۃ سے انکم ٹیکس ادا کرنا جائز نہیں۔

فتاوی ثنائیہ(۱/۴۳۷) میں ہے۔

سوال: موجودہ زمانے میں جو انکم ٹیکس جبراً وصول کیا جارہا ہے یہ انکم ٹیکس اگر کوئی شخص زکوۃ سے ادا کرے تو جائز ہوگا کیونکہ زمانہ رسالت میں یہ ٹیکس نہیں تھا۔

جواب: زکوۃ کے مصارف قرآن کریم نے خود بتائے ہیں انما الصدقات للفقراء والمساکین چونکہ انکم ٹیکس کے مصارف وہ نہیں بلکہ بہت سے مصرف شرعاً ناجائز بھی ہیں، اس لئے زکوۃ اس میں محسوب نہ ہوگی، زکوۃ آٹھ قسم کے آدمیوں پر تقسیم کرنے کا حکم فرمایا ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

انما الصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليها والمؤلفة قلوبهم وفي الرقاب والغارمين وفي سبيل الله وابن السبيل فريضة من الله (سورة التوبه ركوع۷)

یعنی زکوۃ فقیروں کیلئے ہے اور مسکینوں کیلئے اور ان لوگوں کیلئے ہے جو اس پر عامل ہوں اور مؤلفۃ القلوب کیلئے ہے اور گردن چھڑانے کیلئے ہے اور قرضداروں کیلئے ہے اور اللہ کی راہ میں صرف کرنے کیلئے اور مسافر کیلئے ہے الی اخرہ۔

فتاوی نذیریہ (۱/ ۴۹۱)

باپ نے ٹیکس سے بچانے کیلئے جائیداد بیٹوں کے نام کردی تو اس میں بیٹوں کو حق میراث ہے یانہیں؟

فتاویٰ رحیمیہ (۱۰/۵۴۹) میں ہے۔

سوال: زید نے انتقال کیا، بیوی، چھ لڑکے، چار لڑکیا ایک دوکان اور نو مکان اور ہزاروں روپے نقد چھوڑے، زید کے چھ لڑکوں نے اپنے باپ سے کہا کہ اگر آپ اپنی زندگی میں اپنی تمام جائیداد کی تقسیم کر جائیں تو حکومت موجودہ کی وہ ٹیکس جو مورث کی موت کے بعد وارثوں کو ادا کرنا پڑتی ہے اور یہ ٹیکس حکومت وصول کرتی ہے اس سے بچ جائیں گے، زید نے اپنے لڑکوں کے اصرار پر جائیدا کی تقسیم کرڈالی چنانچہ دوکان اور مکانات اپنے لڑکوں کے نام لکھدئے اور نقد روپوں میں سے تھوڑی سی رقم بلا لحاظ اصول شرعیہ اپنی لڑکیوں کے لئے کاغذ پر تحریر کردی مگر یہ رقم کبھی ان چاروں لڑکیوں کو ان کی ضمانت میں نہیں دی، لڑکوں نے اپنے باپ کی تقسیم کے مطابق مکانات ودوکان پر قبضہ کرلیا، اب جبکہ زید باپ کا انتقال ہوااور چاروں لڑکیوں کا مطالبہ شروع ہوگیا کہ ہمارے باپ کا جو ترکہ ہے اس میں شرعی تقسیم کی جائے اور جو ہمارا حق ہے وہ ہمیں دیا جائے مگر زید کے چھ لڑکوں نے ان چاروں لڑکیوں کے سوال ومطالبہ کا جواب یوں دیا کہ ہمارے والد نے جس نہج پر تقسیم کی ہے درست ہے اوردکان اور مکانات ہمیں بخشش کے طور پر دیدئے ہیں، اس لئے اب تمہارا حق دوکان اور نو مکانات میں نہیں ہے، ہاں جتنا حق تمہارا ان کی تحریر کے مطابق روپوں

میں ہے وہ ہم دیدیں گے اور دوسرے ترکہ میں تمہیں مطالبہ کا استحقاق نہیں ہے تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ زید مرحوم کی ملکیت میں ان چار لڑکیوں کا حصہ ہوگا یازید نے جوتحریر اپنی ضمانت میں مخصوص رقم کی تحریر لکھی تھی صرف اتنا ہی ان کا حق مانا جائے گا نیز مذکورہ بالا ترکہ میں زید کی بیوی (بیوہ) کا کتنا حق ہوگا ؟

الجواب حامدا ومصليا ومسلما

زید نے مرض الموت سے پہلے اپنی جائیداد اپنے لڑکوں کے نام باقاعدہ ہبہ کر کے قبضہ کرادیا تھاتو ہبہ صحیح اور معتبر ہے،اس ہبہ شدہ جائدداد میں لڑکیوں کا کوئی حصہ نہ ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ لڑکیوں کو محروم کرنے کی وجہ سے زید سخت گناہگار ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ جوشخص اپنے وارث کو میراث سے محروم کرے گا اللہ تعالی اس کو جنت سے محروم کریگا۔ایک حدیث میں ہے کہ بعض لوگ پوری زندگی خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری میں گزارتے ہیں لیکن موت کے وقت میراث میں وارثوں کو نقصان پہنچا کر یعنی بلا عذر شرعی کسی حیلہ سے محروم کر کے جہنمی بن جاتے ہیں۔

قال ان الرجل ليعمل والمرأة بطاعة الله ستين سنة ثم يحضر هما الموت فيضاران في الوصية فتجب لهما النار (مشكوة شريف ص ٢٦٥)

لیکن اگر ہبہ کے بعد لڑکوں نے اس پر قبضہ نہیں کیا تھا اور زید مرگیا،یا ہبہ مرض الموت میں واقع ہوا ہےتو ان دونوں صورتوں میں ہبہ باطل ہے،اسی طرح اگر یہ واقعہ ہے کہ زید نے لڑکوں پراعتماد کر کے اس کی خیر خواہی کی بنا پر اپنی جائیداد برائے نام ان کے نام لکھ دی،ان کو مالک بنانا مقصود نہیں تھا تب بھی لڑکے اس جائیداد کے مالک نہ ہوں گے اور تمام ورثاء اس جائداد میں بہ حصہ رسد حقدار ہوں

گے فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

سیل ٹیکس قیمت خرید میں ملانے کا حکم

فتاوی حقانیہ(۱۴۰/۶)میں ہے۔

سوال: حکومت تاجروں اور چھوٹے دوکانداروں سے سیلز ٹیکس کے نام سے جو ٹیکس وصول کرتی ہے تو کیا بائع کے لئے اتنی مقدار رقم مبیعہ کی قیمت خرید میں ملا نا اور مشتری سے وصول کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: موجودہ دور میں حکومت کی طرف سے عائد کردہ سیلز ٹیکس چونکہ جائز حدود سے نکل کر ظلم وتعدی کے دائرہ میں داخل ہیں اور اس میں کسی امیر یا غریب کی تمیز بھی نہیں، شرح ٹیکس بھی اتنی زیادہ ہے کہ دینے والا اس کی ادائیگی سے عاجز ہوجاتا ہے، اس بنا پر سیلز ٹیکس بالکل اس کی رقم کی طرح ہے جو راستہ میں تاجروں سے ظلماً وجبراً وصول کی جاتی ہے، اس لئے صورت مسئولہ میں مشتری کو قیمت خرید بتاتے وقت اس میں ٹیکس کا اضافہ ضم کرنے میں خیانت کا پہلو غالب ہوجاتا ہے تاہم اگر بائع مشتری کو قیمت خرید بتائے بغیر جملہ ٹیکسوں کا حساب کرکے اس سے کسی قیمت پر اتفاق کرے تو کوئی حرج نہیں ۔

لما قال العلامة علاؤالدين الحصكفى رحمه الله:لايضم اجر الطيب... وما يؤخذ فى الطريق من الظلم الا اذاجرت العادة بضمه،هذا هوالاصل كماعلمت فليكن المعول عليه.الدرالختارمع ردالمحتار(۵ ص۱۳۷)باب المرابحة والتولية.

قال العلامة ابن نجيم المصرى رحمه الله:هى اى التولية بيع

بثمن سابق والمرابحة بيع وبزيادة. البحرالرائق(ج٦ ص١٠٧)باب المرابحة والتولية)ومثله فى الهندية (ج٣ ص ١٧٣) كتا ب البيوع،باب المرابحة والتولية.

ضلع ٹیکس، پل ٹیکس، محصول چونگی وغیرہ اخراجات اصل قیمت میں ملانا

فتاوی حقانیہ(١٤٠/٦،١٤٦)میں ہے۔

سوال: پل ٹیکس، ضلع ٹیکس، راہداری اور محصول چونگی وغیرہ کے اخراجات مبیعہ کی اصل قیمت سے ملانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: آجکل حکومت کے عائد کردہ مذکورہ بالا ٹیکس ظالمانہ اور جابرانہ صورت اختیار کر چکے ہیں، ان اضافی اخراجات کا مبیعہ کی قیمت خرید میں ملانا یانہ ملانا تجار کی عادت اورعرف پر موقوف ہوگا، پس اگر تجار کی عادت اورعرف ملانے کی ہوتو پھر ایسا کرنا جائز ہے ورنہ اضافی اخراجات کا اصل قیمت میں ملانا جائز نہیں۔

لما قال العلامة علاؤالدين الحصكفى رحمه الله: لايضم اجرالطيب....وما ياخذ فى الطريق من الظلم الا اذا جرت العادة بضمه هذا هوالاصل كما علمت فليكن المعول عليه. الدرالمختار على صدررد المحتار(ج ٥، ص١٣٧)باب المرابحة والتولية.

قال العلامة ابن نجيم المصرى رحمه الله: والذى يوخذ فى الطريق من الظلم لا يضم الا فى موضع جرت العادة فيه بينهم بالضم

(البحر الرائق ج٦ ص ١١٠)باب المرابحة والتولية ومثله فی الهندية ج٣ص ١٧٣ كتاب البيوع،باب المرابحة والتولية.

حج پر ٹیکس لگانے کا عدم جواز

امداد الفتاوی (١٥٢/٤) میں ہے۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ حجاج پر قرنطینہ میں یا کہیں اور کسی قسم کا ٹیکس لگایا جانا مذہبا ازروئے شرع شریف جائز ہے یا نہیں؟

جواب: شرعاً جائز نہیں بلکہ ایسی ٹیکس اس حد تک ناجائز ہیں کہ اگر بدون ایسے ٹیکسوں کو ادا کئے ہوئے حج نہ کر سکے تو بعض فقہاء اسلام نے حج کی فرضیت کو ساقط کہہ دیا ہے۔ چنانچہ درمختار کی کتاب الحج میں ہے جو فقہ کی معتبر کتاب ہے۔

وهل مايوخذ فی الطريق من المكس والخفارة عذر قولان.

اور ردالمحتار میں اس قول کے تحت میں ہے۔

ومثله مایاخذه الاعراب فی زماننا من اداء المعین من جهة السلطان نصره الله تعالیٰ لدفع شرهم(ج٢ ص ٤١٩)

حاصل ترجمہ عبارت مذکورہ کا یہ ہے حج کے راستہ میں جو ٹیکس وغیرہ لیا جاتا ہے کیا اس سے حج فرض نہیں رہتا؟ بعض کا یہی قول ہے اور یہی حکم ہے اس کا جو ہمارے زمانہ میں بدوی لوگ سلطان سے لیتے ہیں، بلکہ اسلامی قوانین میں ایسے ابواب کو یہاں تک ناجائز رکھا گیا ہے کہ یہود ونصاری جو بیت المقدس کی زیارت کو جاتے ہیں اس کی وجہ سے ان سے رقم لینا حرام کیا گیا ہے چنانچہ ردالمحتار میں جس کا اوپر ذکر آیا ہے لکھا ہے۔

قال الخیرالرملی:اقول منه یعلم حرمة مایفعله العمال الیوم من الاخذ علی راس الحربی والذمی خارجا عن الجزیة حتی یمکن من زیارة بیت المقدس ج ۲ ص ۴۲.

جب سفر بیت المقدس کے سبب سے غیر مسلم سے لینے کی اجازت نہیں تو سفر حج کے سبب سے مسلم سے کچھ لینے کی کیسے ہوگی؟

بلکہ قواعد اسلامیہ کا یہاں تک مقتضا ہے کہ اگر ایسی رقمیں حکام غیر مسلم، اہل اسلام سے وصول کرتے ہوں تب بھی اپنے مقام حکومت میں حکام اہل اسلام کو غیر مسلم سے اس کا وصول کرنا جائز نہیں، نظیر اس کی عشر ہے کہ اگر مال تجارت غیر مسلم تاجر کے پاس نصاب سے کم ہو اور وہ لوگ اپنی مقام حکومت میں تاجر مسلم سے اس مقدار میں عشر لیتے ہوں تو ہم جب بھی تاجر غیر مسلم سے نہ لیں گے اوراس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ یہ ظلم ہے اور ظلم میں موافقت نہیں کی جاتی، اس وجہ سے صاف ثابت ہوا کہ جس رقم کا وصول کرنا قواعد اسلامی سے ناجائز ہے اگر غیر مسلم سلطنت ایسی رقم مسلمان سے بھی وصول کرتی ہو تو اسلامی سلطنت تب بھی غیر مسلم سے وصول نہ کرے گی۔ عبارت اس نظیر پر دلالت کرنے والی ردالمختار میں یہ ہے۔

ولاناخذ منهم شیئا اذالم یبلغ مالهم نصابا وان اخذوامنا فی الاصح لانه ظلم ولا متابعة علیه ج ۲ ص ۴۳.

پس دلائل مذکورہ صاف صاف دلالت کررہے ہیں کہ ایسے ٹیکس حجاج سے وصول کرنے بروئے مذہب اسلام جائز نہیں۔

عدم جواز آمدنی چونگی ٹیکس وغیرہ

امدادالفتاوی (۶/۳۲۵) کتاب العقائدوالکلام میں ہے۔

سوال:شرعاً کرور گیری حرام است وہ نیز محصول شراب وافیون وانواع آن وٹیکس خانہاء ناجائز است لیکن ازیں وجوہات آمدنی کثیرمی باشد،اگرھمہ راموقوف کردہ شود درریاست چند کروڑھاروپیہ رانقصان می شود،دریں باب کدام حیلہ شرعی است یانہ ؟

جواب:ازقواعد مقررشرعیہ است کہ مصالح یامفسدہ معصیت معارض نمی تو ان شد، پس محاصل ناجائز بکدامی مصلحت جائز نمی توان شد۔

مفہوم استفتاء وفتوی:سوال کا حاصل یہ ہے کہ چونگی لینا حرام ہے نیز شراب افیون اور انکی انواع واقسام کی آمدنی اور گھروں پر لگنے والا ٹیکس ناجائز ہے لیکن ان طریقوں سے بڑی آمدنی حاصل ہوتی ہے،اگر یہ سلسلہ موقوف کردیا جائے تو ملک کو کروڑوں روپے کا نقصان ہوگا،کیا اس باب میں کوئی شرعی حیلہ چل سکتا ہے یانہیں ؟

جواب:حاصل جواب یہ ہے کہ یہ مسلمہ اور طے شرعی اصول ہے کہ کوئی بھی مصلحت اور مفسدہ معصیت کا معارض نہیں بن سکتااور ٹیکس وغیرہ امور معصیت ہیں جیسا کہ مستفتی نے خودلکھا ہے،اس لئے ناجائز محاصل اور ٹیکس کسی بھی مصلحت کی وجہ سے جائز نہیں ہوسکتے ۔

مباح اشیاء پر محصول حرام ہے

فتاوی رشیدیہ (ص۴۹۴) میں ہے۔

سوال: حکام دریا جنگل کا اہتمام کریں اور اسکے مخارج پر محصول ٹھہراویں تو جائز ہے یا نہیں؟

جواب: جنگل پہاڑ کی اشیاء مباحہ ملک عامہ ہیں، اس پر محصول لگانا حاکم کا ظلم اور حرام ہے۔

والحطب ان کان فی غیر ملک فلا بأس به ولا یضر نسبته الی قریة اوجماعة مالم یعلم ان ذلک ملک لهم ردالمحتار.

حج پر فیس کی شرعی حیثیت نیز اگر سعودی حکومت کی حج فیس ادا نہ کی تو حج کا حکم

خیر الفتاوی (۱۵۲/۴) کتاب الحج میں ہے۔

سوال: میں نے حج کیا ہے جس میں میرے پاس چارصدروپیہ اپنا تھا اور پانچ صدروپیہ قرض لیا اور حج کو روانہ ہوگیا، کراچی جا کر معلوم ہوا کہ حج بیت اللہ کیلئے گیارہ صد روپیہ کی ضرورت ہے، بعض حاجیوں نے مشورہ دیا کہ تم حج کیلئے چلے جاؤ اور جو ابن سعود کے ملک کی فیس ہوتی ہے وہ نہ دینا، ویسے ہی داخل ہو کر حج کر لینا چنانچہ میں نے ایسے ہی بلا فیس حج کرلیا جس کی رقم تقریباً چارفیصد روپیہ کی قریب ہوتی ہے، آیا یہ حقوق العباد میں سے ہے یا نہیں؟ اور اس کی ادائیگی میرے ذمہ ہے یا نہیں تا کہ عنداللہ کوئی گرفت نہ ہو اور ادائیگی کی صورت کیا ہے؟

الجواب: شرعاً ایسے ٹیکس اور فیس لازم نہیں ہیں لیکن موجودہ حکومت سعودی بعض مصالح کی بنا پر حاجیوں کی جان ومال کی حفاظت کی خاطر ٹیکس وصول کرتی ہے،اس لئے احتیاطاً ایک درخواست حکومت سعودی کوارسال کرکے معاف کرالیا جائے یاادائیگی کردی جائے،اس وقت سعودی حکومت کی کل ۵۱ ریال (عربی روپیہ) ہے فقط۔

معلم حضرات کی فیس کا حکم

خیرالفتاوی (۲۲۹/۴) کتاب الحج میں ہے۔

سوال: حجاج کرام سے معلمین اعلی اور نائب معلمین کیلئے جوفیس طلب کی جاتی ہے وہ جائز ہے یانہیں؟ نیز جو نائب معلمین کام کرتے ہیں وہ حسب ذیل ہے۔

(۱) فارم درخواست برائے حج مہیا کرنااور پر کرنا۔

(۲) تاریخ متعینہ پر درخواست دفتر میں بھیجنا۔

(۳) بعد منظوری دفتر سے حالات کا جائزہ لینااور حجاج کوآگاہ کرتے رہنا۔

(۴) حاج کو گھر سے بندرگاہ تک کے کاروبار ٹیکہ وغیرہ لگوانا اور انتظام کرنا۔

الجواب حامداً ومصلیاً۔

ان اعمال پر جو معلمین حضرات انجام دیتے ہیں اور جن کی تفصیل سوال کے اندر مذکورہ ہے اجرت لیناجائز ہے بوجہ عمل کے معلوم اور متعین ہونے کے۔

کذا یفهم من نظائر هذا العمل من امدادالفتاوی.

ملازمت چونگی

امدادالفتاوی (۳۹۵/۳) کتاب الاجارۃ میں ہے۔

سوال: اس محکمہ میں افسر سکرٹری وماتحت افسران سپر نٹنڈنٹ محراران وچپراسان ہوتے ہیں، کام اس محکمہ کا یہ ہے کہ جو مال باہر سے تجارت پیشہ لوگ لائیں ان پر وہ محصول جو کہ گورنمنٹ کی طرف سے لگایا گیا ہے لگا کر وصول کرلیا جاوے، محرر تخمینہ کرکے محصول لگا کر وصول کرتے ہیں، سپر نٹنڈنٹ جانچتا ہے، سکرٹری بعض وقت جانچتا بھی ہے اوراحکامات جاری کرتا ہے، چپراسان تجار وغیرہ کو محصول کیلئے روکتے ہیں، وہ اسباب تولتے ہیں جن پر محصول لگایا جائیگا۔ محصول کا روپیہ صدر کو لے جاتے ہیں، غرض اس محکمہ کے سب لوگ محصول کے متعلق کوئی نہ کوئی کام کرتے ہیں آیا اس محکمہ میں کسی قسم کی ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جو قواعد شرعیہ نے اموال پر محصول لینے کو مقرر فرمائے ہیں جن کو فقہاءؒ نے باب العشر میں ضبط کیا ہے چونکہ محکمہ مذکورہ کے قواعد ان پر منطبق نہیں ہیں اس لئے بوجہ خلاف ماانزل اللہ ہونے کے غیر مشروع ہوگئے ہیں اورحسب ارشاد الٰہی لاتعاونوا علی الاثم والعدوان اسکی اعانت بھی معصیت ہوئی لہٰذا محکمہ مذکورہ کی ملازمت ناجائز ہے مگر جو تنخواہ ملتی ہے وہ بوجہ اس کے کہ حاکم غیر مؤمن کا استیلاء اموال پر موجب تملیک ہوجاتا ہے اورحاکم غیر مؤمن جو مال برضائے خود کسی مؤمن کو دیں، خواہ کسی عنوان سے ہووہ مباح ہے، اس لئے وہ تنخواہ حلا ل ہے، غرض خدمت غیر مشروع اور من وجہ مشروع ہے پس عامل کو صرف عمل کا گناہ ہوگااور غیرعامل جو اس تنخواہ سے منتفع ہو مثلاً اسکے اہل اعیال یا اضیاف واحباب ان کو کوئی

گناہ نہ ہوگا۔

نیز فتاوی محمودیہ (۱۲/۳۴۷) کتاب الحظر والاباحۃ میں ہے۔

سوال: ایک شخص چنگی چوکی کا داروغہ ہے، اس کی نظر سے فضائل صدقات ص ۲۷ پر حدیث گزر چکی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص کے پاس کوئی عذر کرے اور وہ قبول نہ کرے تو اس کو اتنا گناہ ہوتا ہے جتنا کہ چنگی وصول کرنے والے کو، اب داروغہ بہت پریشان ہے کہ چنگی کی ملازمت کرے یا نہ کرے؟

الجواب حامدا ومصلیا

شریعت نے ٹیکس کو حرام قرار دیا ہے اور ٹیکس وصول کرنے والے کیلئے سخت وعید ہے، اس کی دعا بھی قبول نہیں ہوتی، آجکل چونگی کا حال بھی تقریباً ایسا ہی ہے، اس لئے جب دوسری ملازمت کو پالے یا گزارہ کی صورت ہوجائے تو چنگی کی ملازمت نہ کی جائے، اگر ملازمت کرلی ہے اور دوسری جائز ملازمت اس سے بہتر موجود ہے تو چنگی کی ملازمت ترک کردی جائے۔

محکمہ انکم ٹیکس، بینک، بیمہ وغیرہ میں ملازمت

احسن الفتاوی (۸/۹۰، ۹۱) کتاب الاجارۃ میں ہے۔

سوال: بینک، بیمہ کمپنی اور محکمہ انکم ٹیکس جس میں سینما، موٹروں اور مکانوں پر ٹیکس کی تشخیص وتحصیل کا کام ہوتا ہے، اسی طرح کسٹم آبکاری جس میں نشہ آور چیزوں کی درآمد پر ٹیکس وصول کیا جاتا ہے، ان محکموں میں ملازمت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: بینک، بیمہ ربوا ہے اور ٹیکسوں کی تشخیص کا طریق مروج ظلم ہے، ان

کے مصارف بھی صحیح نہیں، اس لئے ان میں ملازمت جائز نہیں۔

قال الله تعالیٰ: وتعاونوا علی البر والتقوی ولاتعاونوا علی الاثم والعدوان.

وعن انس رضی الله تعالیٰ عنه قال: لعن رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم فی الخمر عشرة عاصرها معتصرها وشاربها وحاملها ومحمولة الیه وساقیها وبائعها وآکل ثمنها والمشتری لها والمشتری له (ترمذی ص ۲۰۶، ج ۱)

چونگی کا محصول

فتاویٰ محمودیہ (۲۷۷/۶، ۲۷۸) میں ہے۔

سوال: احقر سے دو مسلمانوں نے متفرق وقتوں میں فرداً فرداً یہ تذکرہ کیا ہے کہ محصول چونگی یعنی وہ محصول جو اشیاء کی درآمد پر لیا جاتا ہے اس کا ادا کرنا ناجائز ہے مثلاً ایک شخص کسی گاؤں سے بکری لے کر سہارنپور شہر میں لائے خواہ فروخت کی نیت سے یا پالنے کی نیت سے تو سہارنپور کا محکمہ محصول (میونسپلٹی) اس سے چند پیسے بطور محصول بکری کے لے لیں گے تو یہ پیسے بطورِ محصول ادا کرنا جائز ہے یا نہیں ہے؟ مگر چونکہ ادا کئے بغیر کام نہیں بنتا، اسلئے اس کو برداشت کر کے صبر کرے؟ کیا ایسا مسئلہ شریعت مقدسہ میں ہے الخ۔

الجواب: مروجہ چونگی ظلم ہے اور جس طرح ظلم ناجائز اور حرام ہے اسی طرح سے ظلم کی اعانت ناجائز ہے اور چونگی ادا کرنے سے ظلم کی اعانت ہوتی ہے لہٰذا ناجائز ہے مگر چونگی ادا نہ کرنے سے دوسری بڑی مصائب کا سامنا ہوتا ہے، اس لئے

دفع ظلم کی وجہ سے چونگی کی ادائیگی پر صبر کیا جاتا ہے۔

من ابتلی ببلیتین فلیختر اھونھما الخ

مختلف ٹیکسوں کا حکم

احسن الفتاوی (۸/۹۸) میں ہے۔

سوال: انکم ٹیکس، ویلتھ ٹیکس، گفٹ ٹیکس، سیل ٹیکس، چولہا ٹیکس، جو ہر شادی شدہ جوڑے سے وصول کیا جاتا ہے خواہ وہ کھانا خود پکائیں یا پکا ہوا خرید کر کھائیں، شادی ٹیکس ہر نکاح پر، مواشی رکھنے کا ٹیکس، جس میں بھیڑ بکری کا ٹیکس گائے بھینس کے ٹیکس سے نصف ہوتا ہے، پیدائشی ٹیکس جو ہر لڑکے کی پیدائش پر وصول کیا جاتا ہے محصول چونگی اور اسی طرح کے دیگر ٹیکسوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ نیز ان محکموں میں ملازمت کرنا کیسا ہے؟

الجواب: یہ سب ٹیکس ناجائز ہیں اور ان محکموں میں ملازمت بھی ناجائز ہے، حکومت کو اگر ضرورت ہو تو ٹیکس عائد کرنے کی مندرجہ ذیل شرائط ہیں۔

(۱) حکومت کے مصارف کو اسراف وتبذیر سے پاک کیا جائے۔

(۲) اونچے طبقے کے ملازمین کی تنخواہوں کو افراط سے گرا کر اعتدال پر لایا جائے۔

(۳) ٹیکس ہر شخص پر اس کی حیثیت کے مطابق لگایا جائے یعنی اس کی آمدنی او مصارف کو پیش نظر رکھ کر ٹیکس کی شرح تجویز کرا جائے۔

مروجہ ٹیکس اندھے کی لاٹھی یا انیاؤ پور کا راجہ ہے، انکم ٹیکس کے سوا دوسرے سب ٹیکس تو ظاہر ہے کہ ہر امیر وغریب پر لگائے جاتے ہیں اور انکم ٹیکس میں اگرچہ

آمدنی تو ملحوظ ہوتی ہے مگر اس شخص کے مصارف ملحوظ نہیں رکھے جاتے، اسی طرح جائیداد ٹیکس پر صاحب جائداد سے بہرحال لازماً وصول کیا جاتا ہے، اگرچہ اس کا ذریعہ آمدن کچھ بھی نہ ہو، ٹیکس کی تشخیص کا یہ طریقہ صریح ظلم اور حرام ہے، اسی طرح حکومت کے مصارف میں بھی محرمات کی بہتات ہے۔ مثلاً

(۱) اقامت حکومت الہیہ ونفاذ آئین اسلام کا دفاع (۲) منکرات، فواحش عریانی، فحاشی، کو فروغ دینا (۳) لہو ولعب اور مسرفانہ طور وطریق۔

ظلماً ٹیکس وصول کرنا حرام ہے

احسن الفتاوی (۳۴۹/۷) میں ہے۔

سوال: ہمارے علاقہ گلگت میں ہندو اور انگریز دونوں کی حکومت رہی ہے اب پاکستانی حکومت ہے، ہندو کے زمانہ سے علاقہ پونیال میں راجہ رہتا ہے بطور حاکم فیصلے وغیرہ نظم ونسق اس کے ہاتھ میں تھا اور زمین دار لوگ باری باری جا کر اس راجہ کی خدمت کرتے تھے، بہت بے دردی سے جانوروں کی طرح زمینداروں سے خدمت لیتا تھا، آخر کار تنگ آ کر لوگوں نے عرض کیا کہ خدمت لینا معاف کردیں، ہم آپ کو کچھ مال سالانہ دیں گے، اس نے قبول کرلیا، اس وقت سے ہر ایک زمیندار پر غلہ مقرر ہے، کسی پر پانچ من، کسی پر بارہ من وغیرہ وغیرہ، اب تک یہ سلسلہ جاری ہے، ہمارے فیصلے جھگڑے لینا دینا تمام چیزوں کی باگ ڈور اس کے قبضہ میں ہے، حکومت تک جانے کی نوبت نہیں آتی۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ لوگوں کا خیال ہے کہ جو چیز غلہ کی صورت میں راجہ ہم سے وصول کرتا ہے ناجائز ہے کیونکہ ہماری طاقت سے زائد ہے لہٰذا جو غلہ وہ لیتا ہے وہ حرام ہے اور جو ان سے خرید کر لائے گا وہ بھی

حرام ہے، آیا ان کا یہ کہنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب: راجہ کا وہاں کے باشندوں سے غلہ لینا جائز نہیں ہے اور نہ ہی لینے کے بعد وہ مالک ہوتا ہے، یہ غلہ مال مغصوب شمار ہوگا جو واجب الرد ہے، اس کی بیع شراء دونوں ناجائز ہیں۔

دورِ خیر القرون میں جبراً ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا

خیر الفتاویٰ (۳۹۲/۳) میں ہے۔

سوال: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں یا خلفائے راشدین کے دورِ خلافت میں اغراض عامہ کے کاموں کیلئے زکوٰۃ کے علاوہ بھی کوئی سرکاری محصول وصول کیا گیا ہے؟ اگر وصول کیا گیا ہے تو وہ کیا تھا؟

الجواب: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانہ فضا ایسی بن گئی تھی کہ محصول عائد کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی، آپ ﷺ کے زمانے میں تو صورت یہ تھی کہ جب بھی کوئی حاجت پیش آتی تھی تو آپ مسلمانوں کو جمع فرما کر ذکر کر دیتے تھے پھر ہر شخص اپنی اپنی سمت اور بساط سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا اور حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے ببرکتِ اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت فتوحات عطا کیں اور اس کثرت سے اموال وغنائم آئے کہ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے، اس لیئے ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں اور حضرات خلفاء کے زمانہ میں کوئی ٹیکس نظر نہیں آتا جو جبراً وصول کیا گیا ہو۔

زمین کے محصول کی ادائیگی میں مہلت پر نذرانہ کا حکم

امدادالفتاوی (۳/۳۴۵) کتاب الاجارۃ میں ہے۔

سوال: کاشتکاروں سے نذرانہ وغیرہ لے کران کولگان ادا کرنے میں مہلت دیدینا بغیر کسی قسم نقصان مالک کے ساتھ کیسا ہے؟ اور اس قسم کا نذرانہ لیناجائز ہے یانہیں؟اس بارے مطلع فرمایئے گا۔

جواب: نقصان نہ ہومگر دیکھنا یہ ہے کہ آخر یہ رقم کس چیز کامعاوضہ ہے اور جس چیز کامعاوضہ ہے آیاوہ معاوضہ کے قابل ہے یانہیں؟اس بارے میں اپنی معلومات ظاہر کی جاویں تو منقح جواب دیاجائے گا۔

جواب استفسار درسوال بالا: کاشتکاروں سے لگان وصول کرنے کے واسطے گورنمنٹ نے خریف کی قسط میں ۱۰ اپریل اور ۱۱ مئی اور ربیع کی قسط میں ۱۲۵ اکتوبراور ۲۶ نومبر مقرر کررکھی ہیں،ان مقررہ تاریخوں کے گزرنے کے بعد زمیندار کو اختیار دیا گیاہے کہ اگر کاشتکاران مقررہ تاریخوں پرروپیہ لگان کاکل ادانہ کرے توزمیندار عدالت میں نالش کرسکتاہے،بعض آدمی فوراً تاریخ گزرتے ہی نالش کردیتے ہیں اور بعضے نہیں کرتے،صاحب اکتوبر کے مہینے میں اپنے مواضعات کاحساب مجھ سے سمجھتے ہیں اورسال بھر میں جو کچھ روپیہ جس کاشتکار سے وصول ہوتاہے وہ میرے ہی پاس امانت میں رہتاہے،خواہ مقررہ تاریخ پروصول ہووے یابعدمیں ان کو اس سے کچھ سروکارنہیں ہے،جو کاشتکار وقت پر یعنی تاریخ مقررہ پر روپیہ ادانہیں کرتے ہیں تووہ

کاشتکار اپنے کارندے کو نالش کے خرچ سے بچنے کی غرض سے کچھ نذرانہ جو تخمیناً نالش کی عدالتی خرچ سے کم ہوتا ہے دیدیتے ہیں اور خریف کا واجب الاداء روپیہ ربیع میں دینے کے واسطے یا ربیع کا خریف میں دینے کے واسطے مہلت لے لیتے ہیں کیونکہ کاشتکار یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر کارندہ نالش کردے گا تو عدالت میں ہم زیادہ خرچ کے زیر بار ہوں گے اور کارندہ بھی ناخوش رہے گا اور کارندہ کو دینے کی حالت میں نالش کے خرچ میں بچت یقینی ہوجاتی ہے اور کارندہ بھی خوش رہتا ہے تو اس قسم کا نذرانہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: جائز نہیں، یہ رقم بمقابلہ مہلت کے ہے جو کہ حرام ہے اور نہ کارندہ کے ذمہ ہے کہ آقا اپنے پاس سے بیباق کرے خواہ وصول ہو یا نہ ہو، اگر کارندہ اس ذمہ داری سے سبکدوش ہوجاوے تو پھر نذرانہ کی طرف اس کو التفات نہ رہے۔

کاشت کار سے سرکاری مالیہ سے زائد لینے کا حکم

امدادالفتاوی (۳/۳۶۲) کتاب الاجارۃ میں ہے۔

سوال: کاشتکار سے سرکاری معینہ رقم سے زیادہ وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: اس سوال کے معنی جو میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ زمیندار یعنی مالک زمین کو سرکار نے کسی قانون سے یہ حکم کردیا ہے کہ تم اپنی زمین کے کاشتکار سے اس قدر مقدار سے زیادہ لگان نہیں لے سکتے ہو، اگر یہی معنی ہیں تو جواب یہ ہے کہ اجرت ٹھہرانے کا استحقاق مالک کے ہوتے ہوئے غیر مالک کو نہیں ہے، اس لئے یہ حکم شرعاً غیر معتبر ہے اور زمیندار کو بلاشبہ یہ حق حاصل ہے کہ کاشتکار کو مجبور کرے کہ ہم کو اس قدر لگان دینا ہوگا، ورنہ ہم تم کو کاشت کی اجازت نہیں دیتے، اگر اس کے بعد وہ

بڑھادے گا تو زمیندار کیلئے حلال طیب ہے اور اگر اس نے نہ بڑھایا تو ایسی زمین کی کاشت سے وہ گناہ گار ہوگا اور اگر سوال کا کچھ اور مطلب ہے تو اس کی توضیح کے بعد جواب ممکن ہے۔

ریاض محمد بلگرامی
فاضل جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد
متخصص جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۴
دارالافتاء دارالعلوم تعلیم القرآن راجہ بازار راولپنڈی